جاد

یعقوب یاورؔ

جہاد

(ناول)

یعقوب یاور

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

JEHAD

(Novel)

by

Yaqoob Yawar

Year of Ist Edition 2009

ISBN 978-81-8223-461-1

Price Rs. 250/-

TITLE : Jihād :nāvil /
AUTHOR STAT : Ya'qūb Yāvar.
EDITION STAT : Ist ed.
IMPRINT : Dihlī : Ejūkeshnal Publishing Hā'us, 2009
FEATURE SCOPE : A novel.
LANGUAGE : In Urdu.
DKCol.C#300278268
D.K Agencies (P) Ltd.
www.dkagencies.com
DKURD-4874

نام کتاب : جہاد (ناول)
مصنف : یعقوب یاور
شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی۔۵ (یوپی)
سن اشاعت اوّل : ۲۰۰۹
تعداد :
سرورق :
قیمت : ۲۵۰ روپے
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

انتساب

ان مجاہدین کے نام

جو ھندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں ھیں

مرا قلم امن و آشتی کے پیام لکھ لکھ کے تھک چکا ہے
مرے خدا میں لرزتے ہاتھوں میں پھر سے تلوار مانگتا ہوں

یعقوب یاور

بسم اللہ الرحمن الرحیم٥

پہلے اسے پڑھ لیجیے

بقول شجاع خاور:

یا تو جو نافہم ہے، وہ بولتا ہے ان دنوں
یا جسے خاموش رہنے کی سزا معلوم ہے

میں خود کو نافہم تو سمجھتا ہی ہوں لیکن اتفاق سے یہ بھی جانتا ہوں کہ خاموش رہنے کی سزا کیا ہے؟ اس لیے مجھے بولنے کا حق ہی نہیں ہے بلکہ شاید بولنا مجھ پر فرض بھی ہو گیا ہے۔ یا کم از کم ایسا مجھے محسوس ہوتا ہے۔

جن حالات میں رہ کر مجھے اپنے وطن عزیز میں زندگی گذارنا ودیعت کیا گیا ہے وہ اتنے اطمینان بخش نہیں ہیں، جتنے میں چاہتا تھا یا جتنے کی مجھے ضرورت تھی۔ یہ درست ہے کہ ان حالات میں بھی میں کبھی کبھی اپنے اندر خوشی کی لہریں محسوس کرتا ہوں لیکن یہاں بیشتر ایسے مواقع آتے رہتے ہیں جب میرے اندر کا آتش فشاں پھٹ پڑنے پر آمادہ نظر آنے لگتا ہے۔ حالانکہ کبھی اس کے پھٹنے کی نوبت نہیں آئی۔ اسے بآسانی میری کم ہمتی اور بزدلی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، لیکن میں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں کہ میرے ہاتھ میں تلوار نہیں، قلم ہے۔ یہ قلم مجھے غصے کو مہمیز کرنے کا ہنر بھی دیتا ہے اور صبر و ضبط کا حوصلہ بھی۔ میں یہ بات کبھی نہیں بھولتا کہ میری دنیا ادب کی دنیا ہے، اور دنیائے ادب سے مسائل کا جو پس منظر ابھرتا ہے وہ سیاسی اور معاشی دنیا میں آتے ہی نظروں سے اوجھل ہونے لگتا ہے۔ اس دنیا کا اپنا ایک دوسرا ہی پس منظر ہوتا ہے جو عموماً مختلف مصلحتوں کی گرفت میں رہتا ہے۔

ایک ادیب کی حیثیت سے مجھے کام ہی یہ سپرد کیا گیا ہے کہ میں اپنے خارج کی جس دنیا

میں رہنے پر مجبور کیا گیا ہوں، اسے اپنے داخل میں اپنی تعمیر کردہ مثالی دنیا کے مماثل بنانے کے لیے مسلسل جد و جہد کرتا رہوں، کامیابی ملے یا نہ ملے، مجھے بس عمل کی تلقین کی گئی ہے سو کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں، نتائج خود اس ذات واحد نے، جس نے مجھے اپنی نوازشوں سے سرفراز کرتے ہوئے، رہنے کے لیے یہ خوب صورت اور عظیم الشان زمین اور ہاتھ میں ایک دھار دار قلم عنایت کیا ہے، اپنی تحویل میں رکھے ہیں۔ میرے ناتواں شانوں پر بہ یک وقت 'اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِین' اور 'کرمنیہ وابھی کلاسیشو ما بھلیسو کُناچنہ' جیسی وراثتوں کی حفاظت کی ذمے داری ہے۔ مجھ سے یہ توقع کی گئی ہے کہ انھی پابندیوں میں رہ کر میں آزادی کی خو کروں۔ چنانچہ ایسی ہی آزادی کی سرپرستی میں رہتے ہوئے میں اپنا فریضہ انجام دینے کے لیے اس موضوع کے ساتھ میدان قلم و قرطاس میں اترا ہوں۔

میرے نقطۂ نظر سے فی زمانہ فرقہ پرستی اور باہمی منافرت وہ گناہ عظیم ہے، جس کی کوئی بخشش نہیں ہے۔ ساری دنیا میں ہم مسلمان کئی زاویوں سے ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ اس کا سبب ہماری تنگ نظری اور ہمارا باہمی نفاق ہے۔ ہمارے درمیان سے اتحاد و یگانگت کی صفت برسوں پہلے اٹھ چکی ہے۔ ہندوستان میں تو ہماری حالت اور بھی تشویش ناک ہوگئی ہے۔ ہم شیعہ اور سنی تو ہیں ہی اور بھی نہ جانے کیا کیا ہو گئے ہیں۔ بھلا ہم اُن فرقہ پرستوں سے مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں، جو طاقت ور بھی ہیں، منظم و متحد بھی اور ہماری جملہ کمزوریوں سے واقف بھی۔ ہماری صفوں میں لیڈر شپ کی قلت ہے۔ اس کا سبب بھی ہمارا یہی شیوہ ہے کہ ہم اپنے رہنما میں فرشتوں کے خصائل تلاش کرتے ہیں۔ اُس کے مزاج میں موجود کوئی انسانی کمی یا کمزوری ہمیں گوارا نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے وہ ہماری آپ کی طرح ہی ایک گناہ گار انسان ہوتا ہے، معصوم فرشتہ نہیں۔ اس میں بھی بہت سی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ کوئی انسان خامیوں سے مبرا نہیں۔ ہم خود بھی، جو اس پر نکتہ چینی کا شعار اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں، خامیوں سے عاری نہیں ہوتے۔ اور بہ فرض محال اگر ہم یہ مرحلہ طے بھی کر لیں تو ہم ابھرنے والے لیڈر میں یہ دیکھتے ہیں کہ وہ شیعہ ہے یا سنی؟ ظاہر ہے کچھ تو وہ ہوگا ہی، پھر یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا تعلق کس مذہبی مکتبہ فکر سے ہے، ظاہر ہے، کسی نہ کسی مکتبہ فکر سے ہوگا ہی۔ اس طرح یہ خود بہ خود طے ہو جاتا ہے کہ وہ ہم میں سے کتنوں کا لیڈر بن سکتا ہے۔ کلی طور پر امت مسلمہ کی رہنمائی کرنے والے کسی رہنما کی تلاش شاید ہماری ترجیحات میں شامل ہے ہی نہیں۔

ہمارے دشمن ہماری اس کمزوری کا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہم خواب خرگوش میں مبتلا ایک دوسرے پر نظریں ٹیڑھی کرنے میں مصروف ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے عقائد ہی کو درست قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہے۔ ہم میں سے بیشتر خود کو دانش مند اور راست رو اور دوسرے کو احمق اور گمراہ سمجھنے کے عادی ہیں۔ جنت اور دوزخ کی تقسیم بھی ہم اسی دنیا میں کرنے لگے ہیں۔ کسی مسلمان کو کافر ثابت کر دینا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل بن چکا ہے۔ ہم یہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے ہیں کہ اس دنیا میں رہنے والا انسان نہ تو مکمل طور پر فرشتہ ہے نہ شیطان۔ اس کے خمیر میں کچھ فرشتوں کی صفات بھی ہیں اور کچھ شیطنت بھی۔ یہ سب جانے بغیر بھلا ہم اپنے اسلاف کی طرح کفر میں اسلام کی بازیافت کیسے کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے تو لازمی ہوگا کہ ہم پہلے اسلام کے ساتھ ساتھ کفر کو بھی جانیں، دیکھیں کہ اس کفر میں اسلام کی رمق کتنی ہے۔ ہمیں اپنے پیش رو بزرگوں کی پیروی ترک کر کے خدا کے فرمان اور پیغمبر اسلام، رسول اکرم، حضرت محمد ﷺ کی راست پیروی کرنی ہوگی اور اپنے آپ کو مختلف خانوں میں تقسیم ہونے سے محفوظ رکھنا ہوگا۔ ہمیں شافعی، مالکی، حنبلی اور حنفی نہیں، مسلمان ہونا چاہیے۔ ہمیں دیوبندی، بریلوی، جماعتی، تبلیغی نہیں، قرآن و سنت کا پیرو ہونا چاہیے۔ ہمیں مسلمانوں کو مداح اہل بیت اور دشمنان اہل بیت کے محدود خانوں میں تقسیم کرنے کا حق نہیں ہے۔ یہ حق خدا کا ہے۔ ہمارے لیے کسی کو مسلمان سمجھنے کے لیے بس اس کا کلمہ گو ہونا کافی ہونا چاہیے۔ اس کے بعد اس کے اعمال و افعال کا تجزیہ خدا کا کام ہے، ہمارا نہیں۔ لیکن ایسا لگنے لگا ہے کہ اب ہماری یہ گمراہی ہمارا مقصد حیات بن چکی ہے۔ جیسے قیامت تک اب ہمارے اختلافات دور ہی نہیں ہو سکتے۔ ہماری تنہائیوں میں اب گفتگو کے موضوعات میں سب سے مرغوب موضوع غیبت ہے۔ ہم غیبت کے شرعی جواز کے لیے نئی نئی تاویلات تلاش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ایسے میں اتحاد باہمی کی بات بھلا کی بھی کیسے جا سکتی ہے۔ اتحاد کے لیے تو رواداری پہلی شرط ہے اور رواداری کا لازمی تقاضا ہی یہ ہے کہ ہم خود کو درست سمجھتے ہوئے دوسروں کے نظریات و عقائد کی قدر کرتے جائیں۔ ہم ایسا نہیں کر رہے ہیں اسی وجہ سے ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں اپنوں کے مقابلے غیروں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہتی ہے۔ اس قلت سے ہمارے اندر تنہائی اور عدم تحفظ کا احساس بیدار ہوتا ہے اور ہم ہمیشہ خوف کے سائے میں زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ گذشتہ چند برسوں سے مسلمانوں کے دو مخالف و متضاد اور بڑے گروہوں، شیعہ اور سنی کے درمیان مفاہمت کی جانب کچھ پیش قدمی ہو رہی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی مسجدوں میں نماز پڑھ کر ایک بار پھر خدا کو 'رب العالمین' اور 'وحدہٗ لاشریک' سمجھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس کے پس پشت مقصد نیک ہے کہ دونوں کے درمیان اتحاد و اتفاق اور خلوص و یگانگت کا رشتہ ہموار ہو، تو اس کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ جو ایسا کر رہے ہیں، شاید ہم سے زیادہ بہتر طور پر اس رمز سے آشنا ہو گئے ہیں کہ ہم منتشر رہ کر اپنے مشترکہ دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس کے لیے متحد ہونا ہی پڑے گا۔ ہمیں اپنے معمولی اختلافات کو پس پشت ڈال کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنا ہی ہوگا۔ اس ناول میں مصنف کی بھی بالواسطہ کوشش یہی رہی ہے کہ وہ اپنے قارئین کی توجہ اس مسئلے کی جانب مبذول کرائے تا کہ اس سے پیدا ہونے والے مسائل تک وہ خود بخود پہنچ سکیں۔

ادھر کافی عرصے سے ایک مخصوص طبقہ مسلمانوں سے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے اور اسلامی اصطلاحات کو بدنام کرنے کی مہم میں مصروف ہے۔ ہندوستان میں بھلے ہی اس کی تاریخ زیادہ پرانی نہ ہو لیکن بین الاقوامی سطح پر یہ کام کافی پہلے سے جاری ہے۔ اسلامی شریعت پر نکتہ چینی فی زمانہ ان کا شعار ہے۔ مسلمان ان کے خصوصی ہدف ملامت ہیں۔ فتویٰ، مدرسہ، مسجد، عورت، نکاح اور طلاق جیسے متعدد الفاظ تو پہلے ہی سے ان کا نشانہ تھے، جن کے نئے نئے اور عجیب و غریب معانی وضع کیے گئے۔ گذشتہ کچھ برسوں میں اب ان الفاظ میں 'جہاد' کا بھی اضافہ کر لیا گیا ہے۔ اب جہاد باطل کے خلاف حق کا اعلان جنگ نہیں رہا، اسے دہشت گردی کا متبادل بنا دیا گیا ہے۔ ایسا کرنے والے چاہتے ہیں کہ اب کوئی نیکی اور بدی کے درمیان حد فاصل قائم نہ کر سکے۔ اب کبھی راست رو انصار اور مہاجر متحد ہو کر بے راہ رو کفار مکہ کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اب اگر پانڈوؤں نے کوروؤں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو کوئی بھی کرشن اس عمل کو دہشت گردی کہنے سے نہیں روک پائے گا۔ اب اگر کسی بھگت سنگھ نے اپنی حب الوطنی کے جوش میں ظالم و جابر انگریزوں پر بم پھینکا تو اسے دہشت گرد کہا جائے گا۔ کیونکہ یہ جہاد ہے اور اب جہاد دھرم یدھ کا متبادل نہیں، دہشت گردی ہے۔ باطل کی ان قوتوں نے جہاد جیسی قابل قدر اور قابل تقلید اسلامی اصطلاح کو دہشت گردی کی حمایت میں اپنی جان دینا اور کرانے کی مہم چھیڑ رکھی ہے۔ منظم طور پر میڈیا میں دہشت گردی کے ہر واقعے میں 'جہاد اور جہادی' کا لفظ دھڑلے سے استعمال ہونے لگا ہے۔

لیکن بدنامی سے ڈر کر ضروری نہیں کہ حق کی حمایت کرنے والے ایسے الفاظ کا استعمال ہی ترک کر دیں یا ان کے استعمال سے احتراز کریں۔ ایسا کیا جاتا ہے تو یہ باطل کے سامنے حق کے سرنگوں ہونے جیسا عمل ہوگا۔ ان کی دراز دستیوں کا سلسلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث اردو جیسی زبان کو 'دہشت گردوں کی زبان' کہنے تک پہنچ چکا ہے۔ انھیں آئینہ دکھانے والا بھی کوئی نہیں ہے کہ ان کا یہ فعل ان کی جہالت اور فکری دیوالیہ پن کی علامت ہے۔ وطن عزیز میں عوام کی ایک قابل لحاظ تعداد ان فرقہ پرست قوتوں کے ہر قول کو 'برھم واکیہ' کی طرح تسلیم کرتی ہے، اس لیے اکثر یہاں کی فضا مسموم ہوتی رہتی ہے۔ حالانکہ اہل سیاست کی حماقتوں سے ادب کا کچھ لینا دینا نہیں ہوتا ہے لیکن ادیبوں کا یہ فریضہ ضرور ہے کہ وہ ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں جو انسانیت کے لیے مضر ہیں۔ 'جہاد' کے مصنف نے بھی یہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقول جگر مرادآبادی:

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے

یہ ہماری بدقسمتی ہی ہے کہ ہم ابھی تک دہشت گردی کی کوئی ایسی تعریف وضع نہیں کر پائے ہیں، جو سب کے لیے قابل قبول ہو، لیکن وہ خود، جنھیں دہشت گرد کہا جاتا ہے اور جن کی فہرست میں ایسے ایسے نام بھی شامل کیے جا سکتے ہیں، جن کا ہم قومی ہیرو کی حیثیت سے احترام کرتے ہیں، اسے کم زور کے طاقت ور سے ٹکرانے کے ایک موثر وسیلے کے طور پر دیکھتے رہے ہیں۔ ان کی نظر میں حب الوطنی اور دہشت گردی کے بیچ بال سے بھی باریک فرق ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ یہ اکثر ایک دوسرے کے متبادل کی حیثیت سے سامنے آتے بھی رہے ہیں۔ یہ معمولی فرق محض اس بنیاد پر دکھائی دیتا ہے کہ ہم اسے دوست کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں یا دشمن کی حیثیت سے۔ بالکل اسی طرح 'فرقہ پرستی' کا لفظ بھی ہماری توجہ سے محروم رہا ہے۔ اگر اس طرف توجہ دیں تو دراصل فرقہ پرستی کا تعلق انسان کے جذبہ حقارت و نفرت سے ہے۔ اپنے عقائد کو درست تسلیم کرنا، ان کی پیروی کرنا، ان کے بارے میں لوگوں سے بات چیت یا بحث و مباحثہ کرنا، ان کی خامیوں اور خوبیوں پر روشنی ڈالنا، ان کی تشہیر و تبلیغ میں سرگرم رہنا کسی بھی طرح فرقہ پرستی نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں اپنے مذہب سے وفاداری اور محبت کی عکاس ہیں۔ فرقہ پرستی کا سفر دراصل وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں ہم اپنے عقائد اور خیالات کو برحق سمجھتے ہوئے اپنے اندر موجود

حقارتوں اور نفرتوں کی سربراہی میں دوسروں کے عقائد پر نکتہ چینی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔اس ناول کی تخلیق کے دوران یہی نکتہ میرا رہنما رہا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ سارے ہندوستانی مسلمان دودھ کے دھلے ہیں اور نہ سارے ہندو فرقہ پرست۔یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی ایک قلیل تعداد فرقہ پرست بھی ہے اور دہشت گرد بھی لیکن ان کی اکثریت باہمی ہمدردی اور رواداری کی پیرو ہے۔ان کے اقلیت میں ہونے کے باوجود ہندوستان پر ہندو فسطائیت اور مسلم فرقہ پرستی کا سایہ اب خطرے کے تمام نشانات پار کر رہا ہے۔عام فضا کچھ ایسی بن گئی ہے یا بنادی گئی ہے کہ باہمی خلوص ومحبت، ایک دوسرے کے عقائد کا احترام اور رواداری رفتہ رفتہ ماضی کی داستان بنتی جا رہی ہے۔ایسے میں ہم ادیبوں کے لیے ادبی موشگافیوں اور اپنے اپنے نظریات سے وفاداریوں کی جگہ ایسے اعمال وافعال کی طرف توجہ دینا ضروری ہو گیا ہے جو ہندوستانی عوام کی، خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو یا کوئی اور، غلط اندیشی اور بے راہ روی کو راہ راست پر لا سکیں۔ہمیں وہ کرنا چاہیے جو ہٹلر سے نجات حاصل کرنے کے لیے یورپ اور دیگر اقوام عالم کے اتحاد نے کیا تھا۔بلا لحاظ مذہب وملت ہمیں اپنے ہم خیال لوگوں کا ایسا محاذ تیار کرنے کی ضرورت ہے جو فرقہ پرست قوتوں کو معاشرے سے اخراج کا راستہ دکھا کر انھیں الگ تھلگ کر سکے اور نتیجے کے طور پر ان کے عزائم مفلوج ہو جائیں۔ایسا ہو سکے تو یہ ہمارے عزیز وطن، ہندوستان کے خوش آیند اور پر امن مستقبل کی ضمانت ہوگا۔ظاہر ہے ایسے حالات پیدا کرنے میں ادب کا کردار بہت اہم ہوتا ہے، اس لیے ادیبوں اور شاعروں کی ذمے داریاں اپنے آپ بڑھ جاتی ہیں۔

ہم اس بات کے چشم دید گواہ ہیں کہ ہماری سیاست نے ماضی میں 'وندے ماترم' 'ہر ہر مہادیو' 'جے شری رام' یا 'نعرہ تکبیر، اللہ اکبر' جیسے نعروں کو کسی نہ کسی طور دہشت گردی کی علامت بنادیا، اسی طرح کچھ تنظیموں کا سادھو سنتوں اور علمائے دین کی معصومیت کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا، انھیں دہشت کی علامت بنا سکتا ہے۔خدا نہ کرے کہ ایسا ممکن ہو پائے، لیکن اگر یہ صورت حال پیدا ہو گئی تو ہمارے حالات اور بھی سنگین ہو جائیں گے۔اگر یہ ہمارا مقدر ہو جائے گا تو ہمارے دلوں میں ان کی عزت وعظمت کیسے محفوظ رہ پائے گی۔ہم ان پر اعتبار کیسے کر پائیں گے۔اور جب ان پر سے اعتبار اٹھ جائے گا تو ہم ان سے مذہبی اور اخلاقی رہنمائی کیسے حاصل کر پائیں گے۔

ہمارے سیاست داں، جن کے پاس ان برائیوں کو روکنے کے وسائل ہیں، اپنے اپنے منھ میں گھنگھنی ڈال کر بیٹھے ہیں۔ انھیں ان تمام باتوں میں ملک وقوم کے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ وہ بس حال میں جینا پسند کرتے ہیں اور مستقبل کے سنہرے خواب دیکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ معاشی استحکام کا حصول اور دنیا میں بڑی قوت بن جانا ہی ہر مسئلے کا حل اور معاشرے کی ہر بیماری کا علاج ہے۔ یہ ان کی خام خیالی ہے۔ مغرب کے اگلے ہوے نوالوں کو اپنے منھ میں رکھ کر مزے لینے والوں کو ایک بار اُن ملکوں کی معاشی ترقیات سے برآمد ہونے والے نتائج پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ وہاں کے معاشرے پر اس کے مضر اثرات کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ اگر ایسا کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان معاشی ترقیات اور مادی آسائشوں کی کثرت کے درمیان وہاں سماج ٹوٹا ہے، انسان اور انسان کی درمیانی دوری بڑھی ہے۔ باہمی محبت اور یگانگت کا جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ خود غرضی اور ذاتی مفاد پرستی لے رہی ہے۔ مذہب، جو ہمیں راہ راست پر رکھنے کا ایک بڑا وسیلہ ہے، رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے۔ لوگ نازک جذبات سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ مشینوں کی بے لگام غلامی انسانی دماغ کو مفلوج اور ناکارہ بنا رہی ہے۔ لوگوں کی بے اطمینانیوں میں اضافہ ہو رہا ہے، انسانوں میں دوسرے انسانوں پر ظلم کرنے کی حیوانی جبلت بڑھ رہی ہے اور اس کا ردِعمل تشدد کی انتہائی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے، جو نئی نوعِ انسان سے رفتہ رفتہ اس دنیا میں رہنے کا حق چھین رہی ہے۔

یہ وہ خوفناک مسائل ہیں، جن کی جانب مغرب نے توجہ نہیں دی۔ اگر ہم بھی بے سوچے سمجھے اور بغیر کسی واضح منصوبہ سازی کے اسی طرح ان کی تقلید کرتے رہیں گے تو ہمارے یہاں بھی یہی کچھ ہوگا۔ بلکہ بہت کچھ ہونا شروع بھی ہو چکا ہے۔ ہمارے سیاسی مفکرین کو معاشیات کے ساتھ ساتھ سماجی و اخلاقی معاملات میں بھی دور اندیشی اور منصوبہ بندی کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ ورنہ اس سے پیدا ہونے والے مسائل ہمارے معاشی استحکام کو بھی کھوکھلا کر دیں گے۔

مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے باہمی اتفاق واتحاد یا انتشار و اختلاف کے بارے میں بات کرنے کا یہاں کوئی محل نہیں ہے، اس لیے کہ یہ ناول صرف ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے بحث کرتا ہے اور ہندو اس میں محض ایک کردار کی طرح آئے ہیں۔ ان کے بھی اپنے مسائل ہیں، ان کا بھی اپنا طرزِ فکر ہے، ان کی بھی اپنی توقعات ہیں، ان کے بھی اپنے خوف ہیں، لیکن اس ناول میں

ان سب پر بحث نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے ان سے متعلق واقعات کو بس من وعن پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کسی مثبت یا منفی تبصرے سے گریز کیا گیا ہے۔ البتہ حتی الامکان اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے اور نہ اس ناول میں بیان کردہ کوئی بات ان کی دل آزاری کا سبب بنے۔ پھر بھی اگر کسی قاری کو کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے تو مصنف پیشگی طور پر اس سے معذرت خواہ ہے اور اسے یقین دلاتا ہے کہ مصنف نے شعوری طور پر ایسا نہیں کیا ہے۔

حالانکہ مجھے 'قلم کی مزدوری' کرتے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے لیکن آج بھی میں اپنا ہر ناول 'یہ کام میں نہیں کر پاؤں گا' کے ساتھ شروع کرتا ہوں اور 'یہ کام بھی بالآخر میں نے کر ہی لیا' کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔ اس سے اپنے تخلیقی طریقہ کار اور اپنی ادبی صلاحیتوں پر عدم اعتماد کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ میرا سچ ہے بھی یہی۔ میرا یقین ہے کہ مجھ کم صلاحیت اور بے مایہ شخص سے یہ کام قادر مطلق اپنی مصلحت اور میری تربیت کے اشتراک سے کروالیتا ہے۔ اس بار ان دونوں کا درمیانی وقفہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا۔ اتنا طویل کہ مجھے تشویش لاحق ہونے لگی تھی کہ شاید.....شاید.....لیکن اب اسے انجام تک پہنچا کر میں خود بھی حیران کن مسرت سے دوچار ہوں۔ میرے اس رویے اور زاویہ فکر کا ایک فوری فائدہ تو بہرحال مجھے مل ہی رہا ہے، وہ یہ کہ میں خود غرضی، خود پروری اور خود اشتہاری کے اس دور میں بھی تکبر اور غرور جیسی لعنتوں سے محفوظ رہ پاتا ہوں۔

اس ناول کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا لحاظ رکھا جانا چاہیے کہ وہ تمام خیالات جن سے اس ناول کا ہیولیٰ تیار ہوا ہے، ایک شخص کی انفرادی فکر کے نتائج ہیں، کسی گروہ کے طے شدہ افکار و نظریات نہیں۔ اس لیے ہر شخص کو ان سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا پورا حق ہے۔ ویسے بھی انفرادی خیال اکثر کسی نہ کسی ترمیم کا محتاج ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اکثر اس کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے اسے حرف آخر بہرحال نہیں سمجھا جا سکتا۔

ناول کا موضوع چونکہ حالات حاضرہ سے متعلق ہے، اس لیے اس میں سے کچھ واقعات، مقامات اور کردار قاری کے لیے شناسا بھی ہو سکتے ہیں، لیکن مصنف کی شعوری کوشش یہ رہی ہے کہ اس کے افکار سے حقائق کی بازیافت ممکن ہو سکے۔ اس کے لیے جہاں جہاں جس مقام، کردار، وقت اور واقعے کی اسے ضرورت محسوس ہوئی ہے، اس نے استعمال کر لیا ہے۔ اس لیے تخلیقی ادب، خصوصاً ناول

نگاری کے ضوابط کی رو سے اس ناول کے تمام واقعات، مقامات، زمانہ اور کرداروں کو فرضی تصور کیا جائے اور اگر کہیں کسی واقعے، مقام یا کردار کی مماثلت یا مطابقت کسی حقیقی واقعے، مقام یا کردار سے نظر آئے تو اسے محض اتفاق سمجھا جائے۔

اس ناول کو لکھنے کے دوران ہمیشہ کی طرح میرے کچھ عزیزوں، دوستوں اور کرم فرماؤں نے میری مدد کی ہے۔ سب سے پہلے میں اپنے دیرینہ کرم فرما اور اردو کے ممتاز محقق پروفیسر حنیف نقوی کے لیے اظہار تشکر اپنا خوش گوار فریضہ تصور کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنی بے انتہا معروفیات اور فکشن سے اپنی فطری مناسبت نہ ہونے کے باوجود میری درخواست پر اس ناول کے مسودے پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا کی۔ بنارس میں برادر عزیز کبیر اجمل نے جہاں ایک طرف مجھے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے نقشے فراہم کر کے میرا کام آسان کیا، وہیں اپنی فنی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس ناول کے لیے ایک دلفریب سرورق تیار کیا، تو عزیزی خالد جمال نے نہ صرف مجھے گجرات میں ہونے والے انسانیت سوز مظالم اور مسلمانوں کے قتل عام کی تفصیلات مہیا کیں بلکہ بنارس کے مدن پورہ سے متعلق کرداروں کی زبان تحریر کرنے میں بھی میری مدد کی۔ میں ان دونوں کے اس پر خلوص تعاون کے لیے تہ دل سے ممنون ہوں۔

میں یہاں اپنی سابق ہم کار ڈاکٹر اراوتی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جو بنارس ہندو یونیورسٹی کے ایک ویمنس کالج میں قدیم ہندوستانی تاریخ وتہذیب اور آثار قدیمہ کے شعبے کی صدر ہیں اور تاریخ کے میدان میں مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ خود ہندی کی ایک اچھی ناول نگار بھی ہیں۔ انھوں نے مجھے مختلف کرداروں کے مکالمے ان کی علاقائی یا مادری زبان، خصوصاً بھوجپوری اور بنگلہ زبان میں تحریر کرنے میں میری مدد کی۔ میں اپنے دیرینہ کرم فرما اور بھوپال سے تعلق رکھنے والے جدید لب و لہجے کے نمائندہ شاعر ظفر صہبائی کا بھی مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے اپنے تین شعروں کو اس ناول میں استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اور آخر میں اس سلسلے کا اختتام میں اپنی بیٹی ناہید فاطمہ کو دعائیں دینے کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں کہ جب جب میں نے اس سے کسی طرح کی مدد طلب کی، اپنے تمام کام چھوڑ کر اس نے میری مدد کی۔ خدا اسے خوش رکھے اور صحت کے ساتھ طویل عمر عطا کرے، تا کہ وہ میری ادبی روایت کو اور آگے

لے جا سکے۔

معذرت خواہ ہوں کہ ناول کا ابتدائیہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا ہے، لیکن انتخاب کردہ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر یہاں کچھ معروضات اور چند وضاحتیں نہایت ضروری تھیں۔ میرا کام ہو چکا اور اب میں قارئین اور ناول کے درمیان رہ کر ان کا مزید وقت نہیں لوں گا، اس لیے اس درخواست کے ساتھ ان سے رخصت کی اجازت چاہتا ہوں کہ وہ اسے پڑھنے کے بعد مجھے اپنے گراں قدر خیالات اور تاثرات سے ضرور نوازیں۔ میں جانتا ہوں کہ "قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری"۔

یعقوب یاور
شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

بنارس
۵ر جولائی ۲۰۰۸ء

ایک

مغرب میں غروب ہونے والا آفتاب کچھ شرمندہ سا، اپنا چہرہ بادلوں کے پیچھے چھپانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ شاید اس کی نظروں کے سامنے جو کچھ ہوا تھا، اسے پسند نہیں آیا تھا۔

'اللہ کی یہی مصلحت تھی'۔ مسلم اکثریت والے قصبہ کوٹ کی جامع مسجد کے پیش امام حافظ عبدالصمد خاں نے مغرب کی نماز کے بعد مسجد سے نکلتے ڈرے سہمے مسلمانوں سے جیسے ڈھارس بندھانے والے انداز میں کہا۔ 'اس کی ہر مصلحت میں بنی نوع انسان کی فلاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے وہ بظاہر بھلے ہی ہم ایمان والوں کے حق میں ضرر رساں اور دہشت ناک نظر آرہا ہو لیکن بہ حیثیت ایک مسلمان کے ہمیں اس بات پر یقین کامل ہونا چاہیے کہ اس میں یقیناً ہماری فلاح کا کوئی نہ کوئی پہلو پوشیدہ ہوگا۔ خدا علام کل اور قادر مطلق ہے۔ سمیع و بصیر اور مسبب الاسباب ہے۔ زمان و مکان کی ایک ایک شے اس کے دائرۂ قدرت میں ہے۔ ممکن ہے یہ لرزہ خیز واقعہ ہمارے باہمی نفاق و انتشار میں اتفاق و یگانگت اور ہمارے خواب گراں میں بیداری اور عمل کا محرک بن جائے۔ خدا اپنے اُن ظالم اور نافرمان بندوں پر ضرور عذاب نازل کرے گا، جن کے ہاتھ معصوم مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ان انسان دشمن لوگوں نے نہ صرف ہمارے ملک کے امن و امان اور محبت و یگانگت کی فضا کو نقصان پہنچانے کی مذموم کوشش کی ہے بلکہ اس کے ارتقا کے عمل کو ایک کاری ضرب بھی لگائی ہے۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ جابروں اور ظالموں کو سزا دینے کے اُس کے اپنے طریقے ہیں، وہ ضرور اُن کو سزا دے گا'۔

'آب ج کُجھ کُس کُھا فے وا کُھدا کا نہیں ھنھن کا کی کا ھوئی'۔ نمازیوں میں سے ایک نوجوان مسعود خاں کی آواز اُبھری۔ اس کا مشتعل چہرہ مغربی افق پر حد نظر تک بسیط سرخی سے مماثل تھا، جس سے اُس کے دل کے اندر موجزن طوفان کا تھوڑا بہت اندازہ ہو رہا تھا۔ 'ھم کا کُھد ایس کاپھرن کا سبک سبکھانے کا ھوئی'۔

کوٹ اُتر پردیش کے جنوب وسطی میدانی خطے میں دریائے جمنا کے کنارے آباد ایک

چھوٹا سا قصبہ تھا، جہاں غیر مسلموں کے ایک دو گھر چھوڑ کر صرف بُنکھر پٹھان آباد تھے۔ یہ سب ایک ہی جد اعلیٰ ملک بیسل کی اولاد تھے، جس نے عہد محمد غوری میں اس گاؤں کو آباد کیا تھا۔ قریبی شہر کھاگا سے اس کا فاصلہ تقریباً پینتیس کلومیٹر تھا۔ شاید اسی فاصلے کے سبب اس قصبے کی کبھی کوئی خاص سیاسی اہمیت نہیں رہی، اس لیے یہ علاقہ پس ماندہ رہ گیا تھا۔ اس کے پچھڑے پن کے کئی دوسرے اسباب کے ساتھ ایک بڑا سبب یہاں کے لوگوں کا باہمی نفاق بھی تھا، جو کئی پشتوں سے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ یہاں چونکہ ظالم اور مظلوم دونوں ہی مسلمان تھے اس لیے علاقے کی پولیس کو بھی زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ بلکہ ایک طرح سے وہ اس باہمی جھگڑے کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہتے تھے۔ اس سے ایک طرف ان کی روزی روٹی کا کچھ اضافی بندوبست ہو جاتا تھا اور دوسری طرف ان کی کارگزاریوں کا ان کے آقاؤں کی طرف سے مناسب انعام و اکرام بھی ملتا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں پہنچنے کے لیے نہ تو پختہ سڑک تھی، نہ بجلی اور نہ زندگی گذارنے کے لیے دوسری بنیادی سہولتیں۔ زراعت یہاں کے لوگوں کا واحد ذریعہ معاش تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ یہاں کسان کی محنت ہمیشہ ہی بادلوں کے رحم و کرم پر منحصر رہتی تھا۔

کچھ خاندانوں کے مابین باہمی عداوتوں کے طفیل قتل و غارت گری کا سلسلہ یہاں کئی پیڑھیوں سے جاری تھا۔ کھیتی باڑی کے بعد ان کا بیشتر وقت مقدمہ بازیوں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سازشوں میں صرف ہوتا تھا۔ جس کے لیے ان کا ایک قدم کوٹ میں تو دوسرا تحصیل کھاگا یا ضلع فتح پور میں ہوتا تھا۔ لٹھ بازی اور گھڑسواری اب بھی یہاں کے نوجوانوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ تعلیم کی روشنی حالانکہ یہاں تک پہنچی ضرور تھی لیکن اس کا اثر لوگوں کے مزاج پر ذرا کم ہی دیکھنے کو ملتا تھا۔

پورے گاؤں میں لے دے کے ایک حافظ عبد الصمد خاں تھے جن کے گھر پر روزانہ ڈاک سے اخبار آیا کرتا تھا، جو دو تین دن پرانا ہو چکا ہوتا تھا لیکن یہاں کے اردو پڑھے لکھے معمر لوگ سارا دن بڑی دلچسپی سے اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے اور اگلے اخبار کے آنے تک اس میں چھپی ہوئی خبریں ان کی گفتگو کے موضوعات ہوا کرتی تھیں۔ اس کے طفیل حافظ صاحب کی بیٹھک میں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ یہاں کے لوگ بنیادی طور پر مذہبی مزاج رکھتے تھے اور مذہب کے نام پر جان و مال کی بازی لگا دینے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ اس چھوٹے سے قصبے میں چھ مسجدیں تھیں، جن میں سے بیشتر شاہان

سلف کی تعمیر کردہ تھیں۔ یہاں کی جامع مسجد کی تعمیر شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے کروائی تھی، ایسا یہاں کے لوگوں کا کہنا تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک باہر کی دنیا سے ان کا ربط برائے نام تھا۔ لیکن جب سے یہاں کی ایک مسجد سلطان لادن (سلطان علاء الدین خلجی) کے بارے میں کچھ شرپسندوں نے یہ افواہ پھیلائی کہ اس کی تعمیر کسی مندر کو مسمار کر کے کی گئی ہے تو یہاں کے لوگوں کی پرسکون زندگی میں جیسے ایک ابال آ گیا تھا اور اچانک ہی جیسے ان کا تعلق باہر کی دنیا سے قائم ہو گیا۔ اس افواہ کے پیچھے پوشیدہ شرارت انھیں اس لیے ایک لمحے میں سمجھ میں آ گئی کیونکہ یہاں کا بچہ بچہ اس بات سے واقف تھا کہ موجودہ مسجد تیسری بار تعمیر ہوئی تھی۔ سلطان کی تعمیر کردہ مسجد اور اس کی تعمیر ثانی کب کی دریائے جمنا کے کٹاو کی نذر ہو چکی تھی۔ البتہ وہ کتبہ اب بھی اس نئی مسجد کی زینت تھا جو اصل مسجد میں اس کی تعمیر کے وقت لگایا گیا ہوگا۔ مسلم دشمن فرقہ پرستوں کی اس شرارت نے اگر یہاں کے نوجوانوں میں بے اعتمادی اور عدم تحفظ کا احساس پیدا کر دیا تھا تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی کم از کم اس وجہ سے یہاں کے امن عامہ میں خلل پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کیونکہ یہ لوگ اپنے غم و غصے کا اظہار آپس میں کر کے ہی اپنی تسلی کر لیتے تھے۔

آج جامع مسجد کے باہر جو کچھ ہو رہا تھا وہ بھی ان کے اسی خوف اور بے یقینی کے رویے کا روایتی مظاہرہ تھا۔ گجرات کے حالیہ مسلم کش فسادات کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی خبریں دوسرے تمام لوگوں کی طرح یہاں کے لوگوں نے بھی ریڈیو پر سنی تھیں۔ مسعود خاں کا ترش لہجہ اسی کا فطری ردعمل تھا۔

'بیٹے اس طرح کے مسائل جوش سے نہیں ہوش، دور اندیشی اور ذہانت سے حل کیے جاتے ہیں'۔ حافظ عبدالصمد خاں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

'ئی دُور آندیسی آپنے پاس رکھو مولانا۔ ئی مسئلا آپئی سے حل ہوئے والا نہیں نا۔ کاپھرن کی ئی ہمت کہ ہمرے دیسو ماں ہم کا چین سے نا رہے دیتھیں۔ اب ان کا ئی بتاوے کا وَخت آگا ہے کہ ہم بُج بل اور نامرد نہیں نا۔ ئی بتاوب بہت جروری ہوئی گا ہے کہ ہمہوں ہمت اور تاکت کا استمال کرب جانت ہن'۔ مسعود خاں آج خلاف معمول غصے میں بری طرح کھول رہا تھا۔

مسعود خاں گاؤں کا ایک بیس بائیس سالہ شریف نوجوان تھا۔ اس کی ماں زندہ تھی نہ باپ۔

کوئی بھائی بہن بھی نہیں تھا۔ اس کی بیوہ خالہ رفیع النساء نے اس کی پرورش کی تھی اور وہ اب بھی اسی کے ساتھ رہتا تھا۔ خالہ کے پاس اپنی اتنی زمین تھی کہ گھر کا خرچ آسانی سے چل جاتا تھا۔ ان کا اپنا ایک بیٹا اکرم خاں بھی تھا، جس کی عمر دس بارہ برس کے آس پاس تھی۔ اس کا مزاج مسعود خاں سے بالکل مختلف تھا لیکن وہ مسعود خاں کی بہت عزت کرتا تھا۔

عام حالات میں وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتا تھا لیکن ضرورت پڑنے پر وہ ہر ایک کی مدد کے لیے آمادہ رہتا تھا۔ اس نے صرف آٹھویں جماعت تک ہی تعلیم حاصل کی تھی کہ گاؤں میں اس سے آگے پڑھنے کا انتظام ہی نہیں تھا اور حالات نے اسے باہر جا کر پڑھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ البتہ اس نے یہاں کے مدرسہ اسلامیہ سے مذہبی تعلیم حاصل کی تھی۔ آج اس کا یہ روپ دیکھ کر سب حیران تھے کیونکہ اس سے پہلے کسی نے اُسے کبھی تلخ لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

'تم حافظ عبدالصمد خاں سے اس لہجے میں بات نہیں کر سکتے۔ یہ حد درجے کی بدتمیزی ہے نوجوان'۔ حافظ عبدالصمد خاں بولے۔ اس گاؤں میں ان سے کوئی اونچی آواز میں بات نہیں کرتا تھا۔ ایک تو وہ نہایت معزز اور متمول خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور دوسرے وہ حافظ قرآن اور عالم دین تھے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے مسائل حل کرنے میں ان کی رائے حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ یہاں ہر شخص ان کا احترام کرتا تھا۔ انھیں تلخ و تند لہجے میں باتیں سننے کی عادت ہی نہیں تھی۔ مسعود خاں کے منھ سے یہ باتیں سن کر ان کے اندر کا پٹھان بیدار ہو گیا۔ وہ یہ توہین برداشت نہ کر سکے اور آپے سے باہر ہونے لگے۔ 'تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا، مسعود خاں'۔ وہ بولے۔

'بَس اِیھِن تَرا اُہنسے ماں بَکر بَکر کَریو اورایھی کے علاوہ تُم کَرِے کا سَکَت ھَو۔ آرام سے دونی جون کی مُرگا روٹی مل جات ھی تو بھاڑ ماں جائے دُنیا اور جَھنُّم ماں جائے مُسلمان، تُم کا کا۔

'اور تم تو جیسے مسلمانوں کے لیے اپنی جان ہی قربان کیے دے رہے ہو'۔ حافظ عبدالصمد خاں چڑھ کر بولے۔ ان کے لہجے میں طنز کی آمیزش ہو چکی تھی۔

'بَہُت جَلدی۔۔۔۔بَہُت جَلدی۔۔۔۔تُم سَب لوگ دیکھ لیہو۔ بَہُت جَلدی دیکھے کا ملی کہ ئ مَسُودکھاں کا کَہُت رَھَا۔ بَہُت جَلدی دیکھ لیہو کہ ھَم آپن جَان یِہی کام ماں، مُسلمانن کا

اِجّت سے اپنے دیس میں رہے کی کھاترنے دیاب'۔ اب ھم این گاؤں ماں رَھبو نا گرب۔ یا تو ھم اپن کُھا پُورا کرکے لَوٹب یا پھر ھنسے مے کی کھبر آب این گاؤں ماں آئی'۔

مسجد کے باہر گاؤں والوں کی اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ حافظ عبدالصمد خاں غصے میں پاؤں پٹکتے ہوئے اپنے گھر جا چکے تھے۔ وہ ان سے احتراماً کچھ کہہ نہیں پائے تھے لیکن اب آپس میں ان کے اڑیل رویے پر نکتہ چینی کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مسعود خاں نے جو کہا ہے، وہ اسے کر کے دکھا سکتا ہے۔ لیکن وہ کسی صورت یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسعود خاں گاؤں چھوڑ کر جائے۔ یہی سوچ کر وہ اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے مسعود خاں نے یہ فیصلہ فوری اشتعال کے تحت نہیں، بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ کیونکہ وہ اب کسی حالت میں اسے بدلنے کو تیار نہیں تھا۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے لیے مسجد کو جاتے وقت لوگوں نے دیکھا کہ اس کے گھر کے باہر، چوڑا کے چبوترے پر مسعود خاں کا بستر خالی ہے۔

اس نے پچھلی رات کسی وقت واقعی گاؤں چھوڑ دیا تھا۔

دو

حضرت گنج چوراہے پر واقع لکھنؤ کا قدیم کافی ہاؤس تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ وہی کافی ہاؤس تھا جہاں بیٹھ کر متعدد سیاست دانوں نے وطن کی تقدیر لکھی تھی۔ یہاں بیٹھنے والے شعرا و ادبا نے نہ صرف وطن کے فکری نظام پر بحث و تمحیص اور غور و خوض کیا بلکہ اپنے اشعار اور پر اثر تحریروں سے ملکی مسائل کی نشان دہی کا قابل قدر کام بھی انجام دیا۔ یہاں جمہوریت اپنے تمام تر تنوع اور رنگا رنگی کے ساتھ اپنی صحیح شکل میں جلوہ گر دیکھی جا سکتی تھی۔ یہاں ہر عمر اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگ ہمہ وقت آپس میں گفتگو کرتے، بحث کرتے اور لڑتے جھگڑتے نظر آ جاتے تھے۔ طالب علموں کے لیے تو یہ کافی ہاؤس ہمیشہ ہی رہنمایانہ کردار ادا کرتا چلا آیا تھا۔ یہاں بیٹھ کر گفتگو کرنے والوں میں عموماً عمر کے فاصلے آڑے نہیں آتے تھے۔ اس کا سب سے افادی پہلو یہ تھا کہ نوجوان جہاں ایک طرف بزرگوں کے تجربوں سے آشنا ہوتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے وہیں دوسری طرف زمانہ شناس اور آزمودہ کار بزرگ زمانے کی بدلتی ہوئی رفتار سے خود کو ہم آہنگ کرنے اور اس پر نظر رکھتے ہوئے نئی نسل کو دوستانہ انداز میں ایک

نئی جہت دینے میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔نصف صدی سے زیادہ پرانا یہ کافی ہاؤس اپنی بوسیدہ ہوتی ہوئی عمارت، کھردرے فرش اور رنگ و روغن سے عاری ہوتے ہوئے در و دیوار کے باوجود دنیا کے سرد و گرم اور وقت کی رفتار سے ہم قدم ہو کر اب بھی اپنا تاریخی فریضہ انجام دیے جا رہا تھا۔یہاں آج بھی مختلف گروہوں میں لوگ سیاست، مذہب، سائنسی ترقیات، معاشرت، تہذیب و تمدن اور زندگی کے نوع بہ نوع مسائل پر گرما گرم مباحثوں میں مصروف نظر آتے تھے۔وقت اپنے مزاج کے مطابق زمانے میں گوناگوں تبدیلیوں کے مناظر پیش کر رہا تھا تو یہ کافی ہاؤس بھی اپنے حاضر باشوں کو ان نئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

لیکن آج یہاں کا ماحول ہمیشہ سے یکسر مختلف تھا۔اس وقت یہاں ایک عجیب طرح کی خاموشی اور اداسی طاری تھی۔ایسا نہیں تھا کہ یہاں پہلے کبھی اس طرح کا ماحول دیکھنے میں نہ آیا ہو۔لیکن جب جب ایسا ماحول پیدا ہوا، شہر کی عافیت خطرے میں ضرور پڑ جاتی تھی۔آج بھی یقیناً کچھ ایسا ہی رونما ہوا یا ہونے والا تھا، جس کی امید شاید کسی کو نہیں تھی۔ہمیشہ کے مقابلے میں لوگوں کی تعداد بھی آج بہت کم تھی۔خصوصاً معمر اور تجربے کار لوگوں سے آج یہ کافی ہاؤس بالکل خالی تھا۔آج یہاں کے بیروں میں بھی اس روایتی پھرتی کی کمی تھی جس کے لیے وہ جانے جاتے تھے۔کچھ نوجوان یہاں وہاں بیٹھے اپنی سرگوشیوں سے ماحول کے سکوت کو توڑنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔کوئی بے نام خوف آج انھیں اونچی آواز میں بات کرنے سے روک رہا تھا۔

اس ماحول سے بے پروا ضرغام حیدر ایک گوشے میں بیٹھا بڑی بے چینی سے اپنے دوست عبدالرحمن کا انتظار کر رہا تھا۔اس کا چہرا غماز تھا کہ وہ کسی بات کو لے کر پریشان ہے۔اس وقت اسے عبدالرحمن کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔جلد ہی اس کے دوست کا ہیولیٰ صدر دروازے کی روشنی کے پیش منظر میں ابھرا، جسے پہچاننے میں اسے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔اسے دیکھ کر ضرغام نے اطمینان کی سانس لی۔عبدالرحمن نے داخل ہوتے ہی اپنی مخصوص نشست پر نظر ڈالی اور وہاں ضرغام کو بیٹھے دیکھ کر مسکرایا۔"السلام علیکم"۔

ضرغام اس کے سلام پر مسکرایا، عبدالرحمن اسے چڑھانے کے لیے ہمیشہ"السلام علیکم" ہی کہتا تھا۔اس نے سن رکھا تھا کہ شیعہ حضرات سنیوں کے سلام کا واضح جواب دینا پسند نہیں کرتے۔لیکن ان

دونوں کی دوستی ان رسمی اور روایتی قیود سے آزاد تھی۔ ضرغام حیدر نے اسی طرح مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔' وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

' ویری گڈ یعنی تقیہ شروع'۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ 'مگر یہ آج یہاں کے ماحول پر محرم کیوں طاری ہے میرے بھائی۔ کتنی بار کہا ہے تم سے کہ باقی مہینوں میں باہر نکلتے وقت اپنا محرم اپنے گھر پر ہی رکھ کر آیا کرو، لیکن میری کوئی بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی'۔ عبدالرحمن کی چھیڑ جاری تھی۔ ابھی وہ کافی ہاؤس کے پر سکوت ماحول سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر پایا تھا۔ اس کی آواز اتنی اونچی تو نہیں تھی لیکن پھر بھی ہر شخص مڑکر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔' بی نارمل پلیز، کچھ تو رحم کرو انسانیت پر میرے بھائی'۔ وہ لوگوں کی نظروں سے بے پروا اب بھی اپنی چھیڑ سے باز آنے کو تیار نہیں ہوا۔ گفتگو جاری رکھتے ہوئے وہ بولا۔' دیکھو تم نے آج سارے کافی ہاؤس کا ماحول ماتمی بنا دیا ہے، اٹس بیڈ، یہ اچھی بات نہیں ہے'۔ اتنے میں ایک بیرا ان کے پاس آ کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ عبدالرحمن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔' کافی'۔

' اب بس بھی کرو بھائی'۔ ضرغام نے بیرے کے چلے جانے کے بعد کہا۔ اس کے لہجے میں بیزاری کا عنصر نمایاں تھا۔ لیکن وہ اپنے دل کی بات اپنے دوست سے کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

' لیکن ضرغام، کافی ہاؤس کی یہ خاموشی کسی مصیبت کا پیش خیمہ تو نہیں ہے'۔ اس نے ہال میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور ضرغام کے لہجے کی کسک کو محسوس کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔' باہر سڑک پر بھی سناٹا ہے'۔

'نہیں یار۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ اس وقت تک تو ہم خدا کی امان میں ہیں، فی الحال اس کے قہر کی زد میں ہم نہیں ہندوستان کا مغربی علاقہ ہے'۔ ضرغام نے اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں اس کی زبان کو لگام دینے کی نیت سے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ہمیشہ کی طرح کافی کی چسکیوں کے ساتھ حالات حاضرہ پر گفتگو کا سلسلہ شروع کر چکے تھے۔ گجرات کے انسانیت سوز فسادات کو ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ فسطائیت کے اس مظاہرے کے خلاف چاروں طرف احتجاجی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ صرف مسلمانوں کی طرف سے یا صرف ہندوستان کے طول و عرض ہی سے نہیں بلکہ بلا تفریق رنگ و نسل

ساری دنیا سے۔ لکھنو میں بھی خواہ ہندو ہو یا مسلمان بس اسی ایک موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ جو لوگ بول رہے تھے وہ اس واقعے کی مذمت کر رہے تھے۔ اور جن لوگوں کی نظر میں گجرات میں جو کچھ ہوا ٹھیک تھا، وہ خاموش رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر سے یہ خبریں بھی سننے میں آ رہی تھیں کہ کچھ عافیت مخالف، سماج دشمن عناصر لکھنو میں بھی گجرات جیسا ماحول بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اس طرح کی باتوں پر لوگ یقین نہیں کر رہے تھے۔ شاید انھیں لکھنو کے عوام پر بھروسا تھا۔ شاید اتنے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے قتل عام کے فوراً بعد وہ اس طرح کے کسی دوسرے واقعے کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ شاید انھیں اب بھی انسانی اقدار کی بقا کا یقین تھا۔ شاید انھیں یہ بھی امید تھی کہ ریاست کی موجودہ مخلوط حکومت ان حالات میں ایک نئے فساد کی سرپرستی قبول نہیں کر سکتی۔

'یہ ہر ہر مہادیو اور نعرۂ تکبیر کی سیاست ہندوستان کو لے ڈوبے گی'۔ ضرغام حیدر کلیم نے اپنے دوست عبدالرحمن انصاری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔' ہمارا ملک کہاں جا رہا ہے۔ کیا ہم واقعی بے حس ہو چکے ہیں۔ ہماری غیرت کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ کیا سچ مچ ہماری رگوں میں خون کی جگہ پانی دوڑنے لگا ہے۔ کیا لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ ہمارے سیاسی رہنماؤں میں ہٹلر اور چنگیز خان کی روح حلول کر گئی ہے۔ دیکھو نا۔ ایر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھے ہوئے ان کے من میں گرم ترنگیں اٹھیں اور بس کاٹ کر رکھ دیا ہزاروں مسلمانوں کو۔ شہر کے شہر صاف کر دیے مسلمانوں سے۔ ایسی نسل کشی اور ہندوستان میں۔ یقین نہیں آتا۔ یہ ہندوستان نہیں رہا، ہٹلر کا جرمنی بن چکا ہے۔ فاشزم کی اس سے بری مثال ہماری ساری تاریخ میں نہیں ملے گی۔ اور معاملہ بس اتنا ہی نہیں ہے، ہمارے یہ نام نہاد رہنما بڑے زور شور سے کھلے عام سارے ہندوستان کو گجرات بنانے کی دھمکی بھی دے رہے ہیں۔ کیا ہجڑے ہو گئے ہیں سب۔ کیا کوئی ان کی زبان روکنے والا نہیں رہا۔ جو منھ میں آتا ہے بک رہے ہیں یہ لوگ۔ جیسے مسلمان کچھ ہوتے ہی نہیں اس ملک کے۔ ہمارے وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کو تو دیکھیے۔ کتنی بے شرمی سے کہہ رہے ہیں کہ یہ سب گودھرا کا فطری ردعمل تھا۔ نہ مسلمانوں نے ٹرین پھونکی ہوتی اور نہ گجرات میں قتل عام ہوا ہوتا۔ اور گودھرا کے معاملے پر بھی تو اسرار کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ کیا ہوا تھا گودھرا میں، یہ سچ تو ابھی پردے میں ہے۔ ابھی تو ہم صرف وہ سن رہے ہیں جو وہ ہمیں سنانا چاہتے ہیں۔ مجھے تو یہ سب خود انھیں کے کرتوت لگتے ہیں۔ منصوبہ بنا کر اپنے ہی کچھ لوگوں کو مار دیا اور گجرات کو جہنم

بنانے کا جواز پیدا کرلیا۔ ابھی کل ہی اپنا حسن جمال مجھے ایک ای میل دکھا رہا تھا، جو گودھرا ہی سے 'گجرات سماچار' اخبار کے 'سونی' نام کے کسی جرنلسٹ نے بھیجا ہے۔ اس میں سارا واقعہ نہایت تفصیل سے لکھا ہے کہ رام مندر کے کارسیوک کس طرح سابرمتی ایکسپریس سے اُس ایودھیا سے، جہاں یُدھ حرام ہے، واپسی کے سفر کے دوران، ہر اسٹیشن پر اودھم مچا رہے تھے۔ خاص طور پر گودھرا سے ۴۰ کلو میٹر پہلے 'داہود' اسٹیشن پر تو انھوں نے حد ہی کر دی تھی۔ یہاں چائے ناشتے کے بعد پیسہ طلب کرنے پر انھوں نے بڑے پیمانے پر توڑ پھوڑ کی تھی۔ روکنے والوں کو مارا پیٹا بھی تھا۔ ٹرین گودھرا پہنچی تو پلیٹ فارم پر ایک داڑھی والے مسلمان دکاندار کو دیکھ کر ان کا خون پھر کھول اٹھا۔ انھوں نے اس سے سامان خریدنے کے بعد پیسہ دینے سے جان بوجھ کر انکار کیا۔ اصرار کرنے پر انھوں نے اس کی داڑھی پکڑ کر کھینچی۔ ظاہر ہے اس کا مقصد محض ایک مسلمان کو ذلیل کرنا ہی تھا۔ انھوں نے 'مندر کا نرمان کریں گے'، 'بابر کی اولادوں کو دیش سے نکالیں گے'، 'ہندستان ہندوؤں کا ہے'، 'ہندوستان میں رہنا ہے تو جے شری رام کہنا ہوگا' جیسے نعرے لگائے۔ بات آگے بڑھی تو قریب کھڑی اس کی سولہ سالہ جوان لڑکی کو، جو اپنے باپ کو پٹنے سے بچانے کے لیے ان سے فریاد کر رہی تھی، اپنے ڈبے میں اٹھا لے گئے۔ باہر لوگ اس کو بچانے کے لیے چیختے ہی رہ گئے۔ اس ای میل میں اس جرنلسٹ کا موبائل نمبر، گھر اور دفتر کا پتہ اور فون نمبر بھی دیا ہوا ہے، تصدیق کے لیے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر گودھرا کا نام لینے والے ہمارے نیتا کارسیوکوں کے اس کارنامے کا ذکر کیوں نہیں کرتے'۔

'دیکھو ضرغام' عبدالرحمن نے اپنے دوست کو متنبہ کرتے ہوئے کہا۔ 'آج یہاں مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔ شہر میں کچھ ہونے والا ہے، ایسا لگتا ہے۔ پھر اس کافی ہاؤس میں جب جب ایسا سناٹا دیکھنے میں آیا ہے، تب تب شہر میں کوئی نہ کوئی انہونی ضرور ہوئی ہے۔ ایٹ دس مومنٹ، کیپ یور سیلف کوائٹ پلیز۔ صبر کرو اور اپنی زبان پر قابو رکھو۔ آج کا دن اس طرح کی باتیں کرنے کے لیے مناسب نہیں معلوم ہو رہا ہے۔ کسی نے سن لیا تو لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں'۔

'ارے بھائی، ہماری یہی بزدلی، بے حسی اور نا کارہ پن ہی تو ہے جس نے ہم مسلمانوں کے خون کے پیاسوں اور ہمارے ملک کے دشمنوں کے حوصلے بلند کر رکھے ہیں'۔ اس نے اپنا ہی ایک شعر پڑھا۔

انھیں تو شوق ہے شعلہ نوائیوں کا کلیم

ہم اپنی گرمیِ دل کا علاج ڈھونڈتے ہیں

"ہمیں جو کہنا ہے چیخ چیخ کر کہیں گے۔ سچ بولنے کے لیے کسی مصلحت کی ضرورت نہیں ہوتی عبدالرحمن۔ جو ہونا ہے، آج ہو ہی جائے۔ ہم کب تک اس طرح خاموش اور منہ چھپائے بیٹھے رہیں گے۔ ضرغام جیسے آج خاموش نہ ہونے کا تہیہ کر کے بیٹھا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور عبدالرحمن کی درخواست کو رد کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "بھول گئے بابری مسجد کی شہادت، جب ہر ہندو اپنی فتح کے جوش میں سینہ تانے مسلمانوں کی تذلیل کرتا پھر رہا تھا۔ سارے ہندوستان میں فتح کا جشن منایا گیا تھا۔ اس پر ایک مسلمان کے ذرا سے احتجاج پر کاٹ کے رکھ دیا تھا سارے بھوپال کے مسلمانوں کو۔ وہ تو اچھا ہوا کہ بمبئی بم دھماکوں نے ان کی خوشی پر لگام لگا دی، ورنہ یہ نہ جانے کیا آفت برپا کرتے۔"

"میں یہ نہیں کہوں گا میرے بھائی ضرغام کہ تم غلط کہہ رہے ہو۔ عبدالرحمن نے کہا۔ "تمھارا حرف حرف صداقت پر مبنی ہے۔ میں بھی بزدل نہیں ہوں۔ لیکن نہ جانے کیوں آج مجھے ڈر محسوس ہو رہا ہے۔ اس نے ادھر ادھر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "دیکھو جو لوگ غلطی سے یہاں آ گئے ہیں وہ بھی ایک ایک کر کے کھسک رہے ہیں۔ اب کسی انہونی کے پہلے ہم لوگوں کو بھی یہاں سے اُٹھ جانا چاہیے۔"

سید ضرغام حیدر کلیم لکھنوی اور عبدالرحمن انصاری لکھنو یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ ضرغام اس سال فلسفے میں ایم اے فائنل کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے شاعری سے بھی شغف تھا۔ بلکہ ایک طرح سے شاعری اسے ورثے میں ملی تھی۔ اس کے والد سید حسن جواد سلیم لکھنو کے معروف شاعروں میں سے تھے۔ وہ مولوی گنج کے اپنے چھوٹے سے آبائی مکان میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ والد عرصہ ہوا ضعف بصارت کے سبب معاش کے خرخشوں سے بری الذمہ ہو چکے تھے۔ گھر کی معاشی حالت بس ویسی ہی دگرگوں تھی جیسی عام طور پر ہندوستان میں اردو کے کسی شاعر کے گھر کی ہو سکتی ہے۔ دہلی میں ملازم بڑے بھائی سید انعام حیدر کی ماہانہ امداد سے گھر کی گاڑی کسی طرح لشتم پشتم چل رہی تھی۔ ضرغام ہمیشہ اس بات کے خواب دیکھا رہتا تھا کہ وہ اتنا پیسہ کمائے کہ اپنے والدین کو ہر طرح کا آرام فراہم کر سکے۔ وہ ایک سیدھا سادا ایمان دار نوجوان تھا۔ جس کے ذہن میں دوسرے نوجوانوں ہی کی طرح اپنے روشن مستقبل کے خواب تھے اور جن کی تعبیر ابھی پردہ خفا میں تھی۔ اپنے گھر کے دگرگوں معاشی حالات

اور اپنے باپ کی ترش روئی کے باوجود وہ اس کافی ہاؤس میں پابندی سے آیا کرتا تھا۔ عبدالرحمن سے اس کی ملاقات پچھلے سال اسی کافی ہاؤس میں ہوئی تھی۔ مزاج میں یکسانیت اور فکری ہم آہنگی نے دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا تھا۔ اب دونوں گہرے دوست تھے۔ عبدالرحمن اکثر اس کے گھر بھی آیا جایا کرتا تھا۔ یہ دوستی ضرغام کے والد کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے ایک سنّی مسلمان سے اس طرح خلط ملط ہونے پر اس سے الجھتے رہتے تھے۔ لیکن ضرغام پر ان کی خفگی یا سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا، جس نے ان کے مزاج میں ایک طرح کا چڑچڑاپن پیدا کر دیا تھا۔

عبدالرحمن کا تعلق بنارس سے تھا۔ اس کے والد شہر کے ایک باعزت اور متمول تاجر تھے۔ ان کا بنارسی ساڑیوں کی برآمد کا بڑا کاروبار تھا، ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ لندن اور نیویارک جیسے شہروں میں ان کے نمائندے کام کر رہے تھے۔ جب سے بنارس کے انصاریوں میں بیداری کی لہر آئی تھی وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینے لگے تھے۔ شاید یہ معاشرتی عدم اطمینان کا جبر تھا کہ اس برادری کی نئی نسل اپنے آبائی کاروبار سے بے اعتنائی برتنے لگی تھی اور معاش کے زیادہ باوقار امکانات تلاش کرنے میں منہمک تھی۔ عبدالرحمن کے والد حاجی عبدالاحد انصاری عرف حاجی لندن روشن خیال، سادگی پسند اور مذہبی مزاج کے پابند صوم وصلوٰۃ انسان تھے۔ اپنی اہلیہ کے ساتھ وہ تین بار فریضۂ حج بھی ادا کر چکے تھے۔ انھوں نے عبدالرحمن کی پرورش میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ وہ ان معاشرتی برائیوں سے محفوظ رہے جو عام طور پر ان کی برادری میں پائی جاتی تھیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنے بیٹے کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے دوران اسے گھر میں رکھنے کے بجائے ہاسٹل کو ترجیح دی تھی۔ حالانکہ ان کے محلے کے لوگوں کے علاوہ عزیز و اقارب نے بھی ان کے اس اقدام کی شدید مخالفت کی تھی۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ ہمارے باپ دادا کی روایات سے انحراف ہے، جو اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن حاجی عبدالاحد نے سلیقے سے ان کی بات کو ٹال دیا تھا تاکہ انھیں برا بھی نہ لگے اور وہ اپنا کام اپنی مرضی کے مطابق کر لیں۔ لڑکا ذہین اور پڑھنے میں تیز تھا۔ ابھی تک اس نے تمام درجات میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ کسی بھی حالت میں اس کے تعلیمی سفر میں کوئی رخنہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے اب انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے اسے بنارس کے باہر لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ دلایا تھا، جہاں وہ یونیورسٹی ہاسٹل میں رہتے ہوئے معاشیات میں ایم اے کر رہا تھا۔

اب بچے کھچے لوگ بھی رفتہ رفتہ کافی ہاؤس سے جا چکے تھے اور ان دونوں کے علاوہ وہاں کوئی اور نہیں بچا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ باہر سڑک پر پولیس کی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں۔ اسی وقت پولیس کا ایک جوان اندر آیا۔ عبدالرحمن نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ ہیڈ کانسٹبل رئیس احمد تھا۔ اس نے عبدالرحمن کو دیکھا تو اسی کی طرف بڑھا اور آتے ہی بولا۔ 'یہاں کیا کر رہے ہو تم لوگ۔ شہر کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ تم لوگ فوراً اپنے اپنے گھر چلے جاؤ۔ ممکن ہے جلد ہی کرفیو کا اعلان کر دیا جائے۔'

'کیا بات ہے رئیس صاحب، نہ دعا نہ سلام، بس ڈانٹنا شروع کر دیا۔ تم پولیس والوں کی نظر میں دوستی ووستی بھی کچھ ہوتی ہے یا نہیں؟' عبدالرحمن نے کہا۔

'یہ وقت فارملٹی نبھانے کا نہیں ہے عبدالرحمن صاحب، جان بچانے کا ہے۔' رئیس احمد بولا۔ 'میں پولیس والا بھی ہوں اور تمھارا دوست اور خیر خواہ بھی، اس لیے سلام دعا سے پہلے زندگی کی حفاظت کی بات کی۔' اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ 'السلام علیکم۔'

'وعلیکم، جیتے رہو برخوردار۔' عبدالرحمن نے بزرگوں کے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ 'اب ہم یہاں سے جا سکتے ہیں؟'

اس کے بعد رئیس احمد نے کافی ہاؤس کے منیجر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ 'مرنے کا ارادہ ہے یا جیل جانے کا، جو ان حالات میں کافی ہاؤس کھلا رکھ کر شہریوں کی زندگی خطرے میں ڈال رہے ہو۔' اس کا لہجہ بالکل پولیس والوں جیسا ہو چکا تھا۔ 'بند کرو جلدی اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'

اس نے ایک نظر عبدالرحمن اور ضرغام حیدر پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

رئیس احمد کے اس لہجے پر دونوں حیران تھے۔ اب انھیں لگ رہا تھا کہ شاید شہر کے اوپر واقعی کوئی خطرہ منڈلا رہا ہے۔ وہ اٹھے اور کافی ہاؤس کے باہر نکل آئے۔ لکھنؤ کے مصروف ترین چوراہے پر سناٹے نے اپنے پر پھیلا رکھے تھے۔ کہیں کہیں ایک آدھ کار، رکشہ یا آٹو رکشہ دکھائی دے جاتا تھا۔ اس تشویش ناک ماحول کو دیکھتے ہوئے عبدالرحمن نے کہا۔ 'بہتر ہوگا ضرغام کہ ہم لوگ فوراً یہاں سے چل پڑیں۔ میں تو اب سیدھا ہاسٹل جاؤں گا، حالانکہ مجھے امین آباد میں کچھ ضروری کام تھا۔ تم بھی کوئی رکشہ وکشہ لے لو اور گھر چلے جاؤ۔ آج پیدل جانے کی حماقت مت کرنا۔ پیسے ویسے ہیں جیب میں یا میں دوں؟'

'شکریہ عبدالرحمن، پیسے ہیں میرے پاس ۔۔۔ اتفاق سے۔ اب گھر چل کر باپ کی

گھڑکیاں سنیں'۔ کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ایک رکشے والے کو آواز دی۔ رکشے پر بیٹھتے ہوے اس نے بڑے اداس اور مضمحل لہجے میں کہا۔ 'خدا حافظ، میں تو چلا دوست، پھر ملیں گے اگر خدا لایا'۔ وہ یہ بات شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ جو بات آج وہ عبدالرحمٰن سے کرنا چاہتا تھا نہیں کر سکا۔

'خدا حافظ'۔ عبدالرحمٰن نے جواب دیا اور پیدل ہی ایک طرف چل پڑا تا کہ کوئی سواری لے کر وہ بھی جتنی جلدی ممکن ہو سکے اپنے ہاسٹل پہنچ جائے۔ وہ ضرغام حیدر کے اداس چہرے اور اس کے عجیب لہجے پر حیران تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ اچانک اسے کیا ہو گیا ہے۔

تین

'کیا گجرات گجرات کیے جا رہے ہیں آپ لوگ! ارے وہاں بھوشیہ کے جہادیوں کو ہی تو سجا دی گئی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس میں کوئی برائی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وارتا میں ایک بار بھی گودھرا کا نام نہیں لیا آپ لوگوں نے، جہاں آت تائیوں نے ریل کا پورا ڈبہ پھونک کر ہمارے انیک دھرم بھیرو کارسیوکوں کو مار ڈالا۔ کیا ہندوؤں کی جان جان نہیں ہوتی۔ ان اتیاچاری ملیچھوں سے یدی اسی پرکار سہانو بھوتی پرکٹ کرنے کے لیے مجھے آمنترت کیا گیا ہے تو کرپیا مجھے شما کریں۔ میرے پاس ویرتھ گنوانے کا سے نہیں ہے'۔ پنڈت برہم دت چتر ویدی نے دوران بحث اپنی نشست سے کھڑے ہوتے ہوے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ وہ بولے۔ 'اتہاس ساکشی ہے کہ ان ملیچھ مسلمانوں نے ہماری پاون دھرتی کو اپوتر، ہمارے ویدک دھرم کو بھرشٹ اور ہماری اُدویتیہ سنسکرتی کو دوشت کیا ہے۔ اس لیے گجرات میں جو ہوا، اسے بھول جائیے اور وچار ہی کرنا ہے تو ان ہندوؤں پر کیجیے کہ ان آتنکیوں اور ویش دروہیوں سے مکتی پانے کے اس کے اترکت اور کون کون سے اُپائے ہو سکتے ہیں'۔

'پنڈت جی شانت ہو جائیے'۔ میزبان ٹھاکر رن ویر سنگھ کا لہجہ نرم تھا۔ لیکن یہ نرمی ان کے چہرے سے منعکس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بولے۔ 'اپنا آسن گرہن کیجیے پنڈت جی۔ ہم سبھی پکشوں پر وچار کریں گے اور آپ کو بھی اپنا پکش رکھنے کا پورن اوسر دیا جائے گا'۔

ٹھاکر رن ویر سنگھ کا شمار شہر کے ایسے معزز لوگوں میں ہوتا تھا، جن سے لوگ عام طور پر خائف رہا کرتے ہیں، لیکن جن کے شہر میں موجود ہونے سے اُس شہر میں رہنے والا ہر شخص اپنے آپ کو تمام

بیرونی خطرات سے محفوظ سمجھا کرتا ہے۔شرفا کا یہ نومہذب طبقہ ہندوستان کی آزادی کے بعد ملک کے طول وعرض میں بڑی تیزی سے پھلا پھولا تھا۔اور معاشرے نے ان کی تمام سماج مخالف سرگرمیوں کو نظر انداز کر کے ان کے وجود کو نہ صرف تسلیم کرلیا تھا بلکہ انھیں اپنے لیے باعث برکت تصور کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔شرافت اور رزالت کی نئی نئی تعریفیں وضع کی جانے لگی تھیں۔اب لوگوں کو ایسا لگنے لگا تھا جیسے ان کے بغیر وہ غیر محفوظ اور سیاسی طور پر مفلوج ہو جائیں گے۔آج ان کی دعوت پر شہر کے منتخب ہندو معززین حالات حاضرہ پر غور وفکر کے لیے ان کی کوٹھی پر جمع ہوئے تھے اور یہاں گجرات میں ہونے والے حالیہ فسادات پر گرما گرم بحث چل رہی تھی۔

ٹھاکر صاحب کی مداخلت کے بعد چترویدی جی کا اشتعال کچھ نرم پڑا۔اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ واقعی نرم پڑ گئے تھے بلکہ ٹھاکر رن ویر سنگھ کی پر جلال شخصیت ان پر اپنا اثر ڈال رہی تھی۔وہ جانتے تھے کہ وہ اس وقت ٹھاکر صاحب کے گھر پر ان کے ایک مہمان کی حیثیت سے موجود ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے مہمان ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹھاکر صاحب کی قوت برداشت کا امتحان لیں۔ٹھاکر صاحب اس علاقے کے بڑے رعب اور دبدبے والے شخص تھے۔ان کی مہربانیوں اور مظالم سے متعلق طرح طرح کے قصے قرب وجوار میں مشہور تھے۔سارے علاقے میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ان کی اجازت کے بغیر اس شہر میں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ان کے سامنے کوئی اونچی آواز میں بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ایسا کرنے والے کا کیا حشر ہوا کرتا ہے، یہ پنڈت جی بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔لیکن چونکہ وہ یہاں ایک اہم مسئلے پر مشورے کے لیے ہی آئے تھے، اس لیے اپنا نقطہ نظر سامنے رکھنے میں وہ پیچھے نہیں رہنا چاہتے تھے۔وہ بس اتنا بولے۔"ہاں میں بھی اس وشے پر اپنے کچھ وچار آپ سمست سدھی جنوں کی سمکش رکھنا چاہتا ہوں۔یدی مجھے بھی اس کا اوسر دیں گے تو آپ سب کی بڑی کرپا ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

گفتگو جاری رکھتے ہوئے دیر سے خاموش رام پرکاش شاستری نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔"ہمیں اس بات کو مان لینا چاہیے کہ گجرات میں جو ہوا وہ ٹھیک نہیں تھا۔اگر ہندو اس پرکار مسلمانوں کو سماپت کرنا چاہتے ہیں تو یہ ان کی بھول ہے۔آپ پندرہ کروڑ مسلمانوں کو نہ دیش چھوڑنے پر ووش کر سکتے ہیں، نہ انھیں موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔ابھی اودھک دن نہیں ہوئے، مٹھی بھر سکھوں کو ناراض کرنے کا

پریتام ہم بھگت چکے ہیں۔ مجھے بھے ہے کہ یدی بھارت کے دوسرے بھو سنکھیک مسلمانوں نے بھی وہی راستہ اپنالیا تو ہمارا پریہ دیش ہم میں سے کسی کے رہنے کے لیے سرکشت نہیں رہ جائے گا'۔

انھوں نے ایک گہری سانس لی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ 'گجرات میں جو نرسنگھار ہوا ہے، آپ سب جانتے ہیں کہ اس سے بھارت کی کیرتی کو دھبا لگا ہے۔ دیش میں بھی اور ودیش میں بھی'۔ انھوں نے اپنی کرسی پر کچھ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ 'اگر ہمیں مسلمانوں سے مکتی چاہیے تو اس کے لیے کوئی اور ہی اپائے سوچنا ہوگا۔ یہ طریقہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ میرا مت ہے کہ اسلام کی وچاردھارا میں دوسرے وچاروں کے لیے کوئی استھان نہیں ہے۔ اس لیے جو بھارت اور سنسار کے بھوشیہ کے لیے واستو میں چنتت ہیں انھیں چاہیے کہ وہ اس آدھار پر مسلمانوں کو اسلام سے ورت کرانے کا کام کریں۔ اس کے لیے ہمیں اپنی شکشا پدھتی میں سدھار کی آوشیکتا ہے۔ ہمیں پاٹھیہ کرم سے ان سب باتوں کو نکال دینا چاہیے جن سے مسلمانوں کے شاسن کال کا گورو ہیر یلکھت ہوتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ہندوؤں میں نئی چیتنا جاگرت کرنے کا کام بھی کرنا چاہیے۔ اس سے سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔ یہ کام ہو رہا ہے لیکن اس میں تیورتا لانے اور اس کا کرم شیٹر وسترت کرنے کی آوشیکتا ہے'۔

'نہیں بھائی نہیں۔ ہمیں مسلمانن سے مکتی کے نہیں، ان سے پریم پوروک ویوہار کا اُپائے سوچن چاھی'۔ اس علاقے کے بزرگ سیاست داں اور سابق ایم ایل اے رام شنکر یادو نے کہا، جنھوں نے ابھی کچھ دنوں پہلے ہی عملی سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کیا تھا۔ 'ھم کا ان کے آرتھک، شیکشک اور ساماجک پچھڑے پن کو دور کرے کا اپائے کرے کا چاھی۔ ان کے برن روجی رُج گار کے اوسر اپلبدھ کراوے کا چاھی۔ مسلمان اب بھارت کا ایتہاسک ستیہ اور ابھن انگ ھویں، ھمیں اس ستیہ کا سویکار کر لیوے کا چاھی۔ ھم پنچن کو لے بات کا سامنے رکھتے ھوے ھی کوئی وچار ویکت کرے کا چاھی'۔

'پھر آپ یہ بھی کہیں گے یادو جی، کہ ہم سب کو انھیں ہندوؤں کے سمان دیش بھگت اور سمان ناگرک مان لینا چاہیے'۔ پنڈت جی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ 'بلکہ یہ دیش ہی ان کے حوالے کر کے تمام ہندوؤں کو سنیاس لے لینے کا پرامرش دینا چاہیے۔ یہ اپنی بام پنتھی وچاردھارا اپنی تجھے راج

نیتی تک ہی سمت رکھیے۔ اور ہم نے تو سنا ہے کہ آپ راج نیتی سے سنیاس بھی لے چکے ہیں۔ تو اب تو کم سے کم ہندوہت کی بات کریے۔ ہم یہاں سماج واد کا پرچار کرنے کے لیے نہیں ہندوؤں کی اسمتا اور بھارت کے گورو کی رکشا کا اپائے کھوجنے کے لیے اکترت ہوئے ہیں۔ اب شانت رہیے اور شاستری جی کو اپنی بات پوری کرنے دیجیے۔ ہاں شاستری جی'۔

یادو جی یہ سب سن کر بھلا کیسے چپ رہ سکتے تھے۔ وہ بولے۔'پنڈت جی، بھارت کا سمبدھان ہندوؤں اور دوسرے دھرماولمبیوں کے تنی مسلمانن کابھی اس دیش کا سمان ناگرک مانت ہے ان کے بھی مولک ادھیکار وھی ہیں جو آپ کا پراپت ہیں۔ بھارت ماں رھے کے لیے انھیں آپ کے سارٹی پھیکٹ کی جرورت نا ھیں ہے پتہ نہیں آپ کس لوک ماں رھتے ھیں پنڈت جی، سوتنتر بھارت کے نواسی تو جان ھی نہیں پڑتے سچ جانو تو آپ کا سوتنترتا کا ارتھ ھی نا مالوم ہوئی'۔ یادو جی کا پارہ چڑھ گیا تھا۔'ھمرا سجھاو ھے کہ پنڈت جی کو ھی سب سے پھلے اپنے وچار ویکت کرنے دیا جائے، جس سے یا طے ھوئی جائے گا کہ ھم کن ہندوؤں پر چرچا کرنے والے ھیں اور کن ہندوؤں پر نہیں۔ یدی ایسا نہ ھوا تو ھمیں سک ہے کہ ھم آج کی ای بچار گوشٹھی سے کسی نشکرش پر پھنچ پاویں گے'۔

'میری آپ سب لوگوں سے کربدھ پرارتھنا ہے کہ ایک دوسرے کی بات کاٹ کر چرچا میں ویودھان اتپن نہ کریں۔ اس سے ہمیں کسی نشکرش تک پہنچنے میں سمسیا ہوگی'۔ ٹھاکر رن ویر سنگھ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ 'ایک بات صاف ہے کہ ہم یہاں نہ بھارت میں ہندوؤں کی پرستھتی پر چرچا کرنے جمع ہوئے ہیں، نہ دیش کے ہتوں پر وچار کرنے کے لیے۔ ہمارا ادیشیہ کیول اتنا ہے کہ ہم اپنے علاقے اور اپنے نگر میں، جہاں ہندو بھی رہتے ہیں اور مسلمان بھی، شانتی کیسے بنائے رکھیں اور اس کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے'۔ ٹھاکر صاحب کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔

'ہمارے علاقے میں مسلمانوں کی سنکھیا کچھ ادھک نہیں ہے۔ یہی کوئی آٹھ دس پرتی شت، وہ بھی چھ آٹھ گاؤں میں۔ ان میں سے ایک ہی گاؤں ایسا ہے جہاں کیول پٹھان مسلمان رہتے ہیں۔ حالانکہ وہاں کے مکھیا ہمدان علی خاں ہمارے متر ہیں، پر ہم آپ کو وشواس دلاتے ہیں کہ یدی آپ سب لوگ مل کر اسی نشکرش پر پہنچتے ہیں کہ یہاں سے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے تو یہ ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمیں گجرات جیسا ناٹک کرنے کی آوشیکتا نہیں پڑے گی۔ یہ کام تو ہم

اپنے آدمیوں سے اکیلے ہی ایک ہفتے کے اندر کروادیں گے۔ پرنتو ہم کو یہ سب ٹھیک نہیں لگتا۔ بھگوان ساکشی ہے کہ یہ لوگ کبھی ہمارے جتوں میں آڑے نہیں آئے۔ نہ ان سے کبھی ہمارا امن متاثر ہوا۔ ہاں موقع پڑنے پر خان صاحب جیسے مسلمانوں نے ہماری سہایتا اوشیہ کی ہے۔ پھر ان بچاروں نے ہمارا کیا بگاڑا ہے کہ ہم ان سے اور ان کے بال بچوں سے جیون کا ادھیکار چھین لیں'۔ یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے کی کرختگی کم نہیں ہوئی تھی۔ یہ اندازہ لگانا آسان نہیں تھا کہ ان کی اس نرم گوئی کے پس پشت ان کے دل میں کس طرح کی اتھل پتھل چل رہی ہے۔

'ٹھاکر صاحب'۔ پنڈت جی پھر جوش میں آتے ہوئے بولے۔ 'سچ پوچھو تو یہ سب اچھا تو ہم کو بھی نہیں لگتا۔ پرنتو آپ تو جانتے ہیں ہم ہندو تو رکشا کمیٹی کے آگیا کاری داس ہیں۔ اور کمیٹی کی آگیا ہے کہ مسلمانوں پر نہ ہی بھروسا کیا جائے اور نہ ان سے کسی پرکار کا دیاکا ویوہار کیا جائے۔ ارے بھائی بڑے بڑے دوردرشتا اور وچارک ہیں کمیٹی کے پاس۔ ان کا ایسا کہنا ہے تو اوشیہ اس میں کچھ سار ہوگا'۔

'تو پھر یا میٹنگ کا جرورتے کا ھے'۔ یادو جی پھر بھڑک گئے۔ 'جب سب کچھ سمیتی کی آگیا سے ہوئے گا تو پھر جاکے آگیاکا پالن کرو۔ ہمیں کاھے کشٹ دیتے ہیں۔ اور اگر واستو ماکچھ بچار بمرس کرے کا ھے تو سمیتی ومیتی کا بھول جاو پنڈت جی۔ سمیتی کی بھاشا سمیتی کی سبھاوں میں ھی شوبھا دیتی ھے۔ ئ نہیں کہ جہاں نہیں وھیں منھ بائے کے بکر بکر سُرو کر دیو'۔

آخر پروفیسر کے ڈی سنگھ نے اپنی طویل خاموشی توڑی اور بیچ میں دخل دیتے ہوئے بولے۔ 'اگر آپ لوگوں کا یہی رویہ رہا تو آج یہاں ہو چکی چرچا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں کوئی کسی دوسرے کی بات کا آدر نہیں کر رہا ہے۔ ہر ویکتی بس یہ چاہتا ہے کہ کیول اس کی بات سنی جائے اور مان لی جائے۔ ایسے وچار ورش کا کبھی کوئی پریام نہیں نکل سکتا'۔ انھوں نے تمام موجود لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، جیسے اس بات کا یقین کر لینا چاہتے ہوں کہ ان کی بات دھیان سے سنی جا رہی ہے۔ جب انھیں اطمینان ہو گیا تو آگے بولے 'پہلی بات تو ہمیں یہ یاد رکھنی چاہیے کہ آج ہمارے یہاں جمع ہونے کا اُدیشیہ کیا ہے۔ اور جیسا کہ رن ویر سنگھ جی بتا چکے ہیں کہ اپنے علاقے میں شانتی کیسے بنائے رکھ سکتے ہیں، اس پر وچار کرنے کے لیے ہم سب یہاں اکترت ہوئے ہیں۔ پھر یہ دیش، یہ ہندو مسلمان اور یہ دین دھرم کی باتیں ہم یہاں نہ ہی

کریں تو اچھا ہے۔ جن سمسیاؤں کو بڑے بڑے لوگ حل نہیں کر پائے انھیں یہاں بیٹھ کر دس لوگ حل کر لیں گے، ایسا سمجھنا ہی مورکھتا ہے۔ ہمیں کیول اس بات پر وچار کرنا چاہیے کہ ہم جہاں رہتے ہیں، وہاں اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے مسلمان کوئی سمسیا پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر واستو میں یہ کوئی سمسیا پیدا کر سکتے ہیں، جس کی سمبھاونا کم سے کم مجھے تو نہیں لگتی، تو اس سمسیا کا نراکرن کیسے سمبھو ہو گا۔ اور بس'۔

'پروفیسر صاحب ٹھیک کہتے ہیں'۔ دیر سے چپ بیٹھے نگر سیٹھ دیوان چند نے بھی اپنی زبان کھولی۔

'ارے کیا ٹھیک کہتے ہیں'۔ پنڈت جی جیسے ہار ماننے کو تیار ہی نہیں تھے۔' آخر گودھرا میں جو کچھ ہوا اُس کے پیچھے مسلمان ہی تو ہیں۔ یہ لوگ ایسا اُتپات یہاں بھی تو کر سکتے ہیں۔ اب دیکھو نا۔ نہ وہاں ٹرین پھونکی جاتی، نہ اتنے کارسیوک اپنی جان سے جاتے اور نہ گجرات میں اتنا بڑا کانڈ ہوتا۔ پھر بھلا ہم بنا مسلمانوں کے اُپدرو کی بات کیے کیسے اس سمسیا پر وچار کر سکتے ہیں'۔ پنڈت جی نے ایک اچٹتی ہوئی نظر تمام سامعین پر ڈالی۔' یہ مسلمان، جن کے دھرم گرنتھ ہی میں لکھا ہے کہ جب تک سب ہندو مسلمان نہ بن جائیں، ان کو مارتے کاٹتے رہو، کیسے ہمارے ساتھ امن چین سے رہ سکتے ہیں۔ انھیں جب جب اوسر ملے گا، یہ ہمارے لیے سمسیا کھڑی کرتے رہیں گے۔ اس کا سمادھان کیول یہی ہو سکتا ہے کہ ہم ان سے سدیو بھے بھیت رہتے ہوئے ان سے دب کر رہیں، تو اب ہندو اس کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔ ہمیں ان سے مکتی چاہیے اور اس کے لیے ہمیں ساہس کر کے ایک بار آر پار کی لڑائی لڑنی ہوگی۔ اب چاہے یہ بات کسی کو بھلی لگے یا بری'۔

'آنند نرائن جی، آپ بھی تو کچھ اپنے وچار ویکت کیجیے'۔ ٹھاکر رن ویر سنگھ نے انھیں خاموش بیٹھے دیکھ کر کہا۔

'مجھے تو لگ رہا ہے ٹھاکر صاحب، کہ میں یہاں پر بالکل اَن فِٹ ہوں'۔ آنند نرائن شری واستو نے، جو ہائی کورٹ کے وکیل تھے اور ٹھاکر صاحب کے مہمان کی حیثیت سے انھیں کے کسی کام سے الہ آباد سے یہاں آئے تھے، کہا۔' یہاں جو چرچا جس اور جا رہی ہے وہ میرے وچاروں سے میل نہیں کھاتی۔ اس لیے یہاں کچھ کہہ کر میں اپنی بے عزتی کرانا نہیں چاہتا'۔

'یہ آپ کے لیے اچھا ہی ہے شری واستو جی کہ آپ چپ بیٹھے رہیں'۔ پنڈت برہم دت چترویدی بولے۔' آپ تو ویسے ہی آدھے مسلمان ہیں'۔ انھوں نے باقی لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔' دیکھو نا، ان کی شیروانی اور پاجامہ، بس کیول ڈاڑھی کی کمی ہے'۔ پنڈت جی نے ان کا مذاق اڑاتے

ہوئے کہا۔

'پنڈت جی'۔ ٹھاکر رن ویر سنگھ گرجے۔ 'آپ کو دھیان رکھنا چاہیے کہ شری واستو جی ہمارے آدرنیا اتتھی ہیں'۔

'شما چاہتا ہوں ٹھاکر صاحب'۔ میں نے انھیں پہچانا نہیں، کبھی آپ کے یہاں دیکھا بھی نہیں، بھول ہوئی'۔ پنڈت جی کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولے۔

'نیتا جی'۔ دیوان چند نے یادو جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ 'مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہاں کوئی نشکرش پہلے ہی نکالا جا چکا ہے اور واستو میں اب ہمارے وچاروں کی کوئی سارتھکتا ہی نہیں رہ گئی ہے۔ چلو اٹھو چلیں، یہاں ہماری آوشیکتا نہیں ہے۔ یہ وچار گوشٹھی کیول ایک ناٹک ہے، جس میں ہم سے ابھینئے کرتے نہ بنے گا۔ چلیے، کیوں آپ اپنا اور ہمارا سمے نشٹ کر رہے ہیں'۔

'سیٹھ جی' یادو جی بولے۔ 'اِس سب گونوں ہوال کریھیں تو ھم دیاکھت ھی نا رھیں۔ ھم..........'

بات کاٹتے ہوئے ٹھاکر صاحب بولے۔ 'کیسی بات کرتے ہیں دیوان چند جی'۔ ان کے چہرے کی کرختگی پہلے سے کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی۔ 'ہم نے پہلے سے کوئی نشکرش نہیں نکالا ہوا ہے۔ آپ لوگ کرُدھ نہ ہوں۔ بیٹھیے، دھیرج رکھیے۔ ہمارے لیے آپ کے وچاروں کا گیان اتی آوشیک ہے'۔

'تو ہمارا سیدھا سیدھا مت یہ ہے کہ ہمارے نگر میں فضول لڑائی دنگا نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے دس بیس مسلمان مر جائیں گے جرور، پر ہمارا سب کام دھندھا چوپٹ ہو جائے گا'۔ دیوان چند جی جیسے بپھر پڑے۔ 'پھر سیدھی سچی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ پنڈت جی کو ہماری یہ بات بھلے ہی بری لگے۔ اور یہ بات تو ان کی سمجھ ہی میں نہیں آئے گی کی وہ ہمارے گاہک ہیں اور ہم گاہک کو بھگوان کی طرح آدر دیتے ہیں'۔

پروفیسر سنگھ نے سیٹھ دیوان چند کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ 'ہم نے بھی اتہاس کی شکشا پائی ہے ٹھاکر صاحب۔ پہلے تو اتہاس میں ایسا کچھ غلط ہوا نہیں ہے، جس کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ مسلمان راجاؤں نے بھی وہی سب اچھا برا کیا ہے جو یہاں کے پوروورتی ہندو راجا کرتے چلے آ رہے تھے۔ بابر کا نام آج کل گالی کی طرح لیا جاتا ہے۔ پرنتو یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ اس نے کسی ہندو راجا کو نہیں، ایک مسلمان ابراہیم

لودی کو ہرا کر بھارت پر ادھیکار کیا تھا۔ اور یدی کبھی ایسا ہوا بھی ہو، جیسا پنڈت جی کا کہنا ہے تو پوروجوں کی غلطیوں کا ڈنڈ آج کے مسلمانوں کو دینا نیائے سنگت نہیں ہے۔ جنھوں نے کوئی پاپ ہی نہیں کیا ہے اور ہمارے ساتھ ہم لوگوں ہی کی طرح مل جل کر رہتے ہیں، انھیں سزا دینے کا کیا اوچتیہ ہے'۔

'پروفیسر صاحب اور دیوان جی ٹھیک کہتے ہیں'۔ یادو جی بھی ان کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے بولے 'ہمارا مت بھی یہی ہو کہ مسلمانن سے پریم بیوہار بنائے رکھے کا چاہی۔ اس سے دیش کو بھی سکتی ملی اور سب جگہ امن چین بھی رہی'۔

'پرنتو ہم یہ بات نہیں مانتے'۔ پنڈت جی پھر اُکھڑ گئے۔ 'ہم اب بھی اپنا مت بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارا وشواس ہے کہ 'ساری دھرتی ہمارا پریوار ہے' کی سرو دھرم سمبھاؤ والی ہندو وچار دھارا اور 'ساری دھرتی ہماری ہے' جیسی تچھ مسلم وچار دھارا کے بیچ کسی طرح کا سمجھوتا ہونا سمبھو ہی نہیں ہے۔ ہمارا مت یہ ہے کہ جتنا بلیدان آوشیک ہو، دے کر ایک بار مسلمانوں کو ٹھکانے لگا دیا جائے، تو دیش کو شکتی اور شانتی پراپت کرنے میں ادھک سے نہیں لگے گا۔ اور اس پرکار پراپت کی ہوئی یہ شانتی استھائی ہوگی۔ آخر اشانتی کا سب سے بڑا کارن مسلمان جہادی ہی تو ہیں'۔ اس کے بعد وہ گردن جھکا کر خود کلامی کے انداز میں بدبدائے۔ 'سارے سنسار میں آفت مچا رکھی ہے ان حرام کے جنوں نے'۔

اس بات چیت کو دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ سب اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس گفتگو سے اتفاق رائے کا کوئی نکتہ نکلتا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ ہر شخص دوسرے سے اپنی بات منوا لینے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور جیسے یہ طے کر کے بیٹھا تھا کہ اسے دوسرے کی بات نہیں ماننی ہے۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ اسی وقت اندر سے ایک ملازم نے آ کر ٹھاکر صاحب کو اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے اور ٹھاکر صاحب نے بھی مہمانوں کو کھانے کے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ بات چیت جہاں تھی وہیں رک گئی۔ اب سب کھانے کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ سب کے چہروں پر ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ شاید ہر ایک کو یہی لگ رہا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد ہونے والا وہی ہے جو ٹھاکر رن ویر سنگھ کی مرضی ہوگی۔

اور ٹھاکر صاحب نے اس نشست میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہی نہیں تھا۔

چار

'شاید ارتھی ہوں مہاتو بھاؤ، پرنتو لکھنو میں ہمیں سپھلتا نہیں مل پائی، اس کے وپریت کان پور میں ہم شت پرتی شت سپھل رہے'۔ لکھنو کے ایک ماہر نشانہ باز جوگیندر سنگھ عرف جوگا ماسٹر نے کچھ شرمندگی کے ساتھ منتری جی کو رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔ 'وہاں دنگا آرمبھ ہو چکا ہے اور اب تک اٹھارہ مسلمان موت کے گھاٹ اُتارے جا چکے ہیں اور پچاس ساٹھ کے قریب گھایل ہو کر اسپتال میں پڑے ہیں'۔ اس نے جیسے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور بولا۔ 'اور اپنوں میں سے ابھی تک کسی کے مرنے کا سماچار نہیں ملا ہے'۔

'بکواس بند کرو جوگا'۔ منتری جی اس سے کافی ناراض نظر آ رہے تھے۔ 'ہم پہلے لکھنو میں تمھاری سورکھتا کا ورن سننا چاہتے ہیں'۔

یہ بات چیت گومتی نگر کی ایک زیر تعمیر عمارت کے خفیہ تہ خانے میں ہو رہی تھی۔ اس عمارت کو غالباً شعوری طور پر نامکمل رکھا گیا تھا، تاکہ عام لوگ اس ویرانے کی طرف زیادہ توجہ نہ کریں۔ لیکن اس کے تہ خانے کی تعمیر نہ صرف مکمل تھی بلکہ اسے آرائش کے جدید تر سامانوں سے آراستہ بھی کیا گیا تھا۔ منتری جی کا تعلق اتر پردیش کی وزارت سے نہیں تھا۔ یہاں وہ سرکاری مہمان تھے۔ بظاہر وہ اس وقت گورنر ہاؤس کے مہمان خانے میں آرام کر رہے تھے۔ وہ یہاں پوشیدہ اور خفیہ طور پر آئے تھے۔ اور اس تہ خانے کو مرکز بنا کر وہ اپنے منصوبوں پر عمل پیرا تھے۔

جوگیندر سنگھ، جس کی عمر اب پچاس کے اوپر پہنچ چکی تھی، لکھنو کا مشہور غنڈا رہ چکا تھا۔ وہ ایک ماہر نشانے باز تھا اور لوگوں کو قتل کرنے کا اسے طویل تجربہ تھا۔ منتری جی کو یہ نام ان کے صوبے ہی میں ان کے وفادار جاں نثاروں نے فراہم کیا تھا۔ ان کے مطابق جوگا ماسٹر نہ صرف یہ کہ ان کے کام کا آدمی تھا بلکہ وہ ہندوتو رکشا سمیتی کی سرگرمیوں کا دیرینہ حامی اور مداح بھی تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب سمیتی نے اپنے کسی کام کے لیے جوگا ماسٹر کی مدد لی ہو۔ اس ادھیڑ عمر میں وہ سماج میں ایک ایسے انسان کی حیثیت سے عزت کی زندگی گذار رہا تھا، جس نے گناہ آلود زندگی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر کے شرافت کی زندگی جینے کا عہد لیا تھا۔ ظاہری طور پر وہ محلے پڑوس یا شہر کے کسی بھی شخص کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ بڑے بڑے سیاسی لوگوں سے اس کے روابط تھے، جو کسی نہ کسی طور جوگیندر سنگھ کے طفیل محلے والوں کی فلاح کے لیے کام آ رہے تھے۔ غلط کاموں سے اس نے

لودی کو ہرا کر بھارت پر ادھیکار کیا تھا۔ اور یدی کبھی ایسا ہوا بھی ہو، جیسا پنڈت جی کا کہنا ہے، تو پوروجوں کی غلطیوں کا دنڈ آج کے مسلمانوں کو دینا نیائے سنگت نہیں ہے۔ جنھوں نے کوئی پاپ ہی نہیں کیا ہے اور ہمارے ساتھ ہم لوگوں ہی کی طرح مل جل کر رہتے ہیں، انھیں سزا دینے کا کیا اوچتیہ ہے۔'

'پروفیسر صاحب اور دیوان جی ٹھیک کہتے ہیں'۔ یادو جی بھی ان کی آواز ملاتے ہوئے بولے۔ 'ہمارا مت بھی یہی ہو کہ مسلمانن سے پریم بیوہار بنائے رکھے کا چاہی۔ اس سے دیش کو بھی سکتی ملی اور سب جگہ امن چین بھی رہی'۔

'پرنتو ہم یہ بات نہیں مانتے'۔ پنڈت جی پھر اُکھڑ گئے۔ 'ہم اب بھی اپنا مت بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارا وشواس ہے کہ 'ساری دھرتی ہمارا پریوار ہے' کی سرودھرم سمبھاؤ والی ہندو وچار دھارا اور 'ساری دھرتی ہماری ہے' جیسی تچھ مسلم وچاردھارا کے بیچ کسی طرح کا سمجھوتا ہونا سمبھو ہی نہیں ہے۔ ہمارا مت یہ ہے کہ جتنا بلیدان آوشیک ہو، دے کر ایک بار مسلمانوں کو ٹھکانے لگا دیا جائے، تو دیش کو شکتی اور شانتی پراپت کرنے میں ادھک سے نہیں لگے گا۔ اور اس پرکار پراپت کی ہوئی یہ شانتی استھائی ہوگی۔ آخر اشانتی کا سب سے بڑا کارن مسلمان جہادی ہی تو ہیں'۔ اس کے بعد وہ گردن جھکا کر خودکلامی کے انداز میں بدبدائے۔ 'سارے سنسار میں آفت مچا رکھی ہے ان حرام کے جنوں نے'۔

اس بات چیت کو دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ سب اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس گفتگو سے اتفاق رائے کا کوئی نکتہ نکلتا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ ہر شخص دوسرے سے اپنی بات منوا لینے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور جیسے یہ طے کر کے بیٹھا تھا کہ اسے دوسرے کی بات نہیں ماننی ہے۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ اسی وقت اندر سے ایک ملازم نے آ کر ٹھاکر صاحب کو اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے اور ٹھاکر صاحب نے سبھی مہمانوں کو کھانے کے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ بات چیت جہاں تھی وہیں رک گئی۔ اب سب کھانے کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ سب کے چہروں پر ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ شاید ہر ایک کو یہی لگ رہا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد ہونے والا وہی ہے جو ٹھاکر رن ویر سنگھ کی مرضی ہوگی۔

اور ٹھاکر صاحب نے اس نشست میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہی نہیں تھا۔

چار

'مثما پرارتھی ہوں مہانو بھاؤ، پرنتو لکھنؤ میں ہمیں سپھلتا نہیں مل پائی، اس کے وپریت کان پور میں ہم شت پرتی شت سپھل رہے۔' لکھنؤ کے ایک ماہر نشانہ باز جوگیندر سنگھ عرف جوگا ماسٹر نے کچھ شرمندگی کے ساتھ منتری جی کو رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔' وہاں دنگا آرمبھ ہو چکا ہے اور اب تک اٹھارہ مسلمان موت کے گھاٹ اُتارے جا چکے ہیں اور پچاس ساٹھ کے قریب گھایل ہو کر اسپتال میں پڑے ہیں۔' اس نے جیسے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور بولا۔' اور اپنوں میں سے ابھی تک کسی کے مرنے کا سماچار نہیں ملا ہے۔'

' بکواس بند کرو جوگا' ۔ منتری جی اس سے کافی ناراض نظر آ رہے تھے۔' ہم پہلے لکھنؤ میں تمھاری سورکھتا کا ورن سننا چاہتے ہیں۔'

یہ بات چیت گومتی نگر کی ایک زیرِ تعمیر عمارت کے خفیہ تہ خانے میں ہو رہی تھی۔ اس عمارت کو غالباً شعوری طور پر نامکمل رکھا گیا تھا، تاکہ عام لوگ اس ویرانے کی طرف زیادہ توجہ نہ کریں۔ لیکن اس کے تہ خانے کی تعمیر نہ صرف مکمل تھی بلکہ اسے آرائش کے جدید تر سامانوں سے آراستہ بھی کیا گیا تھا۔ منتری جی کا تعلق اتر پردیش کی وزارت سے نہیں تھا۔ یہاں وہ سرکاری مہمان تھے۔ بظاہر وہ اس وقت گورنر ہاؤس کے مہمان خانے میں آرام کر رہے تھے۔ وہ یہاں پوشیدہ اور خفیہ طور پر آئے تھے۔ اور اس تہ خانے کو مرکز بنا کر وہ اپنے منصوبوں پر عمل پیرا تھے۔

جوگیندر سنگھ، جس کی عمر اب پچاس کے اوپر پہنچ چکی تھی، لکھنؤ کا مشہور غنڈا رہ چکا تھا۔ وہ ایک ماہر نشانے باز تھا اور لوگوں کو قتل کرنے کا اسے طویل تجربہ تھا۔ منتری جی کو یہ نام ان کے صوبے ہی میں ان کے وفادار جاں نثاروں نے فراہم کیا تھا۔ ان کے مطابق جوگا ماسٹر نہ صرف یہ کہ ان کے کام کا آدمی تھا بلکہ وہ ہندتو رکشا سمیتی کی سرگرمیوں کا دیرینہ حامی اور مداح بھی تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب سمیتی نے اپنے کسی کام کے لیے جوگا ماسٹر کی مدد لی ہو۔ اس ادھیڑ عمر میں وہ سماج میں ایک ایسے انسان کی حیثیت سے عزت کی زندگی گذار رہا تھا، جس نے گناہ آلود زندگی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر کے شرافت کی زندگی جینے کا عہد لیا تھا۔ ظاہری طور پر وہ محلے پڑوس یا شہر کے کسی بھی شخص کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ بڑے بڑے سیاسی لوگوں سے اس کے روابط تھے، جو کسی نہ کسی طور جوگیندر سنگھ کے طفیل محلے والوں کی فلاح کے لیے کام آ رہے تھے۔ غلط کاموں سے اس نے

صدق دل سے توبہ کی تھی، لیکن آج کا کام غیر معمولی تھا۔ اسے یقین تھا کہ دھرم اس کے ساتھ ہے اور اگر وہ کامیاب ہو گیا تو یہ ایک پنیہ کا کام ہوگا۔ لیکن آج اسے ناکامی کی شرمندگی سے دو چار ہونا پڑا تھا۔ وہ سر بزدہ اور مغموم تھا کیونکہ ایک معزز مہمان کے سامنے اسے ذلت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار اپنے فرض کی ادائیگی میں لاپرواہی اور غیر ذمے داری کا ملزم ٹھہرایا جا رہا تھا۔

'شما کریں منتری جی'۔ اس نے گردن جھکائے ہوئے کہا۔ 'میں نے آپ کے آدیشانو سار ہی سارے پربندھ کیے تھے۔ یوجنا ساری آپ کی تھی۔ سے آپ کا چنا ہوا تھا۔ کام کرنے کی شیلی بھی آپ ہی کی تھی۔ میرا کام تو بس اتنا تھا کہ میں نیلے والی مسجد میں جمعہ کی نماز کے سے بم پھینکنے کے لیے ایک مسلمان یوک کا پربندھ کر دوں۔ اور میں نے یہ کام آپ کی اچھانوسار کیا۔ لیکن بھاگیہ شاید ہمارے ساتھ نہیں تھا منتری جی۔ کام کرنے کے پہلے ہی پولیس نے اُسے دھر دبوچا'۔

'کیا وہ اناڑی تھا'۔ منتری جی نے پوچھا۔

'ہاں'۔ جوگیندر بولا۔ 'اصل بات یہ ہے منتری جی کہ سے بہت کم تھا۔ اتنی جلدی کسی ایسے ماہر مسلمان یوک کی کھوج آسان کام نہیں تھا، جس کا پولیس کے پاس کوئی رکارڈ نہ ہو۔ اچھا تو یہ ہوتا کہ ایسا آدمی دور دراز کے کسی علاقے سے بلایا جاتا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ سمبھو نہیں تھا۔ یہ لڑکا بھی بڑی مشکل سے ہاتھ لگا تھا۔ پورے پانچ لاکھ روپے خرچ کرنے پڑے اسے تیار کرنے میں'۔

'چپ رہو۔ ہمارے سامنے ایسے بے ڈھنگے پن کی باتیں نہ کرو۔ جیسے اپنی زندگی میں تم نے کبھی پیسے دیکھے ہی نہیں ہیں۔ پیسہ کہاں خرچ ہوگا اور کتنا خرچ ہوگا، یہ تمھارے سوچنے کی بات تھی۔ ہم نے اس کے لیے تمھیں پوری سوتنترتا دے رکھی تھی۔ یہ سب کچھ طے کرنا تمھارا کام تھا۔ ہمیں تو اپنا کام ہونے سے مطلب تھا۔ اور دکھائی دے رہا ہے کہ وہ ہوا نہیں'۔ منتری جی ہال میں بڑی بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی گہری فکر میں ہوں۔ ممکن ہے انھیں اپنی اس ناکامی کے لیے کسی اور کو بھی صفائی دینی رہی ہو۔ 'اب کہاں ہے وہ سالا کتّا'۔ انھوں نے بڑی حقارت سے پوچھا۔

'حضرت گنج تھانے میں'۔

'زبان کھولی یا نہیں'۔

'ابھی تک تو نہیں'۔ جوگا نے کچھ خوش ہوتے ہوئے کہا۔ 'اور اگر وہ کچھ کہے گا بھی تو وہ جانتا ہی

کیا ہے۔سوائے میرے کسی پر آنچ آنے والی نہیں ہے۔اس کے لیے مجھے کیا کرتا ہے،یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔

'نہیں،ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ وہ تمھارے لیے ہانی کر بنے'۔منتری جی بولے۔'ہم کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔تم کچھ دنوں کے لیے انڈر گراؤنڈ ہو جاؤ،کہیں لکھنو سے باہر چلے جاؤ۔یہاں سے اب تمھیں گھر جانے کی آوشیکتا نہیں ہے۔۔۔سالا سب گڑ گوبر ہو گیا۔بڑی تعریف سنی تھی ہم نے تمھاری۔۔جوگا ماسٹر کی۔کتنی مشکل سے لکھنو میں آتنک کا ماحول بنایا گیا تھا۔ہمارے کاریہ کرتاؤں کی ساری محنت پر پانی پھر گیا۔

'منتری جی مجھے ایک اوسر اور دیجیے،کیول چوبیس گھنٹے'۔جوگیندر سنگھ نے شرمندہ ہوتے ہوئے ایک کوشش اور کی۔'اب کی بار شکایت کا موقع نہ دوں گا'۔

'نہیں۔بس بہت ہو گیا۔اب کم سے کم تم مورکھتا کی تو کوئی بات نہ کرو۔تم آج کے بعد سے کم سے کم دو مہینے تک لکھنو میں کسی کو دکھائی نہیں پڑو گے'۔منتری جی بولے۔'اب جو کچھ کرنا ہے،وہ ہمیں خود ہی کرنا ہوگا۔اور سب سے پہلے تو اس سالے کتّوے کا انتظام کرنا ہے'۔

'اور وہ کان پور والی بات......'

وہ ہمیں سب پتہ ہے۔اب تم جا سکتے ہو'۔منتری جی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔غصے سے ان کا چہرہ سرخ تھا۔'اے فوجی،ادھر آ'۔انھوں نے اپنے باڈی گارڈ سے کہا،جو کچھ فاصلے پر دروازے کے پاس مستعد کھڑا تھا،تا کہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی بات چیت نہ سن سکے۔'جوگا جی کو باہر کا راستہ دکھاؤ'۔

پانچ

نواب سید علی حسن بدخشانی کے دولت کدے پر سالانہ مجلس اپنے عروج پر تھی۔اس موقعے پر وہ ہمیشہ اپنے یہاں حیدر آباد کے مشہور زمانہ ذاکر مولانا سید اطہر علی دائمی کو بلایا کرتے تھے۔جب سے بیرون ملک رہنے والے ہندوستانی اور پاکستانی شیعان حسین میں اپنے اپنے ملکوں سے ذاکروں کو بلا

کر مجالس منعقد کرانے کا مقابلہ شروع ہوا تھا، ذاکروں کی اہمیت یکا یک بڑھ گئی تھی۔ اب یہاں کے ذاکرین اہل بیت یہ تک بھول گئے تھے کہ مقدس ماہ محرم الحرام میں حضرت امام حسین بہ نفس نفیس ہندوستان آیا کرتے ہیں اور ایسے میں کسی مداح حسین کا ہندوستان سے باہر جانا مناسب نہیں ہے۔ اب سے قبل یہاں کے ذاکرین سامعین مجلس کو یہ بات یاد دلانا کبھی نہیں بھولا کرتے تھے۔ لیکن اب عیش و آرام کی خواہش نے یہ نکتہ ان کے ذہن سے بالکل محو کر دیا تھا۔ مولانا داعی کی طلب کا تناسب بھی اس درمیان بڑی تیزی سے بڑھا تھا۔ ابھی چار پانچ سال قبل وہ معمولی کرائے اور ایک ہزار کے معاوضے پر آجایا کرتے تھے۔ شاید اس وقت ذکر حسین ان کے لیے آمدنی کا ذریعہ نہیں ایک مذہبی فریضہ تھا۔ لیکن اب ان کا معاوضہ ہندوستان کے صف اول کے ذاکروں سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ وہ آمد و رفت کے لیے ہوائی جہاز یا ریل کے اے سی فرسٹ کلاس کی سہولت اور نذرانے کے طور پر پچیس ہزار روپے نقد طلب کرنے لگے تھے۔ لیکن نواب علی حسن کے لیے پیسہ کوئی مسئلہ نہ تھا۔ پھر یہ تو دین کا کام تھا۔ وہ تو دنیاوی اور نمائشی کاموں تک میں اس سے کہیں زیادہ رقم چٹکیوں میں صرف کر دیا کرتے تھے۔ خدا نے انھیں دنیا کی ہر نعمت سے نوازا تھا۔ ان کی دو بیویاں تھیں، ایک منکوحہ اور ایک ممتوعہ۔ ایک اولاد تھی جو ممتوعہ چھوٹی بیگم کے بطن سے تھی، بزرگوں کی چھوڑی ہوئی بے حساب دولت تھی، جو ان کے اور ان کے بعد آنے والی چار چھ پشتوں کے لیے کافی تھی۔ دین دار آدمی تھے۔ انھیں لوگوں کے دکھ درد کا بھی احساس رہتا تھا اور حتی الوسع ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہتے تھے۔ لکھنو کے دوسرے امرا کے برخلاف وہ روزہ نماز کی پابندی بھی کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک خصوصیت ایسی بھی تھی جو دوسرے شیعوں میں بالعموم نہیں ہوتی، وہ سنیوں کو شیعوں سے علاحدہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کی نظر میں دونوں عقائد کے معمولی اختلاف کے ساتھ مسلمان تھے۔ اعزہ و اقارب کی شدید مخالفت کے باوجود وہ عیدین کی نماز پورے اہتمام کے ساتھ سنیوں کی عیدگاہ میں ادا کیا کرتے تھے۔

سید حسن جواد سلیم نواب بدخشانی کے مصاحبوں میں سے تھے۔ ان کے یہاں منعقد ہونے والی تقاریب میں شمولیت کا فیصلہ ان کی اپنی صوابدید پر منحصر نہ تھا، بلکہ ایک طرح سے یہ ان کے فرائض منصبی کا حصہ تھا۔ حالانکہ وہ نواب صاحب کے باقاعدہ ملازموں میں شامل نہ تھے لیکن ان کی کس مپرسی کے طویل دور میں نواب صاحب ہی تھے جو اکثر ان کے کام آیا کرتے تھے۔ وہ ان کی شاعری خصوصاً

رثائی شاعری کے مداح بھی تھے اور حسن جواد سلیم ان کی اس مداحی کو خدا کی نعمت اور اس کے بے پایاں الطاف و اکرام پر محمول کرتے تھے۔ اتنا مقتدر رئیس اور معزز شخص انھیں بالاعلان اپنا دوست کہتا تھا۔ یہ ان جیسے انسان کے لیے معمولی بات نہ تھی۔ آج بھی وہ ہمیشہ کی طرح اس مجلس میں شریک تھے۔ سوز خوانی کے بعد حضرت علی اکبر کی شہادت کا بیان ہوا جس میں مولانا اطہر علی دائی کو خصوصی مہارت حاصل تھی۔ آج وہ اس واقعے کا بیان ہمیشہ سے کچھ زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کر رہے تھے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، گیسو کی لٹیں چہرے پر آ گئی تھیں۔ جوش گریہ میں ان کا گریبان تک تر ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ سارے مومنین کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بین اور ماتم کی کبھی مبہم اور کبھی واضح صدائیں فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ کچھ لوگوں کے ہاتھ ان کے سینوں پر متحرک تھے اور دل حضرت علی اکبر کی محبت سے سرشار۔ سید حسن جواد کی آنکھوں سے بھی زار و قطار آنسو جاری تھے۔ جیسے آج اپنے آنسوؤں پر ان کا کچھ قابو ہی نہ رہ گیا تھا۔ بس بے اختیار بہے جا رہے تھے۔ یہ آنسو محض اس مجلس عزا کا نتیجہ نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ شاید ان کا دکھ کچھ اور بھی تھا۔

دراصل آج صبح ان کے چھوٹے بیٹے ضرغام حیدر نے زندگی میں پہلی بار ان سے ذلت آمیز لہجے میں بات کی تھی، جو حقیقتاً ان کے صبر و ضبط کی آزمائش ثابت ہوئی۔ اس بدکلامی کی وجہ بڑی معمولی تھی۔ انھوں نے صرف اسے متنبہ کیا تھا کہ ہمیں سنیوں سے دوستی کا رشتہ استوار کرنے میں شرعی حدود کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ انھوں نے اس سے کہا تھا کہ ان کے اپنے تجربے کے مطابق کوئی سنی کبھی کسی شیعہ کا مخلص نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اسے شائستگی کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اپنے دوست عبدالرحمٰن انصاری سے کنارہ کشی اختیار کر لے یا کم از کم اسے اپنے گھر لانا اور گھر کے دوسرے افراد سے ملوانا ترک کر دے۔ بس اتنی سی بات سن کر وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ اس نے انھیں، اپنے باپ کو، فخر شہر سید حسن جواد سلیم لکھنوی کو نہایت ترش لہجے میں جواب دیا تھا کہ اپنی خوابیدہ آنکھیں کھول کر دیکھو، زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ اب ہمیں شیعہ اور سنی کے درمیان نفاق پیدا کرنے والی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی بات سن کر ان کا بھی غصہ بے لگام ہو گیا تھا اور انھوں نے بے ساختہ و بے ارادہ اس کے گال پر طمانچہ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ ایسا انھوں نے پہلی بار نہیں کیا تھا۔ اس سے پہلے کئی بار وہ اپنے نوجوان بیٹے پر ہاتھ اٹھا چکے تھے، جسے ہر بار ان کے سعادت مند بیٹے نے باپ کے حق کی طرح

تسلیم کیا تھا۔ لیکن آج ان کی اسی اولاد نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے ان کی کمزور کلائی پکڑلی تھی اور آنکھیں تریرتے ہوئے تلخ و تند لہجے میں کہا تھا کہ وہ آئندہ اپنے ان سال خوردہ اور آزمودہ کار ہاتھوں کا کوئی اور مصرف تلاش کریں اور اس خاکسار کو اپنے دست شفقت سے نوازنا ترک کردیں۔

مولانا کی تقریر کی تاثیر میں ان کا یہ ذاتی غم بھی شامل ہو گیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ ان کے چہرے پر آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوتا تھا۔ ان کے اردگرد بیٹھے لوگ بھی ان کی اس آہ وزاری پر حیران تھے۔ انھیں بھی محسوس ہورہا تھا کہ آج ان کا رونا محض غم علی اکبر کا عکاس نہیں ہے۔ ایسے میں قریب بیٹھے ان کے دوست اور پڑوسی حیدر عباس نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا تو جیسے ان کے ضبط کا بندھ ہی ٹوٹ گیا۔ وہ اور بلند آواز سے رونے لگے۔ ذکر شہادت سے معمور مجلس کے دوران رونا کوئی حیران کن بات نہیں تھی اس لیے انھیں کسی طرح کی شرمندگی یا سبکی کا احساس نہیں ہوا لیکن حیدر عباس ان کے دل کی کیفیات کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔ انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ شاید آج بھی باپ بیٹے کے درمیان کچھ کہا سنی ہو گئی ہے۔ انھوں نے مختصر الفاظ میں ان کو تسلی تشفی دی اور حضرت امام کا حوالہ دے کر صبر کی تلقین کی۔ وہ چپ تو ہو گئے لیکن ان کی گھٹی گھٹی سی ہچکیاں اب بھی جاری تھیں۔

مولانا دائمی کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی تقریر اب اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی۔ ذکر شہادت کے بعد اب وہ حالات حاضرہ پر تبصرہ اور کچھ نصیحتیں فرما رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم شیعان اہل بیت کو وقت کی نزاکت کو سمجھنا چاہیے۔ آج ساری دنیا میں مسلم دشمنی کی ایک لہر سی چل پڑی ہے۔ مسلمانوں کے لیے منفی صفات کا استعمال ایک فیشن بن گیا ہے۔ ہمارے لیے اس نامراد صورت حال سے نبرد آزمائی وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ ہم اہل بیت کے حقیقی وارث ہیں تو ہمیں وقت کا نباض بھی ہونا چاہیے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہمیں خارجی خطرات کا سامنا ہے۔ دشمن ہمیں نیست و نابود کردینے کے درپے ہیں۔ ایسے وقت میں باہمی نفاق اور عداوت کی نہیں، اتحاد و یگانگت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے مخلصین کے حلقے میں دین دار، متقی اور باعمل سنی حضرات کو بھی شامل کریں۔ ان سے محبت کا سلوک کریں، انھیں اپنے گھروں میں عزت دیں اور ان کے گھروں میں جائیں۔ تاکہ ہمارا یہ اتحاد مخالفین اسلام کو ہمارے نفاق سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دے۔ خود ہمارے ملک میں بھی ایسی قوتیں سر اٹھا رہی ہیں، جو واضح طور پر ہمیں غدار اور وطن دشمن قرار دیتی

ہیں۔ یہ بہتان ہے لیکن ان کی زبان روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ کھلے بندوں مسلمانوں کو اس ملک کو چھوڑ دینے کا مشورہ دینے کی جرات کر رہے ہیں اور ہمارا سیاسی نظام انھیں ان کے اس غیر قانونی عمل سے باز رکھنے سے قاصر دکھائی دے رہا ہے۔ وہ ہماری کمزوری کا ہی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ اس اہم موقعے پر میری تمام مومنین و مومنات سے پر خلوص گزارش ہے کہ وہ میری اس بات پر پیچ و تاب نہ کھائیں، جیسا کہ میں کچھ چہروں پر دیکھ رہا ہوں۔ بلکہ میری بات پر سنجیدگی سے غور کریں اور جتنی جلد ممکن ہو سکے، اس پر عامل ہوں۔ انشاء اللہ ہمارا یہ عمل دنیا و آخرت دونوں میں ہماری سرخروئی کا باعث ہوگا۔

ایک طرف مولانا دائی کی پاٹ دار آواز محل سرا کے مشرقی حصے پر واقع عزا خانہ زہرا کے در و بام میں ہلچل پیدا کر رہی تھی اور دوسری طرف سید حسن جواد سلیم یہ باتیں سن کر اپنی آہ و زاری بھول گئے تھے۔ مولانا کے منھ سے مردود سنیوں کے حق میں اتنے باعزت کلمات سن کر حیرت سے ان کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ انھیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ابھی ابھی انھوں نے جو کچھ سنا ہے وہ قابل صد احترام مولانا سید اطہر علی دائی قبلہ کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ تھے۔ وہ ہکا بکا سے کبھی ادھر ادھر دیکھ رہے تھے اور کبھی مولانا کے چہرے کی طرف۔ لیکن یہ خواب نہیں تھا حقیقت تھی۔ یہ کلمات امن و آشتی حضرت مولانا کے دہن مبارک ہی سے نکل رہے تھے۔ ان پر عجیب کیفیت طاری تھی اور اپنی اس حیرانی میں وہ تنہا ہوں ایسا بھی نہیں تھا۔ ہال میں موجود تقریباً سبھی لوگوں کا ایک ہی جیسا حال تھا۔ ان میں سے بیشتر کے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ مولانا کا یہ مشورہ انھیں پسند نہیں آیا۔ دشمنان اہل بیت سے وہ بھلا رشتہ رفاقت کیسے استوار کر سکتے تھے۔ اور اگر وہ ایسا کریں تو ابھی تک انھیں جو سکھایا گیا تھا اس کی حقیقت کیا تھی۔ وہ خود کو کسی نتیجے تک پہنچنے کا اہل نہیں پا رہے تھے۔ سید حسن جواد بھی دوسروں کی طرح گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن وہ کچھ اور بھی سوچ رہے تھے۔ وہ ایسے تذبذب کے عالم میں تھے کہ مجلس کے ختم ہونے کے بعد بے خیالی میں اپنے معمول کے خلاف اپنے مربی نواب بدخشانی سے ملاقات کیے بغیر ہی باہر نکل آئے اور اپنے گھر کی جانب چل پڑے۔

ان کے دل و دماغ میں بس ایک ہی بات گھوم رہی تھی۔ کیا زمانہ واقعی بدل گیا ہے؟ کیا ضرغام حیدر کی بات ہی سچ اور لائق عمل ہے؟

چھا

اس بات کا اندازہ لگانا ذرا دشوار تھا کہ یہ خطہ ہندوستان کے کس حصے میں واقع ہوگا۔ گرمی کے موسم میں قدرے نرمی سے لگ رہا تھا کہ اسے وسطی یا جنوبی ہند میں کہیں ہونا چاہیے۔ فضا میں رچا بسا حبس یہ اشارہ دے رہا تھا کہ یہاں سے سمندر کا فاصلہ زیادہ نہیں ہوگا۔ جو کچھ دکھائی دے رہا تھا وہ یہ تھا کہ جگہ سنسان ہے، دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ مشرق کی جانب پتھریلے پہاڑی سلسلے ہیں، جن کو عبور کرنا ناممکن تو نہیں دشوار ضرور ہے۔ مغرب کی طرف گھنا جنگل ہے، جس میں یوں تو مختلف قسم کے درخت ہیں، لیکن اکثریت ناریل کے درختوں کی ہے۔ پہاڑوں اور جنگل کے درمیانی حصے میں تقریباً ایک فرلانگ طول وعرض کا ایک بڑا میدان ہے جس میں بیس پچیس خیمے نصب ہیں۔ پہلی نظر میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہاں جغرافیہ یا ارضیات کے ماہرین کی کوئی ٹیم خیمہ زن ہے اور کسی نوع کی تحقیق کا کام چل رہا ہے۔ لیکن ذرا دھیان سے دیکھیں تو یہاں دکھائی دینے والا ساز وسامان خود بہ خود اس خیال کی نفی کر دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں کسی طرح کی فوجی تربیت دی جارہی ہے۔ اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ شاید یہ نکسلیوں کا کوئی گروہ ہے۔ یا پھر یہ ایسے جرائم پیشہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں، جو جنگل سے چوری کر کے قیمتی لکڑیوں کی برآمد کے غیر قانونی کاروبار میں ملوث ہوں۔ اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کسی ایسی خفیہ تنظیم کے اراکین ہوں، جسے قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے۔

کبھی کبھی اکادکا کوئی شخص ایک خیمے سے نکل دوسرے خیمے میں داخل ہو جاتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ لوگ جو بھی ہیں کسی بہت ہی اہم کام کی تیاری میں مصروف ہیں۔ مشرق کی جانب ایک نسبتاً بڑا خیمہ تھا، جس میں کچھ معمر لوگ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ آپس میں کچھ بات چیت بھی کر رہے تھے۔ اپنے لباس اور رکھ رکھاو کے اعتبار سے یہ لوگ مہذب اور شائستہ نظر آرہے تھے۔ اس سے اس بات کی تردید ہوتی تھی کہ ان کا تعلق کسی طرح کی غیر قانونی تنظیم یا جرائم پیشہ لوگوں سے ہوگا۔

بڑے خیمے سے ایک معمر شخص باہر نکلا۔ اس کے نورانی چہرے سے تقدس اور بردباری کا اظہار

ہو رہا تھا۔پہلی نظر میں وہ کوئی ایسا مذہبی رہنما معلوم ہو رہا تھا، جو اپنے مریدوں کے درمیان آیا ہو۔دیکھتے ہی دیکھتے مختلف خیموں کے تقریباً تمام لوگ باہر نکل کر نہایت احترام و عقیدت کے ساتھ صف بند ہو کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔اس کے ارد گرد کچھ دوسرے بزرگ بھی کھڑے تھے۔پیچھے کچھ مستعد نوجوان تھے جن کے ہاتھوں میں جدید ترین اسلحے تھے۔اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کوئی بہت اہم شخص ہوگا جس کی حفاظت کے لیے ایسا انتظام کیا گیا ہے۔اب اس بات کا اندازہ لگانا بھی آسان ہو گیا تھا کہ ان کی مجموعی تعداد ستر،اسی کے آس پاس ہوگی۔ان میں بیس سے تیس سال کے جوانوں کی تعداد ساٹھ پینسٹھ تھی اور باقی دس پندرہ لوگ زیادہ عمر کے تھے۔معمر شخص ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ اٹھا کر سب لوگوں کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔یہ شخص شاید ان لوگوں کے گروہ کا امیر تھا۔'اللہ جلیل' کا نعرہ بلند کرنے کے بعد اس نے اس مختصر مجمعے کو مخاطب کیا۔اس نے اپنی تقریر شروع کی۔

'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔حرکت البشر کے لائق فخر فرزندو!
السلام علیکم و رحمت اللہ و برکاتہ. اللہ رب العزت کی ثنا اور تمہارے حق میں نیک خواهشات اوردعاؤں کے بعدمیں، احمد عبداللہ الهندی، حرکت البشر کے امیر کی حیثیت سے اس بات پر اپنی خوشی کا اظہار کرتا هوں کہ خدا کے فضل و کرم سے تم لوگوں کا یہ تربیتی پروگرام بہ خیر و خوبی اپنے انجام کو پہنچا. واعظ البشر نے مجھ سے تمہاری صلاحیت،جاں‌فشانی، ایمان داری اورنیک نیتی کے بارے میں کلمات خیر کا استعمال کیا هے.میرے لیے یہ اطلاعات طمانیت بخش بھی هیں‌اور حوصلہ افزا بھی.اس کامیابی اور وطن عزیز اور ملت اسلامیہ کی خدمت کے تمہارے پختہ ارادے کے لیے میں تمہیں مبارک باد پیش کرتا هوں.همارا ملک اور یہاں رهنے والے مسلمان خوفناک بحرانی دور سے گذر رهے هیں. وقت کو تم جیسے متحرک اور باعمل نوجوانوں‌کی شدید ضرورت هے.اور تم قابل مبارک باد هو کہ تم نے وقت کی نبض کو پہچانا اور اس کی آواز سنی.'

آج کے بعد تم میں سے هر نوجوان اپنی تفویض کردہ ذمے داریوں‌کو اپنی بہترین صلاحیتوں کا استعمال کرتے هوئے انجام

دینے کے لیے معینہ مقامات کے لیے روانہ ہو جائے گا۔اس کارگاہ عمل میں داخل ہونے سے پہلے میں امیر کی حیثیت سے کچھ ضروری باتیں یاد دلا دینا ضروری سمجھتا ہوں اورتوقع کرتا ہوں کہ تم لوگ میری باتیں غور سے سنو گے اور تمام زندگی نہ صرف انہیں اپنی یادداشت میں تازہ رکھوگے بلکہ ہمہ وقت ان پر عامل بھی رہوگے۔

"اب ہم لوگ صرف بشر ہیں اور ہماری تمام کارکردگی اس تحریک بشریت کے لیے وقف ہے۔ ہمارے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم عظیم ہندوستان کے شہری ہیں، یہاں رہنے والے اورلوگوں کی طرح یہ ہمارا بھی ملک ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں ہمہ وقت اپنے ملک کے تحفظ اور یہاں رہنے والے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار رہنا ہوگا۔ ہندوستان کے دشمن،خواہ وہ خارجی ہوں یا داخلی، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا کسی اور مذہب کے ماننے والے اور وہ لوگ بھی جو ہمیں یاہم جیسے کسی اور متوطن کو ہمارے عزیز وطن سے محروم کر دینے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں، ہمارے دشمن ہوں گے۔ان کی شناخت کیسے کی جائے گی، ان سے کس طرح کا سلوک روا رکھنا ہوگا، اس کا فیصلہ حرکت البشر کے اکابرین کریں گے اوروقتاً فوقتاً تم کو اس کی اطلاع ملتی رہے گی۔ ان کے فیصلے کو ہر حال میں عمل سے ہم کنار کرنا تم سب کا اولین فریضہ ہوگا۔

تمام حاضرین ہمہ تن متوجہ ہوکر اپنے امیر کی بات سن رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ امیر البشر نے اپنی تقریر سے ان نوجوانوں کے دلوں میں گرمی اور جوش وخروش پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ انھوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے آگے کہا:

"تم لوگوں کو میری یہ بات ممکن ہے ابھی عجیب لگے لیکن ہمیشہ یاد رکھنی ہوگی کہ منطق حق کی تلاش کا معتبر ذریعہ نہیں ہے۔ لیکن جب تک منطق ہمارے بنیادی اصولوں سے متصادم نہ ہو ہم وقت ضرورت اس کی مددلیتے رہیں گے کیونکہ انسان اپنی

تمام مادی ترقیات کے باوجود حق کی تلاش کا کوئی ایسامعتبر طریقہ نہیں تلاش کر پایا ہے، جو ہر موقعے پر کارگر ہو اور جس پر صد فی صد اعتماد کیا جا سکے۔

امیر البشر کی پر جوش آواز فضا میں اس طرح گونج رہی تھی جیسے انھیں اپنے لائحہ عمل کی کامیابی پر مکمل اعتماد ہو۔ اس سنسان وادی کے درخت اور پہاڑ، زمین اور آسمان بھی انسانیت کے ان بنیادی نکات کو بغور سن رہے تھے۔ یہ باتیں صرف ان نوجوانوں کے ہی کام کی نہیں تھیں بلکہ ان سے تمام انسانیت کی فلاح کے سلسلے منسلک معلوم ہوتے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے:

'اچھے برے لوگ ہر معاشرے میں ہوتے ہیں۔ برے لوگوں سے معاشرے کا فی نفسہ کوئی بنیادی نقصان نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ برا انسان اپنی برائیوں کے سبب معاشرے کی نظر میں برا ہی ہوتا ہے۔ایک معلوم برے انسان کے اعمال و افعال سے معاشرے کے نظریات بدل جانے کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ تشویش ناک صورت حال وہ ہوتی ہے جب کوئی برا شخص اپنی سرگرمیوں پر شرمندہ ہونے کے بجائے کسی دوسرے شخص سے اپنی برائیوں کے افادی پہلوؤں پر گفتگو کرتا ہے اور سننے والا اپنے کسی مفاد،اپنی کسی مصلحت یا محض لاپرواہی سے اس کی تائید و تصدیق کرنے لگتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو رفتہ رفتہ برائیوں کو معاشرے کی تائیداور منظوری حاصل ہونے لگتی ہے۔ اس لیے ہمیں ان لوگوں پر زیادہ توجہ دینی ہے جو معاشرے کے معززین میں شمار ہوتے ہیں لیکن جو شر کی تبلیغ کے لیے اپنی دلکش زندگی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ فی نفسہ برے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی اصلاح نسبتاً دشوار ہوتی ہے۔ ہمیں ان لوگوں سے بھی ہوشیار رہنا ہے جو اپنے ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے برے ہیں ہم ان سے مدد لے سکتے ہیں، ان کی اصلاح کر سکتے ہیں، بشرطے کہ اگر ہم ان کے مسائل حل کر دیں تو یہ خونکو صراط مستقیم پر لانے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔'

'ہم نے مختلف اچھی بری تنظیموں سے اپنا رابطہ بنا رکھا ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہم ان کے اچھے برے کاموں میں ان کی معاونت

کریں گے بلکہ ھمارا مقصد محض یہ ھے کہ ان کو اعتماد میں لے کر ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھ سکیں اور ان کے غلط اقدام سے معصوم عوام کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔خواہ وہ ھندو ھوں خواہ مسلمان۔ ھم ان ھندو تنظیموں کو بھی سبق سکھانے کا کام کرتے ھیں جو مسلمانوں کے بارے میں غلط پروپیگنڈا یا ان کو کسی بھی طرح کا نقصان پھنچانے کی کوششیں کرتے رھتے ھیں۔ ھم میں سے ھر ایک کو یہ بات ھمیشہ یاد رکھنی ھے کہ اپنے اصولوں پر عمل کے لیے ھمیں اکابرین حرکت البشر کے علاوہ کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ھوگی'۔

امیر البشر احمد عبداللہ الہندی کی رعب دار اور پر تاثیر آواز فضا میں مرتعش ہو رہی تھی۔ان کی گفتگو میں خلوص تھا۔وہ ان نو واردوں کو اس تحریک کے ہر پیچ و خم اور ہر زیر و زبر سے واقف کرا رہے تھے۔وہ کہہ رہے تھے۔

'ھماری تحریک اس وقت تک عدم تشدد پر گامزن رھے گی جب تک ھمیں پر تشدد ھونے پر مجبور نہ کیا جائے۔حالانکہ تشدد فی نفسہ بری چیز اور خیر سے متناقض دکھائی دینے والا عمل ھے لیکن ھم اسے دنیا میں قیام امن کے ایک موثر حربے کے طور پر بھی دیکھتے ھیں۔ ھمارا میدان عمل کمزوروں کو معاشی استحکام، خوف زدہ لوگوں کو اطمینان قلب اور گمراھوں کو صراط مستقیم فراھم کرنا ھے۔حتی الامکان ھم اپنے ملک کے قانون کی پیروی کرتے ھیں۔لیکن تحریک کے تمام کارکنوں کے لیے اپنے سے بڑے عھدہ دار کا حکم حتمی ھوگا۔

نوجوان سامعین ہمہ تن گوش ان کی ایک ایک بات کو بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔اپنی بات ختم کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

'میں یہ بات ایک بار پھر یاد دلانا چاھتا ھوں کہ تحریک بشریت کی کامیابی اور ھم سب کے تحفظ کے پیش نظر اس تحریک میں شمولیت کا فیصلہ حتمی اور آخری ھوتا ھے۔اب ھمارا واحد مقصد بنی نوع انسان کی خدمت اور اس کی بھتری کے لیے امکانی

کوشش کرتے رہنا ہے۔ اب ہمیں اسی میدان عمل میں جینا اور مرنا ہے۔ خدا ہمیں اس کا اجر دے گا۔ آمین۔

اس کے ساتھ ہی احمد عبداللہ الہندی نے اپنی تقریر ختم کی۔ اس کے بعد وہ بلندی سے نیچے آئے۔ انھوں نے تحریک بشریت کی کامیابی کے لیے اجتماعی دعا خوانی کی سربراہی کی اور اٹھ کر اپنے خیمے میں چلے گئے۔

سات

کان پور سنٹرل ریلوے اسٹیشن سے لگے کلکٹر گنج سے چمن گنج کی سمت جانے والی سڑک پر ایک نوجوان پیدل چلا جا رہا تھا۔ اس کے جسم پر میلے کپڑے تھے۔ اس کی سست رفتار، پژمردہ چہرہ اور کمزور جسم دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کئی روز سے کھانا نصیب نہیں ہوا ہوگا۔ اس کے چہرے پر فکر وتردد کی گہری لکیریں تھیں۔ چلتے چلتے اس کی نظر سڑک کے کنارے کے ایک اوسط درجے کے ہوٹل پر پڑی۔ وہ اس کے دروازے تک پہنچا تو اس کے قدموں نے جیسے آگے بڑھنے ہی سے انکار کر دیا۔ پچھلا ایک ہفتے سے وہ کام کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جو پیسے لے کر وہ گھر سے نکلا تھا وہ تین دن کے اندر ہی خرچ ہو گئے تھے اور اب اس کا ہاتھ خالی تھا۔ کام مانگنے پر بار بار کی جھڑکی اور بے عزتی سے ٹوٹ کر اب وہ مایوسی کی حد میں داخل ہو چکا تھا۔ اپنے گاؤں میں رہ کر کبھی اس نے اندازہ نہیں کیا تھا کہ شہروں میں کام کی ایسی قلت ہو سکتی ہے۔ اس نے سوچا کہ اس ہوٹل میں بھی وہ ایک کوشش کر کے دیکھ لے۔ وہ آگے بڑھا۔ کاونٹر کے پیچھے ایک داڑھی والا ادھیڑ شخص گاہکوں سے لین دین میں مصروف تھا۔ دوپہر کے دو بجے تھے۔ کھانے کا وقت تھا۔ شاید اسی لیے بھیڑ بھی معمول سے کچھ زیادہ تھی۔ وہ ایک کونے میں ذرا سا کھڑا بھیڑ کے کچھ کم ہونے کا انتظار کرنے لگا تا کہ وہ کاونٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے ہوٹل میں کام دینے کی درخواست کر سکے۔

ایک شخص جو کھانے کا بل ادا کرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا، غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو اس اجنبی شخص نے نہایت نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ کوئی کام ہے کیا بابو بھائی سے۔"

اپنا نام سن کر کاؤنٹر پر بیٹھا شخص بھی اُدھر متوجہ ہو گیا۔ لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

نوجوان نے جواب دیا۔ 'نہیں ہم کام کی تلاش میں آئے ہیں'۔ یہ الفاظ ادا کرتے کرتے اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔

اجنبی شخص نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک خالی میز پر اُسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے ویٹر کو اشارہ کر کے بلایا اور اس کے لیے کھانے کا آرڈر دیا۔ نوجوان نے بڑی بے چارگی سے اسے روکنے کی کوشش کی، لیکن اس کا انداز بالکل ایسا تھا کہ کہیں وہ اس کی بات مان کر ویٹر کو منع نہ کر دے۔ وہ بولا۔ 'ہم کا بھیک نا چاہی۔ ہم محنت کر کے آپن روجی کماوا چاہت ہن'۔

'بھگوان نے چاہا تو وہ بھی ہو جائے گا'۔ اجنبی نے کہا۔ 'تم بھوکے معلوم ہوتے ہو۔ پہلے بھوجن کر لو، پھر ہم باہر چل کر شانتی سے باتیں کریں گے'۔ اس مختصری بات چیت سے نوجوان پر یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ اس پر مہربانی کرنے والا ہندو ہے۔

بھوک کی شدت سے پریشان نوجوان اس سے زیادہ تکلف برتنے کی حالت میں نہیں تھا۔ اس نے کھانے کی طرف توجہ کی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ سارا کھانا ایک ہی بار میں نگل جائے۔ لیکن وہ اس بات کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے اُتاولے پن سے اس کی بھوک کی شدت کا اظہار نہ ہو۔ اجنبی کے چہرے پر اطمینان تھا اور وہ اسے کھانا کھاتے ہوئے غور سے دیکھ رہا تھا۔ نوجوان نے کھانا ختم کر کے پانی پیا تو اجنبی نے پوچھا۔ 'کیا نام ہے تمھارا'۔

'مسعود خاں'۔

'میرا نام مہیش رائے ہے'۔ اس نے نہایت سادگی کے ساتھ اپنا تعارف دیتے ہوئے کہا۔ 'قریب ہی میرا اتمبا کو تیار کرنے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ ہے۔ میں یہاں اکثر دوپہر کا کھانا کھانے آجاتا ہوں۔ بابو بھائی اچھے آدمی ہیں اور کھانے کی تیاری میں صفائی کا خاص خیال رکھتے ہیں'۔

بل کی ادائیگی کے بعد وہ مسعود خاں کو ساتھ لے کر پیدل ہی اپنے کارخانے کی طرف چل پڑا۔ مسعود خاں کے چہرے پر اب کچھ بحالی آ گئی تھی۔ لیکن فکر کی گہری لکیریں اب بھی اس کے چہرے پر نمایاں تھیں۔ پیدل چلتے ہوئے مہیش رائے نے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ وہ کسی بات سے ناراض ہو کر گھر سے بھاگ آیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ سبب

بتانے میں اسے کچھ جھجک محسوس ہو رہی ہے تو اس نے بات کا موضوع ہی بدل دیا۔ اب اسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ خوددار پٹھانوں کی بستی کوٹ کا رہنے والا ہے اور کسی بات پر ناراض ہو کر یہاں آ گیا ہے۔ وہ کوٹ سے اچھی طرح واقف تھا۔ کبھی وہاں کے رہنے والے پولیس انسپکٹر عبدالوہاب خاں سے اس کی دوستی رہ چکی تھی۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ کوٹ کے رہنے والے پٹھان زود رنج ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سادہ مزاج، خوددار اور ایمان دار ہوتے ہیں۔

کارخانہ چھوٹا تھا اور دفتر معمولی۔ ایک کمرے میں دو تین لوگ بیٹھے دفتری کاموں میں مصروف تھے۔ مہیش رائے مسعود خاں کو لے کر ایک دوسرے کمرے میں گیا جو نسبتاً اور بھی چھوٹا تھا، لیکن یہ پہلے کے مقابلے میں کچھ بہتر ساز و سامان رکھتا تھا۔ اس میں ایک میز اور تین کرسیاں تھیں۔ مہیش اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور اشارہ کرتے ہوئے اس سے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

'تم کس طرح کا کام کر سکتے ہو؟' مہیش رائے نے پوچھا۔

'کونڑوں کم کر لیسیں'۔ مسعود خاں سہمے سہمے بولا۔

'گھبراؤ نہیں مسعود خاں'۔ مہیش رائے نے مزید معلومات چاہی۔ 'کسی کام کا تجربہ ہے'۔

'ہم تو ابے تک سرپوہ کھیتی باڑی کیے ہن'۔

'گڈ، مطلب یہ کہ تم محنت کر سکتے ہو'۔

'ہاں'۔

'تب تو میرا کام اور بھی آسان ہو گیا۔ تمھیں کام مل گیا سمجھو'۔ مہیش رائے نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ 'میرے ساتھ آؤ'۔

مسعود خاں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دفتر کی پشت پر ایک کھلے میدان میں ٹن کے دو شیڈ تھے، جس میں تمباکو کی پیکنگ کا کام ہو رہا تھا۔ اس نے ایک شخص کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ ادھیڑ عمر کا یہ شخص جب قریب آیا تو وہ بولا۔ 'سر جو داوا، یہ مسعود خاں ہے۔ آج سے یہ بھی ہمارے ساتھ کام کرے گا۔ اسے کام سمجھا دیجیے'۔ پھر گھڑی دیکھتے ہوئے وہ مسعود خاں سے مخاطب ہوا۔ 'آج بس دو گھنٹے میں کام سمجھ لو اس کے بعد پانچ بجے سے پہلے دفتر میں آ کر مجھ سے مل لینا۔ کیونکہ اس کے بعد میں چلا جاتا ہوں'۔

پونے پانچ بجے جب وہ دفتر میں پہنچا تو اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ مہیش نے اس سے پوچھا' کام سمجھ میں آیا؟ مجھے یقین ہے یہ کام تمھارے لیے مشکل نہیں رہا ہوگا۔

'ھم یا کام آسانی سے کر لیبے صاحب'۔

'ٹھیک ہے۔ جب تک تمھارے رہنے کا کوئی انتظام نہیں ہو جاتا، تم دفتر ہی میں سو جایا کرنا اور کھانا بابو بھائی کے ہوٹل میں کھا لینا۔ ابھی جاتے جاتے میں ان سے کہہ دوں گا۔ ہاں، ہم لوگ تم کو ایک ہزار روپے تنخواہ دیں گے۔ اگر کھانا ہوٹل میں کھاؤ گے اور رہنے کا انتظام ہم کریں گے تو چار سو روپے مہینا کم ملیں گے۔

'ھم آپ کا اِحسان کبھوں نہ بُھلبے صاحب'۔

مہیش رائے نے اپنی اسکوٹر نکالی اور چلا گیا۔ مسعود خاں سوچ رہا تھا۔ زندگی اس کے ساتھ یہ کیسا مذاق کر رہی ہے۔ وہ تو مسلمانوں کو ہندوؤں سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے گھر سے نکلا تھا اور پہلے ہی موڑ پر ایک ہندو اس کے مسائل کا مداوا بن کر مہربانی کا برتاؤ کر رہا ہے۔ مہیش رائے ہندو ہونے کے باوجود بھی انسان ہے۔ لیکن سارے ہندو اس جیسے نہیں ہوتے۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ پھر بھی کیا مجھے، مجھ مسعود خاں کو، جس کے دل میں ہندوؤں سے بے انتہا نفرت ہے، ایک ہندو کی نوکری کرنی چاہیے نہیں......لیکن اس کے علاوہ راستہ ہی کیا ہے۔۔ایک ہفتے سے میں بھوک سے بے حال اس شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا تھا۔ کتنے مسلمانوں سے فریاد کی، مسجد میں دہائی دی، گھروں میں دستک دی۔ لیکن کسی نے تو مجھ پر رحم نہ کیا۔۔اور یہ ہندو مہیش رائے، میرے کچھ کہے بغیر، میری زبان سے ایک بھی لفظ نکلے بنا صرف میری حالت دیکھ کر سب کچھ سمجھ گیا۔ اور مجھے کھانا ہی نہیں کھلایا بلکہ چٹکیوں میں میرے لیے کام کا بندوبست بھی کر دیا۔ اب میں کسی کا محتاج نہیں رہا۔ میں لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی بے عزتی سے بچ گیا۔۔۔مہیش رائے ہندو ہونے کے باوجود بہت شریف انسان ہے لیکن میں اُن ہندوؤں کو کیسے بھول سکتا ہوں، جنھوں نے گجرات میں.........نہیں نہیں۔ مجھے جتنی جلدی ہو سکے کہیں دوسری جگہ کام ڈھونڈھ لینا چاہیے۔ بس جب تک میں مجبور ہوں، یہاں رہوں گا۔

وہ ابھی اسی ادھیڑ بن میں لگا تھا کہ سرجو دادا آ گئے۔ اس کے ساتھ دفتر کا ایک نوجوان بھی تھا۔ کا سواگت ھو بچوا۔ سرجو دادا نے کہا۔' آرے بھاگ والے ھو جو مھیش بابا مل گئے تم کا

آب تُم کوئو پھکر نا کرو۔ سب ٹھیک ہوئی جائی۔ دیاکھو ایں منصُور ہی۔مسین کے کاری گر۔ یا چمن گنج ماں اکیلے کمرا لئی کے رَہت ہی۔ تم ایہی کے ساتھ چلے جائو۔ایہاں کَہاں دفتر ماں اکیلے پڑے رَہیو۔'

'ہاں مسعود خاں، ابھی تم میرے ساتھ چلو۔ بعد میں دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔'

'پر مالک نے ہم کا ہیئین دفتر ماں سوئے کا کہن ہیں'۔ مسعود خاں نے کچھ تکلف سے کہا۔

'آپ تُم یا پَروا نہ کرو۔ ہم چوکی دار سے کہے دیئت ہن کہ تُم منصور کے ساتھ جات ہو'۔ سرجو دادا نے مسئلہ حل کرتے ہوئے کہا۔

'جون تم ٹھیک سمجھو'۔ مسعود خاں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔'ہم تو ہیاں نئے ہن۔ نہ کوئو کا جانی نا بوجھی'۔

آگ

ضرغام حیدر کو جاننے والے ان دنوں اس کے رویے سے فکر مند تھے۔ عام طور پر وہ تنہا رہنا پسند کرنے لگا تھا۔ دوستوں کو اس بات کی تکلیف تھی کہ اتنا ہنس مکھ نوجوان، اتنا اچھا شاعر، اتنا حاضر دماغ اور مخلص دوست، اتنا ذہین طالب علم آج کل بہت خاموش خاموش رہنے لگا تھا۔ پہلے تو ساتھیوں کو لگا کہ اس کا جگری دوست عبدالرحمن اپنے والد کو دیکھنے بنارس گیا ہوا ہے اور خلاف معمول اسے وہاں زیادہ وقت لگ گیا شاید اس اداسی اور خاموشی کی یہی وجہ ہو۔ لیکن اب لگ رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔ وہ اس کے گھر کی حالت سے واقف تھے، اس لیے کچھ کہہ کر اس کے دکھ میں مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اس کے اندر جاری کشمکش سے اس کا سب سے قریبی دوست عبدالرحمن بھی واقف نہیں تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی سمجھ پاتا تھا کہ وہ اپنے والد کے رویے اور اپنی مفلسی سے پریشان ہے۔ وقتاً فوقتاً وہ مناسب طریقے سے اس کی مدد بھی کر دیا کرتا تھا۔ اس طرح کہ اس حساس شاعر اور عزیز دوست کی عزت نفس کو ٹھیس نہ لگے۔ لیکن ضرغام کے اندر جو کشمکش چل رہی تھی، اس کا تعلق اپنی ذات یا اپنے افراد خاندان سے نہ تھا۔ وہ سچ مچ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے فکر مند تھا۔ ایک آدھ بار اس نے دوستوں کے درمیان اپنے اس دکھ کو بیان کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بیشتر نے اس کے اس خیال کا مذاق اڑایا تھا۔ کچھ

نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ میاں زمانہ بدل گیا ہے۔ اس کی رفتار کو دیکھو اور اپنے کام سے کام رکھو۔ وہ جانتا تھا کہ اب جو وقت چل رہا ہے اس میں دل کے جذبات پر لوگوں کو ذرا کم ہی یقین آتا تھا۔ اس لیے اس نے طے کر لیا تھا کہ آئندہ وہ اس نازک مسئلے پر کسی سے بات نہیں کرے گا۔ وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کی اس خاموشی نے جیسے اس کے دل کے زخموں کو کریدنا شروع کر دیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ یہ زخم ناسور بنتا جا رہا تھا۔ ایسے میں اسے عبدالرحمن کی یاد آ رہی تھی، لیکن وہ پچھلے ایک ماہ سے بنارس میں تھا۔

آج بھی یونیورسٹی سے لوٹتے ہوئے وہ بے حد اداس تھا۔ وہاں الیکشن کی گہما گہمی تھی۔ نعرے بازیوں اور تقریروں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ہر گروہ جھوٹے سچے وعدے کر رہا تھا اور ضرغام انھیں سن سن کر کراہت محسوس کر رہا تھا۔ ایسے میں کلاس تو بھلا کیا ہوتی، الٹا لڑکوں نے اس کے عملی سیاست میں حصہ نہ لینے کی وجہ سے اسے لعن طعن بھی کیا تھا۔ بہت جلد یہ ماحول اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ بالآخر عاجز آ کر وہ گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسے دکھ تھا کہ وہ مروت میں ان کو معقول جواب نہیں دے پایا۔ اسی ادھیڑ بن میں الجھا ابھی وہ مولوی گنج میں اپنے گھر کے پاس والی گلی کے موڑ پر پہنچا تھا کہ ایک کم عمر لڑکے نے اسے ایک لفافہ پکڑایا اور الٹے پیروں بھاگ گیا۔ ضرغام اسے پہچان بھی نہ سکا کہ وہ کون تھا، لیکن وہ اس کے محلے کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس نے حیرت سے اس سبز لفافے کو دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے فوراً چاک کر کے دیکھے۔ پھر اسے لگا کہ یہ کام وہ گھر جا کر اطمینان سے اپنے کمرے میں کرے گا۔ اس نے لفافے کو اپنی جیب کے حوالے کیا، قدم آگے بڑھائے اور گھر میں داخل ہوا۔ جیسے ہی وہ صحن سے گذرا اس کا اس کے والد سے آمنا سامنا ہو گیا۔ وہ اس وقت کسی طرح کی بحث کے موڈ میں نہیں تھا، اس لیے سہم گیا۔ لیکن معمول کے برخلاف والد نے اسے بڑی شفقت سے مخاطب کیا۔ 'آج کچھ جلدی آ گئے یونیورسٹی سے'۔

ضرغام ان کے لہجے کی نرمی کا عادی نہیں تھا۔ اس نے غور سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی کسی طرح کے طنز کے آثار مفقود تھے۔ وہ حیران تھا۔ لیکن اس نے فوراً جواب دیا۔ 'وہاں آج کل الیکشن کا ہنگامہ چل رہا ہے، اس لیے میں گھر چلا آیا'۔

'چلو اچھا کیا، اب کچھ آرام کر لو۔ تم بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو'۔ وہ بولے۔ 'اور ہاں بہت دنوں سے تمھارا دوست عبدالرحمن گھر نہیں آیا؟' انھوں نے پوچھا۔

ضرغام والد کے لہجے کی اس تبدیلی کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ لیکن اسے آج ان سے گفتگو کرکے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ انجانے ہی اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا کہ کہیں اس کے والد کی نظر اس کے آنسوؤں پر نہ پڑ جائے۔ پھر جواب دیا۔' وہ آج کل اپنے گھر گیا ہوا ہے۔ اس کے والد کی طبیعت کچھ خراب ہے'۔ یہ کہتے ہوئے وہ جلدی سے آگے بڑھا اور اپنے کمرے میں داخل گیا۔ جیسے اسے یہ گفتگو عجیب لگ رہی ہو۔ جیسے والد کا یہ بدلا ہوا انداز اس سے برداشت نہ ہو پا رہا ہو۔

کمرے میں آکر اس نے بڑے تجسس کے ساتھ لفافے کو چاک کیا۔ اندر سے سبز رنگ کے کاغذ پر ہاتھ سے خوش خط تحریر کیا ہوا ایک پمفلٹ برآمد ہوا۔ اس نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ بغیر کسی عنوان یا تمہید کے لکھا گیا تھا۔

'ہم محب وطن ہندوستانی ہیں اور اپنی جانوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وقف کر چکے ہیں. ہم بالعموم ہندوستان کے وقار کو بحال کرنے، بد دیانتی، بے ایمانی اور نابرابری کو دور کرنے، اسے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لیے گہوارہ امن و امان بنانے، اس کی ہمہ جہت ترقیات میں ملک کے ہر شہری کو اس کا جائز حق دلانے، بالخصوص مسلمانوں کے عزت و وقار اور جان و مال کو تحفظ فراہم کرنے کے مقصد سے کام کر رہے ہیں۔ ہمیں ایسے نوجوانوں کی شدید ضرورت ہے جو ہمارے مقاصد سے اتفاق رکھتے ہوں اور اپنے ملک، اپنے مذہب اور زندگی کی صالح اقدار کی بازیافت کے لیے اپنی جانوں کو قربان کر دینے کا شدید جذبہ رکھتے ہوں۔ اگر آپ محسوس کرتے ہوں کہ آپ اس کے اہل ہیں اور آپ کے اندر اپنے ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ ہے تو ہماری تحریک اور ہندوستان کو آپ کی ضرورت ہے۔ ہم سے رابطے کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ آپ ہندوستان کے شہری ہوں اور اپنے ملک اور یہاں کے لوگوں سے محبت رکھتے ہوں۔

۲. آپ مسلمان ہوں، ایمان دار اور نیک سیرت ہوں۔
۳. کم از کم تحریک میں شمولیت کے وقت آپ غیر شادی شدہ ہوں۔ لیکن آپ کی خواھش پر بعد میں شادی کی مشروط اجازت دی جا سکتی ھے۔
۴. عمر ۱۸ سے ۳۰ سال کے درمیان ہو۔
۵. کم از کم دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی ہو۔

ھم سے رابطے کے لیے فی الحال بس یہی شرائط کافی ھیں۔دیگر شرائط ھمارا نمائندہ آپ کو پہلی ملاقات میں بتا دے گا۔ اس ملاقات کے دوران ان کے ماننے یا نہ ماننے کے لیے آپ پوری طرح آزاد ہوں گے۔

منتخبہ نوجوانوں کی تربیت کے دوران دس ہزار روپے کا ماھانہ مشاھرہ ان کے افراد خاندان کو فراھم کیا جائے گا اور تربیت کے بعد مشاھرے کا تعین اس کی صلاحیتوں اور اسے تفویض کیے جانے والی ذمے داریوں کی بنیاد پر ہوگا، جو دو لاکھ روپے سالانہ سے دس لاکھ روپے سالانہ تک ھو سکتا ھے۔ منتخبہ نوجوانوں کے اپنے ھر طرح کے اخراجات تحریک کے ذمے ھوں گے۔

اگر آپ ان شرائط کی پابندی پر آمادہ ھیں اور ھماری تحریک میں شمولیت کے خواھش مندھیں تو آپ آج ھی سے روزانہ شام پانچ بجے سے نو بجے کے درمیان بیگم حضرت محل پارک میں آتے رھیں۔ انشا اللہ ایک ھفتے کے اندر کسی نہ کسی دن ھمارا نمائندہ آپ سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ھو جائے گا۔

متنبہ کیا جاتا ھے کہ مصلحت گرفتہ، بد کردار اور بے ایمان نوجوان ھم سے دور رھیں۔ یہ خود ان ھی کے حق میں بہتر ھوگا۔یہ بھی یاد رھے کہ تنظیم میں صرف داخل ھی ھوا جا سکتا ھے۔یہاں سے باھر جانے کا کوئی راستہ نہیں ھے۔

"یہ ہوئی نہ کچھ بات۔" ضرغام حیدر کے منھ سے بے اختیار نکلا۔ اپنی آواز پر وہ خود ہی چونک

گیا۔ اس لفافے نے جیسے اس کا خراب موڈ یک بیک ٹھیک کر دیا تھا۔ لیکن یہ اس کا فوری ردعمل تھا۔ بغیر سوچے سمجھے۔ اس سے بس اتنا ہی نتیجہ نکلتا تھا کہ یہ پیش کش اسے پسند آئی تھی۔ لیکن وہ تنہا نہ تھا۔ اس کا ایک گھر تھا، بوڑھے والدین تھے، جنھیں اس کی ضرورت تھی۔ بھائی تھا، بہن تھی۔ اس کے کسی فیصلے کا اثر ان سب پر بھی پڑنے والا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سارے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے جو اس کے گھر کے روزمرہ کا معمول تھے۔ اسے وہ سارے اذیت ناک لمحات یاد آنے لگے، جو اس کے گھر میں دائمی طور پر خیمہ زن ہو چکے تھے۔ ایک لمحے کو اسے اپنے والد کے بدلے ہوئے رویے کا خیال بھی آیا، لیکن وہ اس کا سبب سمجھنے سے قاصر رہا۔ ایسے میں اسے عبدالرحمن کی یاد بہت آئی۔ کاش وہ اس وقت یہاں ہوتا اور وہ اس سے اس نازک مسئلے پر کچھ مشورہ کر سکتا۔

نو

مسعود خاں کو اپنا گاؤں چھوڑے اب کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اس مدت میں اس کی زندگی میں بہت اونچ نیچ آئی تھی۔ اب وہ گاؤں کا معصوم نوجوان نہیں تھا۔ صنعتی شہر کان پور کے روز و شب نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اس بیچ کان پور یونی ورسٹی سے اس نے پرائیویٹ بی اے بھی کر لیا تھا اور اب وہ یہاں کی ایک کاٹن مل میں لیبر سپروائزر تھا۔ دن بھر کی مصروفیت کے باوجود وہ مطالعے کا وقت نکال لیتا تھا۔ اسے ادبیات سے دلچسپی تھی۔ رہائش کے لیے اس نے چمن گنج کے گھوسیانہ محلے میں واقع نیچر جی کی بلڈنگ میں ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس دوران اسے کئی بار اپنے نظریے پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آئی تھی۔ جب وہ گاؤں سے آیا تھا تو اس کے دل و دماغ میں ہندو دشمنی کا ایک سمندر موجزن تھا۔ ایک سال مہیش رائے کے ماتحت کام کرنے کے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ سارے ہندو ایک جیسے نہیں ہوتے۔ چھ سال پہلے رونما ہونے والے بھیانک ہندو مسلم فسادات نے ایک بار پھر اس کی فکر کو متزلزل کر دیا تھا۔ لیکن اب کی بار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ہندو مسلمان کا نہیں، اچھے اور برے انسان کا مسئلہ ہے۔

اسے مہیش رائے کی یاد اکثر آیا کرتی تھی، جو ہندو ہونے کے باوجود اس خونیں فساد کی نذر ہو چکا تھا اور جس کے نتیجے میں اس کا کارخانہ بند ہو گیا تھا۔ چنانچہ یہاں کام کرنے والے اپنی اپنی روزی کی تلاش میں بکھر گئے اور ایک سال پرانا رشتہ منقطع ہو گیا۔ سب کارکنوں کی طرح وہ بھی ایک بار پھر اس شہر

کے طول وعرض میں یک وتنہا خاک چھاننے پر مجبور ہوا۔ مہیش رائے کو قتل کرنے والے ہندو ہی تھے۔ جب کارخانے پر حملہ ہوا تھا تو وہ اپنے دفتر میں اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھا۔ فسادیوں کا پہلا نشانہ دفتر ہی تھا۔ کارخانے کے اندر کام کرنے والے خوف زدہ کارکنوں نے کچھ دیر ان کی تو تو میں میں سنی اس کے بعد وہاں سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ ظاہر ہے انھوں نے مہیش رائے کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اندر آئے۔ انھوں نے چوکیدار سے مسعود خاں اور منصور کے بارے میں پوچھا۔ اس نے خوف ودہشت کے زیر اثر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ منصور خوش قسمت تھا کہ اس دن بیمار تھا اور کام پر نہیں آیا تھا۔ ان کے پستول سے ایک گولی نکلی تھی جو اس کے سینے میں پیوست ہوگئی تھی اور وہ واپسی کے لیے مڑ گئے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا وہ نہ جان سکا، البتہ جب اس نے آنکھ کھولی تو خود کو ہیلٹ اسپتال کے جنرل وارڈ میں فرش پر دراز پایا۔ وہاں اس جیسے اور لوگ بھی زیر علاج تھے۔ یہ سب مسلمان ہی تھے۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ حیرت انگیز طور پر بچ گیا تھا، کیونکہ پستول کی گولی نے اس کے دل کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

مہیش رائے فرشتہ تھا۔ لیکن ایسے انسانوں کی تعداد اس شہر میں زیادہ نہیں تھی۔ اس کا تعلق ہندو دھرم سے تھا جسے کبھی وہ اپنا اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن تصور کرتا تھا۔ یہ مہیش رائے کے حسن سلوک کا ہی کرشمہ تھا کہ آج اسے زندگی کی اس حقیقت کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اس کی قربت، محبت اور شفقت نے اس کے مزاج میں زبردست تبدیلیاں پیدا کی تھیں۔ اب وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نہ تو ہندو کا مطلب برا ہوتا ہے اور نہ مسلمان کا اچھا۔ اچھے برے لوگ ہر جگہ ہو سکتے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو مجموعی طور پر اچھے انسانوں کی تو دونوں ہی جگہ قلت تھی۔ اس خونیں فساد کو اہل کان پور کبھی فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں سرکاری رپورٹ کے مطابق چالیس لوگ جاں بحق ہوئے تھے اور ایک ہزار سے زیادہ زخمی۔ حالانکہ حقیقی تعداد سرکاری رپورٹ سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ پہلا فساد تھا جب پی اے سی پر کھلے طور پر یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس نے مسلم گھروں میں گھس کر لوگوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا اور عورتوں کی آبروریزی کی۔ یہ پہلا موقع تھا جب یہاں کے مسلمانوں کو فسادیوں کے خلاف ہی نہیں، پولیس کے خلاف بھی مورچہ کھولنا پڑا تھا۔ حالانکہ اس دفاعی عمل کا نتیجہ بڑے پیمانے پر تباہی کی شکل میں برآمد ہوا تھا، لیکن ان لوگوں نے اس کے باوجود ہمت نہیں ہاری تھی۔ چنانچہ دوسرے مہلوکین کے علاوہ چندرہ پولیس والے بھی مارے گئے تھے۔ اور اب تو یہ بخوبی ثابت ہو چکا

تھا کہ اس سازش میں پولیس کے لوگ بھی ملوث تھے۔ لوگوں کو یہ بھی شک تھا کہ فساد کا سبب جو مشتہر کیا گیا وہ نہیں تھا بلکہ اسے کسی خاص مقصد کے تحت باقاعدہ طور پر کرایا گیا تھا۔ یہ فساد مسعود خاں کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے اس نے بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔ اسپتال کے بستر پر پڑے پڑے وہ صرف ان فسادیوں کے بارے میں ہی نہیں سوچا کرتا تھا جنھوں نے اس پر گولی چلائی تھی، بلکہ ان تمام معصوم لوگوں کے بارے میں بھی وہ درد محسوس کرتا تھا جو اس فساد سے کسی نہ کسی طور متاثر ہوئے تھے۔ کرفیو کے خاتمے، امن کے قیام اور اسپتال سے باہر آنے کے بعد اس نے متاثرہ لوگوں کی بازآبادکاری کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کے ساتھ مل کر کام بھی کیا تھا، جس سے اسے قلبی سکون ملا تھا۔ دراصل وہ بنیادی طور پر ایسا نوجوان تھا جو زندگی کے ہر موڑ سے کوئی نہ کوئی سبق سیکھ لیتا تھا۔ ان تنظیموں کے ساتھ کام کرنے سے اسے یہ احساس ہوا کہ تنہا اپنے حوصلوں کی تکمیل دشوار عمل ہے۔ کسی بھی تعمیری منصوبے کو تنہا کسی ایک فرد کے لیے عمل میں لانا دشوار ہوتا ہے۔ اجتماعی طور پر یہ کام کریں تو یہ آسان بھی ہوتا ہے اور اس سے فیض یاب ہونے والوں کا دائرہ بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی ایسی ہی فلاحی تنظیم سے منسلک ہو جائے جو ہندوستان کو برائیوں سے پاک کرنے کے لیے کام کر رہی ہو اور جس کے اثرات کا دائرہ سارے ملک کو محیط ہو۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اپنی اس خواہش کو کیسے پورا کرے۔

وہ جس محلے میں رہتا تھا وہاں مذہب اور عقیدے کے اعتبار سے لوگوں کی آبادی ملی جلی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے باوجود اس محلے میں رہتے ہوئے اسے کبھی خوف کا احساس نہیں ہوا تھا۔ یہ سب کام کاجی لوگ تھے۔ انھیں اس کی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ اپنے روزمرہ کے فرائض کی انجام دہی کے علاوہ کچھ اور سوچ سکیں۔ ان کا ہندو یا مسلمان ہونا صرف اس وقت معلوم ہوتا تھا جب کوئی تیوہار آتا تھا۔ ان تیوہاروں میں بھی وہ ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوتے تھے۔ ہاں جب کبھی شہر میں فرقہ پرستی کا بھیانک رقص شروع ہوتا تھا تو ایسا لگنے لگتا تھا کہ اس اتحاد و یگانگت کے ماحول میں بھی ہندو صرف ہندو بن کر سوچنے لگتے ہیں اور مسلمان صرف مسلمان۔

جس عمارت میں وہ رہتا تھا اس میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ یہ

عمارت کسی مسلمان کی تھی۔ لیکن تقریباً پچاس فلیٹوں میں سے آٹھ میں بے خوف و خطر ہندو خاندان فروکش تھے۔ وہ ابھی تنہا ہی تھا، اس لیے کہ اس کی شادی بیاہ کی فکر کرتا بھی کون۔ اس کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا، جس میں دو کمرے تھے۔ اس کے علاوہ باورچی خانہ اور غسل خانہ وغیرہ بھی تھے۔ اس نے ایک کمرے کو خواب گاہ اور دوسرے کو مہمان خانہ بنا رکھا تھا، جہاں وہ اپنے مدعو دوستوں کا استقبال کیا کرتا تھا۔ اسے کھانا پکانے میں مہارت حاصل تھی۔ اس کے دوست اس سے اکثر فرمائش کیا کرتے تھے کہ وہ انھیں اپنے گھر مدعو کرے۔ اور اس نے اپنے دوستوں کو کبھی مایوس بھی نہیں کیا تھا۔

اس کے فلیٹ سے ملحق فلیٹ میں ایک اور خاندان رہتا تھا جو صرف دو نفوس، ماں اور بیٹی پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ دوسرے لوگوں سے راہ و رسم رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا یہ فیصلہ ٹھیک بھی معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ زمانہ اب واقعی ایسا آ گیا تھا کہ بے تکلفی کسی نا قابل تلافی نقصان کا سبب بھی بن سکتی تھی۔ ویسے بھی جوان لڑکی کے ساتھ کسی گھر میں کسی مرد کے بغیر زندگی گذارنا انسان کو غیر معمولی محتاط بنا دیتا ہے۔ اس لیے کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور ان کا تعلق کس علاقے سے ہے۔ لیکن ان کی شکل و شباہت اور رہن سہن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ بھی نہ کبھی ہندوستان کے شمال مشرقی خطے میں ضرور رہے ہوں گے۔ اگر یہ سچ تھا تو وہ اتنے دور دراز علاقے میں آ کر کیوں رہ رہے تھے، اس کا بہ ظاہر کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جب اس نے یہ فلیٹ کرایے پر لیا تھا، اس وقت یہ لوگ یہاں پہلے سے موجود تھے۔ جانے وہ یہاں کب سے رہتے ہوں گے۔ ان کے یہاں کسی کا آنا جانا بھی نہیں تھا۔ بس ایک ملازمہ آتی تھی جو شاید گھر کی صفائی اور ان دونوں کے لیے کھانا پکانے کا کام کرتی تھی۔ مصروف زندگی کے دباؤ میں شاید یہاں رہنے والے دوسرے لوگوں نے کبھی اس کی ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی۔ لیکن چونکہ مسعود خاں ان کا سب سے نزدیکی پڑوسی تھا، اور اس سے ان کا سامنا اکثر و بیشتر ہوتا رہتا تھا، اس لیے یہ سب کچھ اسے غیر فطری لگا کرتا تھا۔ اس کا تجسس رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ لوگ آخر ہیں کون؟

ان دو برسوں میں جب سے وہ یہاں آیا تھا، اس لڑکی سے اس کی بات چیت صرف دو بار اور اس کی ماں سے ایک بار بس سلام دعا ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کی ماں اپنے فلیٹ سے کم ہی باہر نکلا کرتی تھی۔ لیکن ان تینوں مواقع پر ان دونوں میں سے کسی نے اس گفتگو کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔

بس ایک خشک جواب کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ایسا پہلی بار اس وقت ہوا تھا جب وہ لڑکی عمارت کے باہر کھڑی رکشے کے لیے پریشان تھی اور اس نے از راہ ہمدردی اسے یہ بتایا تھا کہ آج شہر میں ہڑتال ہے جس کی وجہ سے نہ صرف بازار کی تمام دکانیں بند ہیں بلکہ آمدورفت کے تمام ذرائع بھی مفقود ہیں۔اس پر اس نے صرف شکریہ کہا تھا اور واپس مڑ کر اپنے فلیٹ پر جانے کے لیے عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔اور دوسری بار اس وقت جب وہ ہلکلر گنج بس اسٹینڈ پر کھڑا ال کے کسی کام سے الہ آباد جانے کے لیے بس کا انتظار کر رہا تھا۔اسی وقت اس کی نظر اس لڑکی پر پڑی تھی۔وہ لپک کر اس کے پاس پہنچا تھا اور اس سے وہاں آنے کا مقصد دریافت کیا تھا۔وہ کسی کام سے لکھنو جا رہی تھی۔اس نے خود پہل کرتے ہوئے اس سے پیسے لے کر اُس کے لیے ٹکٹ خرید دیا تھا اور اُس نے اُس کی اس ہمدردی پر اظہار تشکر کیا تھا۔اس بار اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی۔مسعود خاں اس کی اس مسکراہٹ کو بڑی دیر تک محسوس کرتا رہا۔وہ دل کے معاملات سے بے خبر ضرور تھا لیکن تھا تو آخر انسان ہی۔اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس اجنبی لڑکی کی ایک مسکراہٹ نے کیوں اور کیسے اس کے دل کو مسرتوں سے سرشار کر دیا تھا۔اس کے دل ودماغ پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔وہ اس لڑکی کے بارے میں مزید جاننے کا خواہش مند تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کیسے ممکن ہو سکے گا۔اس نے تہیہ کیا کہ جلد،شاید اپنی اگلی ہی ملاقات میں وہ اُس سے اُس کے اور اُس کے افرادِ خاندان کے بارے میں ضرور پوچھے گا۔

دس

اور اس لڑکی سے ملاقات کے لیے مسعود خاں کو زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا۔برسات کا موسم تھا۔وہ اپنی اسکوٹر پر مل سے واپس لوٹ رہا تھا کہ بارش شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا زور کافی بڑھ گیا۔مجبوراً اسے فیئر پیلیس سنیما کے پاس رکنا پڑا۔وہ اس کی پرچھتی کے نیچے کھڑے ہو کر بارش کے رکنے یا کم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔اچانک اس کی نظر سامنے اٹھی تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سڑک کے اس پار تھوڑا ہٹ کر ایک دکان کے سائبان کے نیچے اس کی پڑوسی وہی لڑکی بارش سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔اس کا جی چاہا کہ وہ بھیگتا ہوا سڑک پار کر کے فوراً اس کے پاس پہنچ جائے۔لیکن اسے لگا کہ اس کا یہ عمل مناسب نہیں ہوگا۔نہ خود اس کے لیے اور نہ اس لڑکی کے لیے۔وہ اس طرح

سر راہ دیوانہ وار ملنے پر ناراض بھی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہیں کھڑے ہو کر بارش کے کم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اور بارش تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ جیسے اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اسے اس لڑکی سے ملنے نہ دے گی۔ لیکن مسعود خاں کو اطمینان تھا کہ وہ لڑکی بھی اتنی تیز بارش میں باہر نکل کر جانے کی حماقت نہیں کرے گی۔ بالآخر آدھے گھنٹے کے اذیت ناک انتظار کے بعد بارش کا زور کچھ کم ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اس لڑکی نے بھی اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ جھجکتے ہوئے سڑک پار کر کے اس کے پاس پہنچا۔ اب اس نے دیکھا کہ لڑکی اتنا بھیگ چکی تھی کہ اس کا لباس اس کے بدن کے نقوش واضح کرنے لگا تھا۔ اس کی نظریں اپنے آپ ہی نیچے جھک گئیں۔ وہ لڑکی سردی سے کپکپا رہی تھی۔ اس نے جلدی پاس کھڑے ٹھیلے سے دو گلاس چائے لی اور ایک گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ 'لیجیے، اس سے کچھ راحت ملے گی۔ میرا نام مسعود ہے، مسعود خاں اور میں آپ کا پڑوسی ہوں'۔

اُس نے گلاس پکڑنے میں تامل سے کام نہیں لیا۔ شاید ایسی سردی میں اسے بھی چائے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک گھونٹ لیتے ہوئے وہ بولی۔ 'شکریہ'

مسعود مسکرایا۔ 'آپ کو شکریے کے علاوہ شاید کچھ اور بولنا نہیں آتا'۔

وہ ہنس پڑی۔ اس ہنسی سے اس کے چہرے کی ملاحت میں کچھ اور دلکشی پیدا ہو گئی تھی۔ شاید اسے بھی یہ بات یاد آ گئی تھی کہ اس نے اس سے پہلے بھی دو بار صرف اسی لفظ کا استعمال کیا ہے۔ وہ بولی۔ 'بڑے پر مذاق شخص معلوم ہوتے ہیں آپ، آپ سے مل کر واقعی مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے'۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بولی۔ 'دیکھیے مجھے شکریے کے علاوہ بھی بہت کچھ بولنا آتا ہے۔ ہے نا؟ ویسے میرا نام آپ نہیں آصفہ شبیر ہے اور میں بخوبی جانتی ہوں کہ آپ کا نام مسعود خاں ہے اور آپ میرے پڑوسی ہیں'۔

'ہاں، جانے کیوں مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ آپ کو بولنا ضرور آتا ہوگا'۔ مسعود نے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ اس پر دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ مسعود خاں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے، جس سے ملنے کے خواب وہ پچھلے کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔

'آپ اس وقت کہاں سے آ رہے ہیں اور کس طرف جانے کا ارادہ ہے؟' آصفہ شبیر نے اس طرح پوچھا جیسے وہ اس سے کافی عرصے سے بے تکلف رہی ہو۔ 'میں یہاں سواری کے لیے بڑی دیر

سے پریشان ہوں۔ اور اب تو بارش بھی ہو گئی ہے۔ ایسے میں رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔ اچھی خاصی شام ہو گئی ہے۔ وہاں ماں پریشان ہو رہی ہو گی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ چار بجے تک کسی بھی حالت میں گھر واپس آ جاؤں گی'۔ اس نے ایک ہی سانس میں جلدی جلدی ساری باتیں کہہ ڈالی تھیں۔

'آپ کی رفتار گفتار خاصی سپر فاسٹ ہے'۔ مسعود خاں نے اپنا شوخ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔' برائے مہربانی ذرا بریک لگائیے اور آہستہ آہستہ بولیے'۔ اس نے رک رک کر ایسے کہا جیسے اسے سمجھانا چاہ رہا ہو کہ بات چیت کیسے کی جاتی ہے۔ اس نے کہا۔' میں قریب ہی ایک کاٹن مل میں کام کرتا ہوں۔ ڈیوٹی ختم کر کے اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ ارادہ تو گھر جانے کا ہی تھا۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ وہاں کون میرا منتظر ہے، چلا جاؤں گا آرام سے'۔ اس نے گویا آصفہ کو چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

'گھر پر ماں میرا انتظار کر رہی ہو گی'۔ آصفہ واقعی پریشان لگ رہی تھی۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مسعود خاں سے لفٹ لینا چاہتی ہے لیکن اس سے یہ کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہی ہے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بالآخر ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔' کیا آپ مجھے گھر تک لفٹ دے سکتے ہیں'؟

'آف کورس، بڑی خوشی سے'۔ مسعود نے چہکتے ہوئے کہا۔ جیسے اسے منہ مانگی مراد مل گئی تھی۔

اتنی دیر میں ان کی چائے بھی ختم ہو چکی تھی اور اب آسمان کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے بارش ہوئی ہی نہ ہو۔ مسعود سڑک پار کر کے 'نعیر ہیلپس کمپاؤنڈ' سے اپنی اسکوٹر لایا اور اسے پیچھے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ آصفہ بے چون و چرا اسٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مسعود اور اپنے بیچ فاصلہ پیدا کرنے کی غرض سے درمیان میں اپنا بیگ رکھ لیا تھا۔ ادھر مسعود کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے یہ معمولی صورت شکل کی لڑکی دلکش لگنے لگی تھی۔ اس نے اسکوٹر آگے بڑھایا اور پریڈ کے طرف سے چمن گنج کا راستہ پکڑ لیا۔ وہ معتدل اسپیڈ سے چل رہا تھا کہ کہیں کسی دھکے سے آصفہ کو چھو لینے کی بدمذاقی نہ سرزد ہو جائے۔ حالانکہ اس کا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ یہ غلطی اس سے ہو جائے۔ وہ ابھی اپنی اس ادھیڑ بن میں غلطاں ہی تھا کہ آصفہ نے کہا۔' آپ مجھے حلیم کالج کے چوراہے پر چھوڑ دیجیے گا۔ وہاں سے میں پیدل چلی جاؤں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ محلے پڑوس کے لوگ ہماری دوستی کا کوئی غلط مطلب نکالیں'۔

'بہتر'۔ مسعود خاں جیسے خواب سے چونکتے ہوئے بولا۔ ایک ہی لمحے میں اسے معاملے کی نزاکت کا بھی احساس ہو گیا تھا۔' آپ درست کہہ رہی ہیں محترمہ، ہمارا معاشرہ اس سلسلے میں ابھی نابالغ

ہے۔ وہ اسی بات سے خوش تھا کہ آصفہ نے اس کی اسکوٹر پر بیٹھنا قبول کرلیا ہے۔ اس سے یہ تو ظاہر ہوا ہی تھا کہ وہ اس پر اعتماد کرتی ہے۔

چند ثانیوں بعد ہی حلیم کالج کا چوراہا آ گیا۔ اس نے کالج کے مین گیٹ سے کچھ آگے اسکوٹر روکی اور آصفہ شبیر اتر گئی۔ اس نے کہا۔ 'آپ بڑے مخلص اور ہمدرد انسان ہیں۔ آپ نہیں سمجھ پائیں گے کہ کتنے اہم وقت پر آپ نے میری مدد کی ہے۔ اب میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کروں گی، ورنہ آپ پھر میرا مذاق اڑائیں گے۔ اس کے بدلے آپ کی اس مہربانی کو میں حساب دوستاں میں درج کر لیتی ہوں'۔

'یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ آپ مجھے اپنا دوست تصور کرتی ہیں'۔ مسعود خاں نے کہا۔ اس کا لہجہ شائستہ تھا۔ 'میں نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ آپ سے مل کر مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے میں آپ کو صدیوں سے جانتا ہوں۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خواہش سر ابھار رہی ہے کہ آپ سے بار بار ملوں۔ شاید میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں'۔ اس خوش گوار لمحے کی بوکھلاہٹ میں شاید اسے اس سے بہتر کوئی سبب سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

'ہم پڑوسی ہیں'۔ آصفہ نے کہا۔ 'جان پہچان ہوئی ہے تو ملاقات بھی ہو ہی جائے گی اور بات چیت بھی'۔ اس نے اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ 'اچھا، خدا حافظ، چلتی ہوں'۔

'او کے، خدا حافظ'۔ مسعود بولا اور اسے جاتے ہوئے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ سعید آباد کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ کر آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے اپنی اسکوٹر اسٹارٹ کی اور گھر جانے کے بجائے طلاق محل کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گیا۔ شاید یہ اس کے دل کا چور تھا جو اسے ایک ساتھ گھر پہنچنے سے روک رہا تھا۔ یا شاید اسے یہ لگ رہا تھا کہ ایک ساتھ گھر پہنچنا آصفہ کے حق میں اچھا نہ ہو گا۔

گیارہ

آج پھر اسے بری طرح گھر کی یاد آ رہی تھی۔ یہ پہلی بار نہیں تھا۔ ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا کہ ابھی اچھا خاصا ہنس بول رہا تھا اور ابھی اچانک اداس ہو گیا۔ جب جب اسے گھر کی یاد آتی تو اسے پہلا خیال یہی آتا تھا کہ وہ سب کچھ بھول جائے اور چھٹی لے کر کچھ دنوں کے لیے گھر چلا جائے۔ وہاں اپنے اعزہ وہ

اقارب خصوصاً اکرم خاں سے مل کر اپنا دل ہلکا کر لے۔لیکن پھر اسے وہ عہد یاد آ جاتا جو اس نے گاؤں چھوڑتے وقت کیا تھا۔اپنا عہد اب اسے نا قابل عمل لگنے لگا تھا۔گاؤں والوں کے لیے وہ لا پتہ تھا۔اگر انھیں بھنک بھی مل گئی ہوتی کہ مسعود کان پور میں ہے تو وہ کب کا اسے منا منو کر گاؤں لے گئے ہوتے۔اس دوران اس کے خیالات میں بھی خاصی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔اُسے لگنے لگا تھا کہ جیسے اب اس کا عہد اس کی ترجیحات میں شامل ہی نہیں رہا۔یہی سوچ سوچ کر اس کی شرمندگی عود کر آتی اور وہ گاؤں جانے کے اپنے اس ارادے کو ایک بار پھر اپنے سینے میں دفن کر لیتا۔آج بھی اس کا دل ایسی ہی کشمکش کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔اس کی بے چینی حد سے تجاوز کرتی جا رہی تھی۔وہ سوچ رہا تھا، یہ بھی کوئی زندگی ہے۔مسلسل تنہائی کا عذاب جھیلنا۔کمانا، کھانا اور سو جانا۔وہ معمولات زندگی کی اس یک رنگی سے اکتا چکا تھا۔وہ اپنی زندگی میں کسی مثبت تبدیلی کا خواہاں تھا، جو اسے ایک بار پھر اس کے عہد کی تکمیل کا راستہ دکھا سکے۔اسے لگ رہا تھا کہ اسے کوئی نہ کوئی ایسا کام ضرور کرنا چاہیے جو عظیم ہو۔جس سے بنی نوع انسان کی فلاح کی کوئی سبیل پیدا ہو سکے۔تا کہ اس کے گاؤں کے لوگ جب ان واقعات سے واقف ہوں تو ان کا سینہ فخر سے پھول جائے۔اس کے بعد اس کے گاؤں جانے کا راستہ بھی کھل جائے گا اور اسے ذہنی سکون بھی نصیب ہوگا۔لیکن اس کے لیے وہ کرے کیا، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اسی فکر میں غلطاں وہ اپنے اسکوٹر پر اپنے دوست راکیش جوہری سے ملنے جا رہا تھا۔راکیش سے مل کر ہمیشہ اسے سکون کا احساس ہوتا تھا۔وہ اس کے مسائل کا اچھا سامع بھی تھا اور انھیں بغور سن کر سمجھنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔اس کی تشفی بخش باتوں سے اسے یک گونہ سکون کا احساس ہوتا تھا۔اسی لیے جب جب وہ پریشان ہوتا، اسی کے پاس کھنچا چلا جاتا۔ایک آدھ گھنٹے کی گفتگو کے بعد وہ اپنے معمول پر آ جاتا اور ایک بار پھر زندگی اس کے لیے گوارا بن جاتی تھی۔آج بھی اسے یقین تھا کہ اس کا مداوا راکیش ہی کے پاس ہے۔لیکن مشیت اس کی اس منصوبہ بندی پر قہقہے لگا رہی تھی۔اس کا منصوبہ کچھ اور تھا۔مسعود خاں کو نہیں معلوم تھا کہ وہ عنقریب کتنی بڑی آزمائش میں مبتلا ہونے والا ہے۔

ابھی وہ نرائن ٹاکیز کے پاس پہنچا ہی تھا کہ سامنے سڑک پر ایک زبردست دھماکا ہوا۔ایسا دھماکا کہ جیسے کان کے پردے پھٹ گئے ہوں۔اس وقت شام کے ساڑھے چھ بجے تھے اور فلم ابھی ابھی چھوٹی تھی۔جہاں یہ بم پھٹا تھا وہاں لوگوں کا اژدہام تھا۔اچانک ماحول میں انسانی چیخوں کا ایک

سیلاب امنڈ پڑا تھا اور بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ جس کے جدھر سینگ سمارہے تھے، بھاگ رہا تھا۔ مسعود نے بھی اپنا اسکوٹر موڑا اور مخالف سمت میں اپنی رفتار تیز کر دی۔ ابھی وہ کچھ دور ہی گیا تھا کہ اسے لگا کہ وہ مظلوم انسانیت کی مدد سے منھ موڑ کر بھاگ رہا ہے۔ اس کا دل اسے ملامت کرنے لگا۔ اور اس نے اپنے اسکوٹر کا رخ پھر اسی جانب موڑ دیا جہاں بم دھماکے کا حادثہ پیش آیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنا اسکوٹر ایک طرف کھڑا کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ اب وہاں پولیس کے کچھ لوگ بھی آچکے ہیں۔ قریب ہی ایک ایمبولینس بھی موجود تھی اور کچھ لوگ زخمیوں کو اس ایمبولینس تک پہنچانے میں پولیس کی مدد کر رہے ہیں۔ وہ بھی تقریباً دوڑتے ہوئے جائے حادثہ کی جانب لپکا، تاکہ وہ بھی کچھ خدمت انجام دے سکے۔

ابھی وہ بھیڑ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ایک آدمی چیخ چیخ کر اس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ 'یہی ہے، یہی ہے، جس نے بم پھینکا ہے'۔

وہ ہکا بکا حیران سا اس شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی وقت دو پولیس والے اس کی طرف آئے اور اسے گھیرے میں لے لیا۔ مسعود کو وہ شخص کچھ شناسا معلوم ہوا جس نے اس کی طرف اشارہ کر کے اس پر بم پھینکنے کا الزام لگایا تھا۔ اسے لگا کہ اس نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ لیکن کہاں؟ اسے یہ بات فوری طور پر یاد نہیں آئی۔ اس نے نہایت نرم لہجے میں ان پولیس والوں سے کہا' میں اپنے ایک دوست سے ملاقات کے لیے جا رہا تھا۔ اچانک یہ حادثہ رونما ہوا، اور میں لوگوں کی مدد کے لیے اس جانب دوڑ پڑا۔ دیکھیے میرا اسکوٹر وہاں کھڑا ہے'۔

'تم کو پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا'۔ اس کے دائیں جانب کھڑے پولیس والے نے نہایت ترش لہجے میں کہا' اپنی صفائی میں تمھیں جو بھی کہنا ہے، وہیں چل کر کہنا۔۔۔ آیا سمجھ میں یا سونپ دیں تمھیں بھیڑ کے ہاتھ میں، کہ وہ لوگ تمھاری تکا بوٹی کر کے کھا جائیں'۔

'سالے مسلمان'۔ دوسرے پولیس والے نے اس کے سر پر ایک دھپ لگاتے ہوئے اپنے دل کا غبار نکالا۔ شاید اس کی زبان سن کر اس نے اس کے مسلمان ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ 'بک بک کیے جا رہا ہے۔ کوئی اور کام نہیں ہے کیا تم مسلمانوں کے پاس؟ کیوں ہمیشہ لوگوں کی جان کے پیچھے پڑے رہتے ہو؟ کیا ملتا ہے تمھیں کسی کی جان لے کر؟'

'میں ایسا کیوں کروں گا'۔ مسعود خاں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ اب وہ اس ناگہانی مصیبت

سے بری طرح گھبرا گیا تھا۔ میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں کہ میں اپنے دوست سے ملنے جا رہا تھا۔ راستے میں یہ بم دھما کا ہوتے دیکھا تو زخمیوں کی مدد کے لیے رک گیا۔ بس یہی قصور ہے میرا۔'

'اب تمھارا قصور کیا ہے یہ تو تم ہی جانو۔' ایک نے کہا۔ 'تم نے سنا نہیں کہ یہاں کچھ لوگوں نے تمھیں بم پھینکتے ہوئے دیکھا ہے۔'

'جھوٹ بولتے ہیں وہ۔' مسعود کا لہجہ اب قدرے ترش ہونے لگا تھا۔ اس میں کسی حد تک غصے کی آمیزش بھی تھی۔

'ہاں سچ بولنے کا ٹھیکا تو صرف تمھارے پاس ہے۔' ان میں سے ایک بولا۔ لہجہ اس کا بھی طنز آمیز اور تلخ تھا۔ 'ویسے جھوٹ سچ طے کرنا عدالت کا کام ہے۔ ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ تمام ثبوت اکٹھا کر کے ہم ملزم کو عدالت تک پہنچا دیں۔'

مسعود کی سمجھ میں آ گیا کہ ان لوگوں سے بحث فضول ہے۔ اسے احساس ہوا کہ کوئی ہے جو اسے اس معاملے میں پھنسانے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اسے پولیس کی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا گیا تو وہ بے چون وچرا جا کر بیٹھ گیا۔ اسے اچانک یاد آیا کہ جس شخص نے اس پر بم پھینکنے کا الزام عائد کیا تھا وہ وہی شخص تھا جس نے چھ سال پہلے مہیش رائے کے کارخانے میں اس پر گولی چلائی تھی۔ اب معاملہ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس کی خواہش ہوئی کہ اس کی اس مصیبت کی اطلاع کسی طرح اس کے شناسا لوگوں، خاص طور پر راکیش کو ہو جائے تاکہ وہ مصیبت کی اس گھڑی میں اس کی کچھ مدد کر سکیں۔ اسی بیچ گاڑی تھانے پہنچ چکی تھی۔ اسے اُتار کر تقریباً دھکا دیتے ہوئے اندر لے جایا گیا اور بغیر کچھ کہے سنے سیدھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس کی زندگی میں کبھی ایسا وقت نہیں آیا تھا کہ وہ تھانے کچہری کے بارے میں کچھ جانتا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر اس نے ہمت جٹائی اور وہاں موجود ایک پولیس جوان سے کہا کہ وہ اپنے دوست کو فون کرنا چاہتا ہے تو اس نے جواب میں اسے ایک بھدی سی گالی دیتے ہوئے کہا کہ الو کے پٹھے! تھانے میں ملزموں کو فون کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی گھبراہٹ میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ تھانے میں لوگوں کو کیسی کیسی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ اسی لیے وہ آنے والے وقت کے دہشت ناک تصور سے لرزاں خاموشی سے وہیں فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ تقریباً دو گھنٹے

بعد ایک سب انسپکٹر نے حوالات کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوتے ہوئے دھمکی دینے والے انداز میں قدرے نرمی کے ساتھ بولا۔ 'نوجوان! تمھارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ تم اپنے جرم کا اعتراف کرلو۔ اس سے تم بہت سی پریشانیوں سے بچ جاؤ گے۔ ورنہ ہمارے پاس ایسے طریقے بھی ہیں جس سے گونگے بھی بولنے لگتے ہیں'۔

'میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے، سر'۔ اس نے جواب میں کہا۔

'ہم لوگوں کو ایسی باتوں کا خاصا تجربہ ہے۔ یہاں آنے والا ہر شخص شروع میں یہی کہتا ہے'۔ سب انسپکٹر نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ 'لیکن رفتہ رفتہ ہم اپنا طریقہ استعمال کرتے ہیں اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجاتا ہے'۔

یہ سن کر اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ اسے ان لوگوں سے کچھ کہنا حماقت لگا۔ اسے احساس تھا کہ کوئی ہے جو اسے شعوری طور پر پھنسانے کی کوشش کررہا ہے۔ اس سازش میں شاید یہ پولیس والے بھی ملوث ہیں۔ انسپکٹر کہے جارہا تھا۔ 'اور کون کون شامل ہے تمھارے گینگ میں، بتادو۔ بتادوگے تو تمھارے ساتھ کچھ رحم کا سلوک کیا جائے گا، ورنہ اپنے انجام کے تم خود ذمے دار ہوگے'۔

مسعود نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو انسپکٹر کو غصہ آگیا۔ اس نے اس کے جبڑے پر ایسا زوردار مکا رسید کیا کہ وہ زمین پر اوندھے منھ گرا۔ وہ بولا۔ 'یہ تو صرف نمونہ ہے، مسٹر'۔

مسعود اپنا کٹا ہوا جبڑا، جس میں سے خون بہنے لگا تھا، سہلاتے ہوئے کھڑا ہوا لیکن جواب میں کچھ نہیں بولا۔ انسپکٹر نے اپنی کیپ اتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ 'تم اس طرح نہیں کھولو گے اپنی زبان'۔

یہ مسعود کی خوش قسمتی تھی کہ اسی وقت اس کا دوست راکیش جوہری ایک وکیل کو ساتھ لیے تھانے میں داخل ہوا۔ اس کے وکیل نے انسپکٹر سے کہا۔ 'میں اس ملزم کا وکیل ہوں اور اس شخص کی ضمانت کے لیے آیا ہوں۔ یہ ایک شریف آدمی ہے۔ اسے رہا کردیا جائے'۔

'وکیل صاحب'۔ انسپکٹر نے کہا۔ 'یہ آتنک واد کا کیس ہے۔ تین لوگ مرگئے ہیں اس دھماکے میں اور تیرہ لوگ اسپتال میں زندگی سے جوجھ رہے ہیں۔ اسے بم پھینکتے ہوئے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور آپ کہتے ہیں یہ ایک شریف آدمی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کام اس نے اکیلے نہیں کیا

ہوگا۔اس کے کچھ اور ساتھی بھی آس پاس رہ رہے ہوں گے۔ وہی پوچھ رہا تھا میں اس سے کہ یہ ان سب کے نام اور پتے بتا دے تو ہم اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کریں گے۔لیکن یہ سنتا ہی نہیں۔اور وکیل صاحب یہ تو آپ کو جاننا چاہیے تھا کہ ایسے کیس کی ضمانت تھانے سے نہیں،عدالت سے ہوتی ہے'۔ انسپکٹر نے باہر نکل کر حوالات کا دروازہ مقفل کرتے ہوئے کہا۔' ابھی تو آپ کے لیے بہتر یہی ہوگا کہ آپ ہماری تفتیش میں بادھا نہ ڈالیں۔جو کچھ کرنا ہے کل عدالت میں کیجیے گا'۔

'لیکن یہ غیر قانونی ہے کہ آپ ملزم کے ساتھ مار پیٹ کریں'۔وکیل نے کہا۔'دیکھیے آپ نے کس بری طرح اس کی پٹائی کی ہے۔اس کے منھ سے خون بہہ رہا ہے'۔پھر اس نے مسعود کی جانب مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔' آپ گھبرائیں نہیں۔وہ تو اچھا ہوا کہ آپ کے ایک پڑوسی نے آپ کو پولیس کی وین میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا اور اس نے فوراً کیشن جی کو اس کی اطلاع دے دی،ورنہ نہ معلوم یہ لوگ آپ کے ساتھ اور کتنی زیادتی کرتے۔میں اس سلسلے میں ابھی تھانہ انچارج سے بات کرتا ہوں'۔

وکیل اور تھانہ انچارج کے مابین ہونے والی بات بے نتیجہ رہی۔مسعود خاں کے لیے یہ رات حوالات میں گذارنا مقدر ہوا۔ابھی اور بھی نہ جانے کتنی راتیں اسے یہاں یا اسی جیسی کسی اور جگہ گزارنی تھیں۔لیکن وہ اپنے آپ کو آنے والی اذیتوں کے لیے تیار کر چکا تھا۔اسے خدا پر پورا بھروسا تھا۔ویسے بھی مصیبت کے وقت خدا کے علاوہ کس کی یاد آتی ہے۔اسے یقین تھا کہ اس کی بے گناہی ضرور رنگ لائے گی۔

اس کا یہ بھروسا ٹوٹا بھی نہیں۔اسے رہا کیا گیا۔لیکن گرفتاری اور رہائی کے طویل درمیانی وقفے میں اس پر کیا کیا گذری،یہ ایک الگ کہانی ہے۔دوسرے دن پولیس نے عدالت سے اسے ایک ہفتے کے ریمانڈ پر لے لیا تھا۔اس دوران اس پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔لیکن ان سب کے باوجود مسعود کے پائے استحکام میں لغزش نہیں آئی۔وہ شروع سے آخر تک یہی کہتا رہا کہ اس نے یہ جرم نہیں کیا ہے۔بالآخر عدالت کو شواہد کی عدم دستیابی کے سبب اسے رہا کرنا پڑا۔عدالت نے اسے باعزت بری کرتے وقت حسب معمول ایک بے گناہ کو اس طرح گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرنے کے لیے پولیس کو تنبیہ بھی کی۔ان تمام کارروائیوں میں ایک مہینے سے زاید کا وقت صرف ہوا۔اس کی خوش قسمتی یہ رہی کہ اس کے دفتر کے لوگ اور اس کے احباب ہمہ وقت اس کی مدد کے لیے موجود رہے۔

جیسے انھیں مسعود کی بے گناہی کا پورا یقین تھا۔

رہا ہونے کے بعد اس کے احباب نے اپنے اپنے انداز میں خوشیاں منائیں۔ مسعود بھی ان کے جوش وخروش میں برابر کا شریک رہا لیکن اب اس کا انداز فکر پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ ہندوستان میں مذہبی تعصب اور باہمی نفرت کے ساتھ ساتھ جرائم پیشہ لوگوں کی سازشوں کی جڑیں بھی کافی گہری تھیں، اس نے اب اس بات کو خود اپنے تجربے سے جانا تھا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہاں مجرم بے حد طاقت ور ہیں۔ وہ جب چاہیں کسی بے گناہ کو نہ صرف گرفتار کر کے سزا دلا سکتے ہیں، بلکہ انھیں پھانسی کے پھندے تک پہنچا دینا بھی ان کے لیے مشکل نہیں ہے۔ پولیس بھی ان کے ہاتھوں کا کھلونا بن چکی ہے۔ یہ لوگ خود چاہے جو جرم کریں کوئی ان کی طرف نظر اٹھانے والا نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کے سروں پر بڑے بڑے سیاسی نیتاؤں اور سماج کے نام نہاد ٹھیکے داروں کا دست شفقت سایہ فگن رہتا ہے۔ اسے لگنے لگا تھا کہ نفرت اور تعصب کی یہ دیوار گرانا اس کے بوتے کے باہر کی بات ہے۔

بارہ

'اس طرح خوف و دہشت کا ماحول پیدا کر کے انسانوں کی زندگی حرام کر دینے کا یہ سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا رہے گا۔ اب تو یہ بیماری انفرادی کارروائیوں سے ہٹ کر منظم اجتماعی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ بلکہ یہ کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ قومی اور عالمی سطح پر کئی حکومتوں تک کو اپنے دام فریب میں لے چکی ہے۔ لائق افسوس اور تشویش ناک بات تو یہ ہے کہ دہشت گردانہ سرگرمیوں میں ملوث ایسی حکومتوں کی سربراہی کا کام خود دنیا کی سب سے بڑی قوت سمجھی جانے والی حکومت انجام دے رہی ہے۔ اسی بے راہ روی اور غلط انداز فکر کا نتیجہ ہے کہ ہماری خوب صورت دنیا رفتہ رفتہ جہنم کا نمونہ بنتی چلی جا رہی ہے'۔ آصف شبیر نے مسعود خاں کو مخاطب کرتے ہوئے گفتگو کا رخ نرائن تا کیز بم دھماکے سے موجودہ عالمی صورت حال کی طرف موڑ دیا تھا۔

بم دھماکے کے الزام میں مسعود خاں کی گرفتاری نے جہاں اسے جسمانی طور پر تکلیف پہنچائی تھی وہیں اس کی روح پر بھی کاری زخم لگائے تھے۔ اس سلسلے میں اسے کافی دنوں جیل میں رہنا پڑا

تھا۔لیکن اس کے لیے اس سے بھی زیادہ اذیت ناک بات یہ تھی کہ اس حادثے نے کان پور کے مسلمانوں کو ایک بار پھر شک کے دائرے میں لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ انتظامیہ کی مستعدی کے باوجود اس دھماکے کے بعد ہونے والی جھڑپوں میں تین لوگ جاں بحق ہو گئے تھے۔ یہ بتانا غیر ضروری ہے کہ یہ تینوں مسلمان تھے۔لوگوں کے کہنے کے مطابق ان میں سے ایک پولیس کی گولی کا شکار ہوا تھا۔عدالت میں بے گناہی ثابت ہو جانے کے بعد اسے رہا ہوئے اب ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور رفتہ رفتہ اس کے زخم مندمل ہونے لگے تھے۔ رہائی کے وقت اسے جو بات سب سے زیادہ پریشان کیے ہوئے تھی وہ یہ تھی کہ اب شاید آصفہ شبیر حوالات میں بند رہنے والے ایک مشکوک کردار کے انسان سے کوئی رشتہ نہ رکھنا چاہے گی۔ اس لیے گھر آنے کے بعد وہ خود ہی اس سے دور دور رہنے لگا تھا۔ آصفہ اس کی اس الجھن کو سمجھ رہی تھی۔ کچھ دنوں انتظار کرنے کے بعد اس نے خود مسعود خاں سے ملاقات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ پولیس کی سازشوں کا اسے خاصا تجربہ ہے اور اس کی گرفتاری نے اس کے اندر کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی نظر میں اب اس کی عزت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ آصفہ کی اس پیش قدمی نے اس کے دل سے سارے خدشات دور کر دیے تھے اور جلد ہی دونوں معمول کی زندگی کی جانب لوٹ آئے تھے۔

'ان ناعاقبت اندیشوں کو سمجھنا چاہیے کہ دباؤ اور دہشت پیدا کر کے مقابل کو شکست دینا اس عہد کی روایت ہے جب انسان ہاتھ پاؤں سے لڑا کرتا تھا' مسعود خاں نے آصفہ شبیر کی بات پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔' اس زمانے میں یہ سلسلہ زیادہ دور تک نہیں جایا کرتا تھا۔ کیونکہ فتح اور شکست کا فیصلہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگا کرتی تھی۔ اور ایک بار یہ فیصلہ ہو جانے کے بعد اکثر دونوں فریق، بہ جبر یا بہ خوشی، اسے تسلیم کر لیا کرتے تھے اور معاملہ ایک طرح سے وہیں ختم ہو جایا کرتا تھا۔ اب سائنس کی گمراہ کن کرشمہ سازیوں، ہلاکت خیز اسلحوں کی نت نئی ایجادوں، جسمانی مشقت پر ذہن کی بالادستی اور مشینوں کی غلامی کے اس دور میں دباؤ اور خوف پیدا کرنے کا یہ عمل ایک ایسے انتہا پسندانہ سلسلے کی ابتدا بن جاتا ہے، جس کی کوئی متعینہ منزل نہیں ہوتی اور جس میں کسی فریق کی دائمی فتح یا دائمی شکست کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اس لیے جب کوئی ایک بار اس عمل کا حصہ بن جاتا ہے تو جبر کی مختلف صورتوں اور مختلف وجوہ کی بنا پر وہ اس سے باہر آنے کا راستہ بھول جاتا ہے۔ اور پھر اس کا نتیجہ بس انسانی جانوں کا زیاں اور مسلسل خون خرابے کی شکل میں نکلتا رہتا ہے۔' مسعود خاں نے، جو آصفہ جیسی سیدھی سادی اور

معصوم سی دکھائی دینے والی لڑکی کی دانش مندانہ اور ذہانت سے بھری ہوئی باتوں پر حیران تھا، اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

آصفہ سے ایک تفصیلی ملاقات کا خواب دیکھتے دیکھتے بالآخر مسعود خاں کو اس کی مثبت تعبیر یعنی وہ دن میسر آ ہی گیا تھا جب وہ آصفہ شبیر کے ساتھ بیٹھ کر نہ صرف اپنے دل کی بات کر رہا تھا بلکہ اس کے خیالات سے مستفید بھی ہو رہا تھا۔ آج دونوں گرین پارک کے پاس واٹر ورکس سے ملحق باغیچے کے ایک سنسان گوشے میں بیٹھے دنیا و مافیہا سے بے خبر گفتگو میں مصروف تھے۔ اگر کوئی انھیں دیکھتا تو شاید یہی سمجھتا کہ وہ بھی آج کل کے بیہودہ عاشق و معشوق کی طرح تنہائی کی تلاش میں یہاں آئے ہوں گے۔ لیکن وہ دنیا والوں کے اس خیال سے بے خبر اپنی باتوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ آصفہ نے کل جب اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو اس نے ملازمت کے لیے اپنی فرض شناسی کے مقابلے میں اس سے ملاقات کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے دوست راکیش جوہری سے آج کے لیے چھٹی کی درخواست بھجوا دی تھی۔ اسے اپنے دیرینہ خواب کے تعبیر سے ہم کنار ہونے پر بے انتہا مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔ دونوں کے درمیان بات چیت کا آغاز کچھ ذاتی نوعیت کی باتوں سے ہوا تھا۔ اس نے آصفہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اس سے یہ کہنے میں بھی تکلف سے کام نہیں لیا تھا کہ وہ اسے بے حد پسند کرتا ہے۔ اور آصفہ نے اس کی اس بات کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی تھی، جسے اس نے اس کی نیم رضامندی تصور کیا۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ ضلع فتح پور کے ایک چھوٹے سے قصبے کوٹ کا رہنے والا ہے۔ اس نے وہ ساری تفصیلات بھی اسے بتائیں جن کی وجہ سے اس نے اپنا گاؤں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے مزید کہا تھا کہ اسے اپنے گاؤں کی بہت یاد آتی ہے لیکن وہ کسی بھی حالت میں اس وقت تک اپنے گاؤں واپس نہیں جائے گا جب تک وہ اپنی منزل مقصود حاصل نہیں کر لیتا۔

مسعود کی بے تکلف باتیں سن کر رفتہ رفتہ آصفہ نے بھی زبان کھولنی شروع کر دی تھی۔ اس نے اُسے بتایا تھا کہ ان کا خاندان مشرقی بنگال اور بہار کے سرحدی علاقے مرشد آباد کا رہنے والا ہے۔ چند برس قبل وہاں ہونے والے ایک ہندو مسلم فساد نے ان کی زندگی تہ و بالا کر دی تھی۔ اس نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس فساد نے صرف اس کے والد کی جان ہی نہیں لی بلکہ اُسے اپنی عصمت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ بات سن کر مسعود کے اندر اس کے لیے حقارت کا جذبہ پیدا ہو جائے گا لیکن وہ

اس کی تمام باتیں نہایت صبر وتحمل سے سن رہا تھا۔ وہ اس حادثے کی جزئیات میں بھی جانا چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر مسعود خاں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اس بات کو ہمیشہ کے لیے بھول جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس واقعے کے بعد جب ان کے قصبے کے لوگوں اور کچھ افراد خاندان نے ان کے کردار پر انگلی اٹھانی شروع کر دی اور اس سے کسی جسم فروش طوائف کی طرح کا سلوک کرنے لگے تو ان دونوں ماں بیٹی نے نہایت خاموشی سے اپنی ساری املاک بہار کے ایک تاجر کو اونے پونے فروخت کر دی اور اس دور دراز شہر میں چلے آئے۔ ان کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ وہ کان پور جیسے شہر میں اپنے لیے کوئی مکان خرید سکتے۔ چنانچہ ایک قدیم شناسا کی مدد سے کرایے کا یہ فلیٹ لے کر رہنے لگے۔

اس نے بتایا کہ ابھی یہاں رہتے ہوئے انھیں کچھ ہی مہینے گذرے تھے کہ اس کی ملاقات اپنی ہی طرح مصائب گرفتہ ایک نوجوان لڑکی وروانہ بہرام سے ہوئی، جس نے اسے ایک ایسا کام دلا دیا جو خود اسے بھی پسند تھا۔ اس طرح اس کے روزگار کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا اور اس کی تباہ حال زندگی کو زندہ رہنے کا ایک مقصد بھی مل گیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی زبان میں کچھ لکنت پیدا ہوئی اور اس نے اپنے کام کی مزید تفصیلات بتانے سے اپنے آپ کو شعوری طور پر روک لیا۔

باتوں کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے وہ بولی۔ 'ہمارے بزرگوں نے ہمیں وراثت میں صالح روایات دی ہیں۔ اگر ہم اپنی سابقہ روایات پر گامزن رہ سکیں اور نیک نیتی کے ساتھ زندگی گذارنے کا عہد کریں تو یہ زندگی ایک بار پھر جنت کا نمونہ بن سکتی ہے۔' آصفہ کی باتوں سے لگ رہا تھا جیسے کسی خاص سبب سے اسے مسعود کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے کی دمک سے بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ مسعود کی باتیں اسے متاثر کر رہی ہیں۔ وہ اس کی ایک ایک بات کو بڑے دھیان سے سن رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ بس وہ بولتا جائے اور وہ سنتی رہے۔ چنانچہ اس خوف سے کہ بات یہیں رک نہ جائے اس نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے آگے کہا۔ 'اب دیکھیے نا، ہمارے بزرگ شعرا نے عشق کو انسانیت کی معراج قرار دیا ہے لیکن ہمارے معاشرے نے اس لفظ کے ساتھ ایسا برا سلوک کیا ہے کہ آج اس کا سرِ عام دہرانا بھی معیوب تصور کیا جانے لگا ہے۔'

'مجھے افسوس ہے محترمہ، کہ میں آپ کی اس بات کی حمایت نہیں کر سکتا کہ بزرگوں کی

روایت پر آنکھ بند کر کے عمل پیرا ہونا چاہیے'۔ مسعود خاں نے اس کی بات سے جزوی اختلاف کرتے ہوئے کہا' کسی بھی بات کو، خواہ وہ وراثت میں ملی اقدار ہوں یا ہماری اپنی فکر کے نتائج عمل میں لانے سے پہلے ہمیں اس نکتے پر بخوبی غور کر لینا چاہیے کہ سماجی روایات آخر ہیں کیا؟ بس یہی نا کہ کسی شے یا عمل میں حسن کی بازیافت اور اس کے بعد اس سے عشق'۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے آصف جیسا سامع اسے زندگی میں پہلے کبھی میسر نہیں آیا تھا۔ کبھی کسی نے اس کی باتیں اتنے غور سے نہیں سنی تھیں۔ اس کے حلقہ احباب میں بھی کوئی ایسا تھا بھی نہیں، جسے اس طرح کی گفتگو میں دلچسپی رہی ہو۔ ان میں سے بیشتر لوگ ایسے تھے جو معاش کے مسائل حل کرنے کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ انھیں ان کی منزل مقصود مل گئی ہے۔ اس نے تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔' دوسری کئی باتوں کی طرح بزرگوں سے ملی ہوئی عشق کی روایات کو بھی ہماری توجہ درکار ہے۔ عشق کا جذبہ اور اس سے متعلق نظریات بھی نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو عشق بنیادی طور پر غلامانہ ذہنیت کا خالق ہے۔ تفریق بھی اس کا لازمی جز ہے۔ اپنے اور پرائے کا فرق پیدا کرنے میں عشق کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ پھر چاہے اس کا اطلاق رشتوں پر کیا جائے چاہے ملک و قوم پر۔' یہ ہمارا ہے' کے ساتھ' یہ ہمارا نہیں ہے' لازم و ملزوم کی طرح خود بہ خود نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ جہاں اپنوں سے محبت کا احساس تقویت پاتا ہے وہیں کہیں نہ کہیں دوسروں سے نفرت کا جذبہ پیدا کرنے میں بھی یہ اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب میں یہ کہتا ہوں کہ' مجھے اپنے وطن سے محبت ہے' تو' مجھے دوسرے ملکوں سے محبت نہیں ہے' کا جذبہ خود بہ خود پروان چڑھنے لگتا ہے۔ دوسروں کی محبت سے دست برداری کا یہ عمل کسی بھی لمحے نفرت میں تبدیل ہو سکتا ہے، جو بہر حال ایک مہلک جذبہ ہے۔ اسی لیے میرا یہ کہنا ہے کہ روایات کی پیروی کی عادت پڑ جانے پر عقل و شعور کا استعمال ثانوی ہو جاتا ہے۔

مسعود خاں اپنی روانی میں بولے چلا جا رہا تھا۔ اس کی نظریں آصف پر نہیں سامنے کی ایک عمارت پر مرکوز تھیں، ورنہ وہ دیکھ لیتا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اور وہ اگر دیکھ بھی لیتا تو شاید ہی سمجھ پاتا کہ ان آنسوؤں کا سبب کیا ہے۔ وہ تو بس اپنی رو میں بولے جا رہا تھا۔' یہ مفروضہ اگر یہاں درست ہے تو اس کا اطلاق ہر سماجی روایت اور عمل پر ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ بات ہی درست

ہے کہ عقل کو بروئے کار لائے بغیر کسی طرح کی روایت کی پیروی اپنے کو غلام بنا لینے کی جانب پہلا قدم ہوتا ہے'۔ اچانک بات کرتے کرتے اس نے اپنی کلائی گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔ 'اوہ، چھ بج گئے۔ ہمیں یہاں کافی دیر ہو گئی۔ اب چلنا چاہیے۔ باقی باتیں پھر کبھی'۔ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

'ہاں، اب ہمیں گھر چلنا چاہیے'۔ آصفہ نے اس کی بات کی تائید کی۔ حالانکہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ گفتگو کا یہ سلسلہ کبھی منقطع ہو۔

دونوں اٹھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور دھیرے دھیرے تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ انھیں لگا کہ وہ گفتگو میں اس درجہ منہمک ہو گئے تھے کہ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ مسعود نے کچھ خفت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ 'معذرت خواہ ہوں، شاید میں آج آپ کی سماعت پر بار بن گیا۔ کیا کروں آپ نے موضوع ہی ایسا چھیڑ دیا تھا کہ مجھے بولنا پڑا'۔ اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد آگے کہا۔ 'اب دیکھیے تا وہاں گھر میں آپ کی والدہ پریشان ہو کر آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی اور یہاں میں آپ کو مسلسل بور کرنے میں مصروف رہا۔ چلیے اب ہمیں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رکنا چاہیے'۔

'نہیں مسعود صاحب، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ماں سے بتا کر گھر سے نکلی تھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اپنی ماں سے کوئی بات چھپاتی ہی نہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں'۔ آصفہ نے اس کے چہرے پر پریشانی کے نقوش دیکھ کر کہا۔ 'ہاں کچھ دیر ضرور ہو گئی ہے، اس لیے اب ہمیں چلنا چاہیے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ جو باتیں میں آپ سے کرنا چاہتی تھی اس کی نوبت ہی نہیں آ پائی۔ آپ کی باتیں اتنی دلچسپ اور متاثر کن تھیں کہ میں اپنے ہوش و حواس ہی میں نہیں تھی۔ آپ جیسے مفکر اور ذہین انسان سے مل کر مجھے واقعی فخر کا احساس ہو رہا ہے'۔ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے اپنے دل کی بات کہی۔ 'مسعود صاحب اگر آپ برا نہ مانیں تو آئندہ مجھے آپ کہہ کر نہ مخاطب کیا کریں، یہ تخاطب مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس سے بیگانگی کی بو آتی ہے اور دیکھیے نا میں آپ سے عمر میں بھی تو چھوٹی ہوں'۔

'مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا آصفہ'۔ اس نے جیسے فوراً ہی اس کی درخواست پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ 'آج تم سے اس طرح مل کر میں بھی جیسے اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ بس تم سے باتیں کرتا رہوں اور یہ باتیں کبھی ختم نہ ہوں۔ اب مجھے شدت سے

اس بات کا بھی احساس ہو رہا ہے کہ میں نے تم کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا'۔

'نہیں مسعود، اس طرح اپنی شرمندگی کا اظہار کر کے مجھے شرمندہ نہ کرو۔ ہم اب دوست ہیں تو ہمارے درمیان تکلفات کا کیا کام'۔ آصفہ نے ایک لمحے میں جیسے کچھ فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے کہا۔ 'مسعود، تمھیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے خیالات ہمارے وطن ہندوستان اور اس دنیا کے لیے کتنے کام کے ہیں۔ تم کسی ایسے ادارے سے کیوں منسلک نہیں ہو جاتے جہاں تمھارے ان خیالات کی قدر ہو اور جس کے پاس انھیں عام کرنے اور انھیں عملی جامہ پہنانے کے وسائل ہوں'۔

یہ سن کر مسعود جیسے چونک گیا۔ یہی تو اس کی آرزو تھی۔ اس نے کہا۔ 'آصفہ، تم نے اس وقت میرے دل کی بات کہہ دی۔ یہ تو میری دیرینہ خواہش ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ اس کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں ان لوگوں کو کیسے تلاش کروں جو اس طرح کے فلاحی کاموں میں مصروف ہیں'۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ 'روزی روٹی کی فکر نے دراصل مجھے مہلت ہی نہ دی کہ میں ان لوگوں کو تلاش کرتا۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتی ہو؟'

'ہاں'۔ آصفہ نے مختصراً کہا۔ 'مناسب وقت پر ہم اس سلسلے میں مزید گفتگو کریں گے۔ اب ہمیں گھر چلنا چاہیے'۔

'بے شک'۔ یہ کہہ کر وہ باغیچے سے باہر نکلے اور مسعود خاں کے اسکوٹر کے پاس آ گئے، جو گرین پارک کے اسٹینڈ پر کھڑا تھا۔ اس نے اسکوٹر نکال کر اسٹارٹ کیا اور اسے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ راستے میں آصفہ نے کہا۔ 'مسعود آج تم مجھے گھر تک ہی لے کر چلو ساتھ میں۔ آج میں تمھیں اپنی ماں سے ملوانا چاہتی ہوں۔ اگر تمھیں کوئی اعتراض نہ ہو تو'۔

'بھلا اس میں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہ تو میرے لیے عین سعادت کی بات ہوگی'۔ مسعود نے جواب دیا۔ 'مجھے ان سے مل کر واقعی خوشی ہوگی'۔

وہ نسیم آباد سے گھوسیانے کا موڑ مڑ رہے تھے۔ تبھی نہ جانے کیا سوچ کر آصفہ نے کہا۔ 'مجھے یہیں چھوڑ دو مسعود، تم گھر پہنچ کر نیچے ہی میرا انتظار کرنا۔ ہم ساتھ ساتھ ماں کے پاس چلیں گے'۔ شاید اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

'آصفہ، تم ہمت ہار رہی ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ جب تم نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ ہم

لوگ ساتھ ساتھ گھر چلیں گے تو ہمیں ساتھ ساتھ ہی چلنا چاہیے۔ پھر اس کا نتیجہ چاہے جو نکلے۔ اگر اس میں کوئی قباحت تھی تو یہ بات ہمیں فیصلہ کرنے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی' ۔اس نے اسکوٹر نہیں روکا۔

'مسعود، جنس مخالف کے دو لوگوں کا آپس میں ملنا آج بھی ہمارے سماج کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ حالانکہ یوں تو کہنے کو ہمارا عہد بڑا روشن خیال ہے۔لیکن کسی عورت کی کسی مرد سے دوستی کا اب بھی صرف ایک ہی مطلب لیا جاتا ہے'۔ آصفہ نے دلیل دی۔

مسعود نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا' یہ بات میں جانتا ہوں۔لیکن ایک نہ ایک دن تو ہم دونوں کو اس احمق سماج کے سامنے آنا ہی ہوگا۔ تو آج ہی کیوں نہیں'۔

آصفہ نے ہتھیار ڈالتے ہوئے بڑی بیچارگی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ پانے سے قاصر تھی۔ لیکن وہ سچ مچ بری طرح گھبرا رہی تھی۔ اتنی دیر میں وہ گھر کے پاس پہنچ چکے تھے۔ مسعود نے اسکوٹر برآمدے میں کھڑا کر کے لاک کیا اور اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اپنے فلیٹ کے پاس پہنچ کر آصفہ نے کال بیل بجائی اور فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ جیسے اس کی ماں دروازے کے پاس ہی کھڑی اس کی منتظر تھی۔ آصفہ نے مسعود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی ماں سے کہا' یہ مسعود خاں ہیں، میرے دوست۔ پڑوسی کی حیثیت سے تو آپ انھیں جانتی ہی ہیں'۔

ماں کے چہرے پر کچھ ناگواری کے نقوش نمایاں ہوئے لیکن فوراً ہی انھوں نے نہایت گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نئے مہمان کو خوش آمدید کہا اور اندر آ کر صوفے پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

مسعود نے دیکھا کہ ڈرائنگ روم بہت سلیقے سے سجایا گیا ہے۔ آرائشی ساز و سامان بھی خاصا قیمتی معلوم ہو رہا تھا۔ دیوار پر میر، غالب، اقبال، قاضی نذرالاسلام اور ٹیگور کی تصاویر دیکھ کر اسے آصفہ کے ذوق کو سمجھنے میں مزید مدد ملی۔ اسے یہ دیکھ کر قدرے خوشی ہوئی کہ اسے شعر و ادب سے بھی رغبت ہے اور اس کا یہ شوق خود اس کے شوق سے مماثلت رکھتا ہے۔ لیکن ڈرائنگ روم کی آرائش دیکھ کر وہ کچھ متفکر ضرور ہو گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ آصفہ کی آمدنی اس کی توقعات سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ آصفہ شبیر آخر کرتی کیا ہوگی؟

'آپ چائے لینا پسند کریں گے یا کافی'؟ یہ آصفہ کی ماں نے پوچھا تھا۔

'میں تو چائے ہی پیتا ہوں، لیکن آج کافی پیوں گا'۔ مسعود جیسے ہوش وحواس سے عاری ہو کر کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے یہ بات بغیر کچھ سوچے سمجھے کہی تھی۔

'ویری گڈ' آصفہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔' یہ بے تکلفی مجھے اچھی لگی'۔

اس کی ماں باورچی خانے میں چلی گئی اور وہ خود آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

تیرہ

صبح کے چار بجے تھے۔ فجر کی اذان ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ یہ وقت لوگوں کی گہری نیند کا ہوتا ہے لیکن آصفہ شبیر جاگ رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کی ماں بھی۔ وہ دونوں بڑی بیتابی سے بار بار کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ باہر کی گہری تاریکی میں آسمان میں روشن تاروں کے قمقمے مدھم روشنی پیدا کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ان دونوں کو کسی کا انتظار ہے۔ بالآخر آصفہ کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فوراً بلا تاخیر جواب دیا۔' بنت البشر بالکل تیار ہے امیر'۔

'بہت خوب، یہ تمھاری فرض شناسی کی دلیل ہے کہ تم پہلے سے جاگ رہی ہو۔ گاڑی تمھارے فلیٹ کے نیچے پہنچ چکی ہے'۔

'میں فوراً نیچے اتر رہی ہوں'۔ آصفہ نے جواب دیا اور موبائل بند کر کے تیزی سے زینے کی طرف چلی۔

' آصفہ ذرا ہوشیاری سے کام لینا'۔ یہ آواز اس کی ماں کی تھی جو اس کے ساتھ ساتھ زینے تک آ گئی تھی۔' خدا تمھاری مدد کرے'۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

'ماں، تم میری فکر نہ کیا کرو۔ مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔ تمھاری دعائیں ہمیشہ مجھ پر سایہ فگن رہتی ہیں، وہ آج بھی میری مدد کریں گی'۔ آصفہ نے اپنی ماں کو تسلی دینے والے انداز میں کہا۔' پھر یہ تو اللہ کا کام ہے ماں، وہ ضرور میری مدد کرے گا'۔ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے زینے اتر گئی۔

کان پور کی ویران سڑکوں پر سناٹا پسرا ہوا تھا لیکن آصفہ بے خوف و ہراس دو اجنبی لوگوں کے ساتھ، جن میں سے ایک گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا، ایک بند گاڑی میں بیٹھ کر اپنی منزل مقصود کی جانب روانہ ہو چکی تھی۔ کار کا ڈرائیور بڑی مہارت کے ساتھ کان پور کی پر پیچ خالی سڑکوں پر مخصوص ...

آواز کا رووڑائے لیے جا رہا تھا۔ اس نے صرف دس منٹ میں یہ فاصلہ طے کر لیا تھا اور اب اس نے مسلن روڈ پر مچھلی بازار کے پاس کار روک دی تھی۔ وہ کار سے اتری اور بساط خانہ بازار کی ایک گلی کے اندر داخل ہو گئی۔ ڈرائیور اور دوسرا شخص اس کے دونوں طرف ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ قدیم طرز کے ایک رہائشی مکان کے کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہوئی اور وہ دونوں باہر ہی رک گئے۔ آصفہ اس طرح چل رہی تھی جیسے وہ اس مکان کے جغرافیے سے بخوبی واقف ہو۔ راہداری کو پار کر کے وہ ایک بڑے کمرے کے دروازے پر پہنچی۔ دروازہ اپنے آپ ہی کھل گیا تھا اور دروازے پر کھڑے شخص نے اس کے اندر داخل ہوتے ہی باہر نکل کر دروازہ مقفل کر دیا۔ اس نے سامنے نیم تاریک کمرے میں کرسی پر بیٹھے شخص کو مخاطب کیا۔ 'بنت البشر حاضر ہے، امیر۔'

وہ شخص جسے آصفہ نے امیر کہہ کر مخاطب کیا تھا، کرسی سے اٹھا اور بجلی کا بٹن آن کر دیا۔ کمرے میں کم واٹ کے سی ایف ایل کی مدھم روشنی پھیل گئی۔ اب اس کا چہرا واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ اس نے آصفہ کی طرف غور سے دیکھا اور اپنے فطری کرخت لہجے کو قدرے نرم کرتے ہوئے بولا۔ 'مجھے امید ہے کہ یہاں آنے میں بنت البشر کو کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی ہو گی؟'

'نہیں امیر۔'

'رپورٹ دو۔'

'بنت البشر اپنی مہم میں پوری طرح کامیاب ہے امیر۔' آصفہ نے کہا۔ 'کل شام میں اس نوجوان سے دوسری بار ملی اور نہایت تفصیل سے اس کے خیالات جاننے کی کوشش کی۔ ہمارے لیے یہ بات مسرور کن ہے کہ وہ بغیر کسی کاوش کے خود ہی ہماری تنظیم میں شامل ہونے کا خواہش مند ہے۔'

'تفصیل؟' اس شخص نے، جسے آصفہ امیر کہہ کر مخاطب کر رہی تھی، خشک لہجے میں پوچھا۔

'بنت البشر نے امیر کے حکم کے عین مطابق منتخب نوجوان مسعود خاں سے دو ملاقاتیں کیں۔ پہلی ملاقات کا سبب برسات کو بنایا گیا تا کہ اسے اندیشہ نہ ہو کہ میں نے کسی خاص مقصد کے تحت اس سے ملاقات کی ہے۔ اس ملاقات سے خاطر خواہ کامیابی ملی اور وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا، بالکل ویسے ہی جیسے کوئی بھی نوجوان لڑکا کسی لڑکی سے مل کر خوش ہو سکتا ہے۔ اس درمیان وہ مسلم دشمن عناصر کی ایک سازش کا شکار ہو کر کچھ دنوں حوالات میں بند رہا۔ بالآخر وافر ثبوت نہ ہونے کی وجہ

سے عدالت نے اسے باعزت بری کر دیا۔ اس کی رہائی کے کچھ دنوں بعد کل میں نے گرین پارک کے پاس ایک محفوظ گوشے میں اس سے دوسری ملاقات کی۔ اس ملاقات میں مسلسل تین گھنٹے ہماری بات چیت ہوئی۔ اس سے گفتگو کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ملک وقوم کا سچا بہی خواہ ہے۔ ذہین ہے، ایمان دار ہے۔ اسے ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی حالت زار پر تشویش ہے اور اس کے اندر ان کے لیے کچھ کرنے کا شدید جذبہ ہے۔ جب میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی ایسے ادارے سے منسلک کیوں نہیں ہو جاتا، جو اس کے اس جذبے کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے، تو وہ بولا کہ اسے وہ طریقہ نہیں معلوم کہ ان سے کس طرح رابطہ کیا جا سکتا ہے۔' آصفہ نے ایک نظر کمرے کے طول وعرض پر ڈالی، پھر بولی۔' امیر پسند فرمائیں تو اب اس نوجوان سے ملاقات کر سکتے ہیں'۔

'اس کے سابقہ ریکارڈ میں کسی اونچ نیچ کا اندیشہ؟'

'مجھے اس طرح کا کوئی شبہ نہیں ہوا' ۔ آصفہ نے کہا۔

'بہت خوب'۔ امیر نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔' بنت البشر کو جلد ہی امیر کے آئندہ فیصلے کی اطلاع مل جائے گی'۔ وہ شخص آصفہ سے بات کرتے ہوئے کمرے میں چہل قدمی بھی کرتا جا رہا تھا۔ اس نے مزید کہا۔' میں امیر البشر سے سفارش کروں گا کہ وہ بنت البشر کو مرکزی مجلس میں شامل کر کے کوئی اہم ذمہ داری تفویض کرے'۔

'یہ امیر کی خورد پروری اور ذرہ نوازی ہوگی'۔

'اللہ قہار'۔ امیر نے نعرہ بلند کیا۔ یہ اشارہ تھا کہ اب وہ یہاں سے چلی جائے۔

'حرکت البشر پائندہ باد'۔ آصفہ نے کہا۔

بیرونی دروازہ دوبارہ کھلا۔ وہی دربان، جو اس کے اندر داخل ہوتے وقت باہر نکل گیا تھا، اندر آیا اور نہایت ادب سے اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ آصفہ پیچھے مڑی اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل آئی۔ عمارت سے باہر نکلتے ہی اسے وہ دونوں شخص مل گئے، جن کے ساتھ وہ اپنے گھر سے یہاں آئی تھی۔ انھوں نے اس کے دونوں جانب اپنا مورچہ سنبھال لیا اور گلی سے گذرتے ہوئے اسے سڑک پر کھڑی کار تک لے آئے۔ وہ کار میں بیٹھ ہی رہی تھی کہ مچھلی بازار کی تاریخی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہوئی۔ 'اللہ اکبر، اللہ اکبر' آصفہ نے اپنے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے زیر لب اذان کے الفاظ

دہرائے۔ اس نے اسے تائید غیبی کی طرح سنا اور فال نیک سمجھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے گھر کے راستے پر تھی۔

چودہ

حرکت البشر محبِ وطن ہندوستانی مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تھی جو اس ملک میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ انھیں عزت و وقار کے ساتھ جینے کے وسائل فراہم کرنے کا کام انجام دے رہی تھی۔ اس کے سربراہ احمد عبداللہ الہندی تھے، جن کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ اس جماعت کا خاکہ انھیں کا تیار کیا ہوا تھا۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے چند قریبی احباب کی مدد سے یہ کام شروع کیا تھا لیکن اب ان کے معاونوں، رضاکاروں اور کارکنوں کی تعداد ہزاروں میں تھی جو ہندوستان کے طول عرض میں نہایت جاں فشانی، خوش اسلوبی اور تن دہی سے اپنے فرائض منصبی انجام دینے میں مصروف تھے۔ صرف دس برس کے مختصر عرصے میں ہی بشریت کی ان کی اس تحریک کے اچھے نتائج سامنے آنے لگے تھے۔ جس سے ان پر ہندوستانی مسلمانوں کے انحصار اور اعتماد میں اضافہ ہوا تھا۔

اس تنظیم کے چار شعبے تھے۔ ایک شعبہ معاشی مشیر کے سپرد تھا، جسے معین البشر کا خطاب دیا گیا تھا اور 'اللہ رحیم' ان کا علامتی نعرہ متعین تھا، جو وہ ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتے وقت دہرایا کرتے تھے۔ یہ شعبہ اپنے ماتحت کارکنوں کی مدد سے تنظیم کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے مالی وسائل فراہم کرنے کی خدمات انجام دیتا تھا۔ اس کے لیے مختلف النوع لائحۂ عمل اختیار کیے جاتے تھے۔ مثلاً وہ مختلف مسلمان خاندانوں سے نوجوانوں کو ان کی صلاحیت و لیاقت کے مطابق ملازمت دلا کر باہمی طور پر طے شدہ مدت کے لیے بیرون ملک بھیجا کرتے تھے۔ اور ان کی کل آمدنی کا دس فی صد حصہ تحریک بشریت کے لیے طلب کرتے تھے، جس کے لیے وہ بخوشی تیار ہو جایا کرتے تھے۔ مدت پوری ہونے کے بعد انھیں واپس بلا کر دوسرے نوجوانوں کو بھیج دیا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار سے ایک طرف جہاں مسلمان گھروں سے غربت کا خاتمہ ممکن ہو رہا تھا، وہیں دوسری طرف تحریک کے لیے ضروری مالی وسائل کی فراہمی میں مدد ملتی تھی۔ اس کے علاوہ حرکت البشر کے کارکن منتخب تجارت پیشہ ہندوستانی مسلمانوں سے بطور عطیہ ایک طے شدہ ماہانہ رقم پابندی سے قبول کرتے تھے۔ ائمہ مساجد اور مدارس کے اساتذہ سے بھی

انھیں مالی وسائل کی فراہمی میں مدد ملتی تھی۔ اصولی طور پر رقوم کی فراہمی میں کسی طرح کی زور زبردستی کی سخت ممانعت تھی اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے کارکنوں کو سخت اور عبرت ناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ اگر کوئی صاحب ثروت مسلمان تنظیم کی مدد کے لیے تیار نہ ہوتا تو اس سے کسی طرح کی باز پرس یا انتقامی کارروائی نہیں کی جاتی تھی۔ ہاں تنظیم کو متعارف کرا کے اسے آمادہ کرنے کی کوششیں جاری رکھی جاتی تھیں۔ اور اگر وہ اس کے بعد بھی دست تعاون دراز کرنے کو آمادہ نہ ہوتا تو اس سے دوبارہ رابطہ اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیا جاتا جب تک وہ خود ہی اس کے لیے آمادہ نہ ہو جائے۔

دوسرا شعبہ فکری مشیر کی سرکردگی میں تھا جسے حافظ البشر کا خطاب حاصل تھا۔ ان کے کارکنوں کا نعرہ 'اللہ حافظ' تھا۔ اس شعبے کا کام تحریک کے مختلف مسائل پر غور و خوض کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا اور تنظیم کے کام کاج کے لیے لائحہ عمل ترتیب دینا تھا۔ اس کے لیے ہندوستان کے طول و عرض سے مفکرین کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس شعبے کے کارکنوں کے لیے حرکت البشر کا باقاعدہ ملازم ہونا ضروری نہیں تھا۔ یہ معاشرے میں رہ کر عام انسانوں کی طرح ہی اپنی روزمرہ کی زندگی گذارتے تھے۔ اور جب جب تنظیم کو ان کی ضرورت ہوتی، یہ اس کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ ان میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق لوگ شامل تھے۔ سائنس داں تھے، ماہر نفسیات تھے، کالج اور یونی ورسٹی کے اساتذہ تھے، سوشل ورکر تھے، ڈاکٹر تھے۔ غرض وہ تمام لوگ جو اپنے دل میں امت مسلمہ کا درد رکھتے تھے اور فکری سطح پر اس کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کام کرنا چاہتے تھے، اس تحریک میں شامل تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ تنخواہ یافتہ کارکنوں کا ایک عملہ بھی کام کرتا تھا جو اس شعبے کے انتظامی امور دیکھتا تھا۔

تیسرا شعبہ عملی مشیر کے تحت تھا، جسے اسد البشر کہا جاتا تھا۔ ان کا شناختی نعرہ 'اللہ قہار' تھا۔ یہ شعبہ کئی لحاظ سے بہت اہم تھا۔ تنظیم کے مختلف کاموں کو انجام دینا اسی شعبے کی ذمے داری تھی۔ یہ شعبہ پانچ مزید ذیلی شعبوں میں منقسم تھا۔ ایک شعبہ معاشی مجلس عاملہ پر مشتمل تھا جو تنظیم کے اخراجات کا ذمے دار تھا۔ دوسرا شعبہ فکری امور کو روبہ عمل لانے کا ذمے دار تھا۔ تیسرا شعبہ تنظیم میں نو وارد نوجوانوں کی تربیت کے امور کی ذمے داری سنبھالتا تھا اور چوتھا شعبہ عملی مشیر کی معاونت پر فائز تھا۔ ان کی ذمے داریاں پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی تھیں۔ یعنی ان کا کام ہنگامی طور پر پیدا ہو جانے والے مسائل کو دیکھنے کا ہوتا تھا۔ پانچواں ذیلی شعبہ اپنے کارکنوں کی مدد سے ملک کے طول و عرض میں ایسے نوجوانوں کی تلاش پر مامور تھا جو اپنی

صلاحیتوں کو تنظیم کے لیے وقف کرنے کو تیار ہوں۔ان ذیلی شعبوں کے اپنے اپنے سربراہ تھے۔اپنے اپنے خطابات تھے۔اپنے اپنے شناختی نعرے تھے۔اور یہ سب عملی مشیر اسد البشر کے ماتحت کام کرتے تھے۔

ایک اور اہم شعبہ تحریک کی خفیہ سرگرمیوں کی ذمے داری سنبھالتا تھا۔اس کے کارکن خفیہ طور پر شعبہ فکر و عمل کے لیے وہ تمام اطلاعات فراہم کرتے تھے جو تحریک اور ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد میں ہوں۔یہ لوگ ہندوستان بھر میں پھیلی مسلم تنظیموں سے بھی رابطہ رکھتے تھے اور ان کے ذریعے وقت کی رفتار پر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔اس شعبے کی سربراہی ستار البشر کے ذمے تھے اور اس کے کارکنوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔

ذیلی شعبوں کے تمام سربراہ امیر البشر احمد عبداللہ الہندی کے ماتحت اپنے اپنے فرائض منصبی کو انجام دیتے تھے۔امیر البشر کے لیے 'اللہ جلیل کا نعرہ متعین تھا۔

یہ تنظیم اپنے کسی کام کے لیے بیرونی ممالک سے کسی طرح کی راست امداد سے گریز کرتی تھی۔اس کے ارکان عام طور پر کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے تھے۔اگرچہ مسلمانوں اور سماج کے دشمنوں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچانا اس تنظیم کے مقاصد کا ایک حصہ تھا لیکن اس کے لیے وہ ترجیحا مجرمین کی شناخت کر کے انھیں قانون کے حوالے کرنے کو اہمیت دیتے تھے۔اور اگر انھیں کبھی قانون کو ہاتھ میں لینے کی مجبوری لاحق ہوتی تھی تو اس کی اطلاع امیر البشر کو دی جاتی تھی اور اس سلسلے میں ان کا فیصلہ آخری اور حتمی ہوتا تھا۔پھر یا تو ایسے شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا یا پھر دوسرے ذرائع سے اسے اپنے قبیح اعمال سے باز رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔لیکن چند در چند وجوہ کی بنا پر یہ تحریک اپنے سارے کام خفیہ طور پر انجام دیا کرتی تھی۔

پندرہ

وہ کلیم لکھنوی ہی تھا۔ضرغام حیدر کلیم لکھنوی۔مسعود خاں نے کئی سال پہلے اسے فتح پور کے ایک مشاعرے میں شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتے دیکھا تھا۔وہ اس کے باغیانہ لہجے کا مداح بھی تھا اور اب بھی اس کے کئی اشعار اسے زبانی یاد تھے،جنھیں اکثر مواقع پر وہ استعمال بھی کرتا رہتا تھا۔اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ جس شخص سے وہ ملنے جا رہا ہے وہ ضرغام حیدر جیسا کوئی شاعر ہوگا۔شاعر

کے دل کی ایک نرم اور سبک سی تصویر اس کے دماغ میں تھی، جس کے اس طرح کے عملی میدان میں سرگرم ہونے کا وہ تصور نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس کا یہ خیال آج غلط ثابت ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس کا محبوب شاعر اس کے سامنے تھا۔ شاعر کی حیثیت سے نہیں ایک فلاحی تنظیم کے امیر کی حیثیت سے۔ اور آج وہ اسی امیر کے سامنے اس تنظیم میں شمولیت کی درخواست لے کر حاضر ہوا تھا۔

ابھی کل ہی کی تو بات تھی، جب وہ اپنے کام سے واپس آکر روز کی طرح اپنے فلیٹ پر پہنچا تو دروازے کے پاس اسے ایک لفافہ پڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس کا نصف سے کچھ کم حصہ دروازے کے باہر نکلا ہوا تھا۔ وہ چونکا۔ بھلا اس کی یاد کسے آگئی۔ اس کا پتہ کسی کو کیسے مل گیا۔ کیا یہ خط اس کے گاؤں سے آیا ہوگا۔ پہلا خیال اسے یہی آیا۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ گاؤں میں اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ پھر بھلا وہاں سے خط کیسے آسکتا تھا۔ اس نے لفافہ اٹھایا تو اس پر نہ ڈاک کی کوئی مہر تھی اور نہ اس کا نام اور پتہ۔ لفافہ بالکل سادہ تھا۔ اس نے اسے جلدی جلدی کھولا۔ اندر سے ایک مطبوعہ پمفلٹ برآمد ہوا، جس کے سرورق پر حرکت البشر چھپا تھا۔ اس میں تاریخ آج ہی کی پڑی ہوئی تھی، جسے ہاتھ سے لکھا گیا تھا۔ باقی ساری تحریر مطبوعہ تھی۔ نیچے سبز روشنائی میں کسی کے دستخط تھے۔ اس نے نہایت بے صبری سے جلدی جلدی اسے پڑھنا شروع کیا اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھا، حیرت کے سمندر میں غوطے لگاتا رہا۔

یہ حرکت البشر نام کی کسی فلاحی تنظیم میں شمولیت کا دعوت نامہ تھا۔ اس میں کام کرنے کی شرائط اس کے لیے قابل قبول اور معاوضہ دلکش تھا۔ خوشی سے اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ ابھی دو دن قبل ہی آصف شبیر نے اسے کسی فلاحی ادارے سے منسلک ہونے کا مشورہ دیا تھا اور آج یہ لفافہ۔ کیا اس میں اس کا کوئی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ نہیں، اس نے سوچا۔ اس جیسی معصوم لڑکی سے ایسے روابط کی امید نہیں کی جا سکتی۔ پھر بھی دل کے کسی گوشے میں یہ شبہ سر ابھار رہا تھا کہ کہیں یہ سب آصفہ کا ہی کیا دھرا تو نہیں ہے۔ لیکن وہ اپنے اس خیال پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

گرین پارک کے پاس ہونے والی ملاقات کے بعد سے آصفہ اسے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ شاید وہ گھر پر تھی ہی نہیں۔ یا پھر وہ بہت جلدی گھر سے نکل جاتی تھی اور رات دیر گئے واپس آتی تھی۔ اس کا شبہ کچھ اور بے لگام ہوا۔ اسے اس کے گھر کے وہ آرائشی ساز و سامان یاد آئے جنھیں دیکھ کر وہ چونک گیا تھا اور جو اسے اس کی توقع سے کہیں زیادہ قیمتی معلوم ہوئے تھے۔ یہ سب عام اوسط آمدنی سے ممکن نہیں

تھا۔لیکن اس نے پھرخود ہی اپنے خیال کی تردید کی نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔اس جیسی لڑکی کے افعال و کردار پر شبہ کرنا گناہ ہوگا۔وہ ایک مصیبت زدہ لیکن شریف اور مہذب لڑکی ہے۔اس زمانے نے اسے اس کی عمر سے کہیں زیادہ دکھ دیے ہیں۔اس نے اپنے دل میں آنے والے ان برے خیالات کو جھٹک دیا اور پھر اس دعوت نامے کے بارے میں سوچنے لگا۔وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔فیصلہ مشکل تھا۔ایک مستقل ملازمت چھوڑ کر ایک ایسی تنظیم سے وابستہ ہو جانا جس کے بارے میں ابھی وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ وہاں جانے کے بعد وہ اسے پسند نہ آئے اور پھر وہ کسی طرف کا نہ رہے۔یکا یک اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب اپنی ملازمت چھوڑ کر اس تنظیم کے ساتھ ساری زندگی مسلمانوں کی فلاح کے لیے ہی کام کرے گا۔اسے آصفہ کا خیال بھی آیا۔ممکن ہے اس تنظیم سے وابستگی کے بعد اس کا بیرونی معاشرے سے رابطہ باقی نہ رہے۔شاید وہ لوگ اس طرح کے رشتوں کو منظوری نہ دیں۔یعنی اس تنظیم کو قبول کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسے آصفہ شبیر کو بھی خیر باد کہنا پڑے۔اس فیصلے تک پہنچنے کے لیے اسے اپنے دل پر کافی جبر کرنا پڑا لیکن اس نے یہ فیصلہ کر ہی لیا کہ ضرورت پڑی تو وہ اپنی اس دیرینہ خواہش کی تکمیل اور عظیم مقصد کے حصول کے لیے آصفہ کو بھی چھوڑ دے گا۔

اور بالآخر آج وہ اپنی داعی تنظیم حرکت البشر کے مقرر کردہ وقت پر دعوتی رقعے پر تحریر ہدایات کے مطابق کان پور لکھنؤ روڈ کے پانچویں کلومیٹر کے پاس برگد کے درخت کے نیچے کھڑا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ جانے چند لمحوں میں کیا کچھ واقع ہونے والا ہے۔اس کا دل آنے والے ان انجان لمحات کے بارے میں سوچ سوچ کر اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ وہ خود بھی اس کی آواز سن سکتا تھا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔بہ مشکل دس پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ ضرغام حیدر کلیم لکھنوی اپنے چار دوسرے معاونین کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔

'میں حرکت البشر کا علاقائی امیر ہوں'۔ضرغام حیدر بولا۔بات آگے بڑھانے سے پہلے اس نے اللہ قہار کا نعرہ بلند کیا۔

مسعود خاں نے جنگل کے سناٹے میں اس کی اس نعرہ زنی سے کچھ خوف محسوس کیا، لیکن اس نے بولنے کی ہمت کر لی۔'مجھے ٹھیک ایک بجے یہاں آنے کے لیے کہا گیا تھا'۔اس نے کہا۔

'ہاں'۔ضرغام حیدر نے کہا۔'تمھارا نام مسعود خاں ہے، تم فتح پور ضلعے کے قصبہ کوٹ کے

رہنے والے ہو۔ کچھ برسوں پہلے تم اپنے گھر سے اس بنا پر فرار ہو گئے تھے کہ تم ہندوستان کے مسلمانوں کی دگرگوں حالت کو بہتر بنانے کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہاں سے تم سیدھے کان پور چلے آئے تھے۔ یہاں کچھ دنوں ٹھوکریں کھاتے رہے پھر ایک تمباکو کے کارخانے میں ملازمت کی، جو کان پور میں اس کے بعد ہونے والے ایک فساد کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد تم نے اپنی تعلیم کی جانب توجہ دی۔ گاؤں سے چلتے وقت تم نے صرف آٹھویں جماعت تک تعلیم پائی تھی۔ اب تم گریجویٹ ہو اور ایک کاٹن مل میں سپروائزر کی حیثیت سے کام کرتے ہو۔ ضرغام حیدر نے اپنے ترش اور کرخت لہجے میں یہ ساری تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ 'کیا یہ تمام باتیں درست ہیں نوجوان! یا ان میں کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت ہے؟'

ضرغام حیدر کے منھ سے اپنے بارے میں یہ ساری تفصیلات سن کر مسعود خاں حیران ہوا۔ یہ اجنبی اس کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ اس سے اسے اس تنظیم کے وسائل کا کچھ اندازہ ہوا، جس نے اس پر اچھا اثر ڈالا۔ ان باتوں کو سن کر جواب میں اس نے صرف اتنا کہا۔ 'یہ تفصیلات حرف بہ حرف درست ہیں لیکن آپ کو یہ سب کیسے۔۔۔'

'سوالات سے احتراز کرو نوجوان!' ضرغام کی تنبیہ سے مسعود سہم گیا۔' اور جو کہا جا رہا ہے اسے غور سے سنو۔ ہمارے کارکنوں نے تمھارے گاؤں کا دورہ کیا تھا۔ وہاں تم سے متعلق تمام معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو معلوم ہوا کہ تم انسانیت بالخصوص مسلمانوں کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے ایک خوش کردار اور محنتی نوجوان ہو۔ وہاں ہم نے تمھاری خالہ رفیع النسا سے بھی ملاقات کی۔ وہ تم سے ناراض ضرور ہیں لیکن تمھاری تعریف کرتے ان کی زبان نہیں تھکتی۔ وہ اب بھی اپنی بساط بھر تمھاری تلاش میں سرگرداں ہیں۔ تم سے متعلق ضروری معلومات کی فراہمی کے بعد ہمارے حافظ البشر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تمھیں حرکت البشر کی سرپرستی میں انسانیت کی خدمت کا موقع دیا جا سکتا ہے۔'

اس نے اپنی باتوں کو جاری رکھتے ہوئے آگے کہا۔ 'امید ہے کہ تم نے تحریک میں شمولیت کی شرائط کا مطالعہ کر لیا ہوگا۔ پھر بھی ہم انھیں ایک بار اور دہرا دیتے ہیں۔'۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی پشت پر کھڑے شخص کو اشارہ کیا۔

وہ شخص آگے بڑھا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور مسعود خاں کو مخاطب کر کے

اسے پڑھنا شروع کیا۔ اس میں نہایت تفصیل سے حرکت البشر کے اغراض و مقاصد اور اس تحریک میں شمولیت کے بعد ملنے والے دلکش معاوضے کا ذکر تھا۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس تحریک میں شمولیت سے پہلے ہی وہ اچھی طرح سوچ سمجھ لے کہ اسے اس میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں کیونکہ ایک بار اس میں داخل ہو جانے کے بعد یہاں سے واپسی کے تمام راستے بند کر دیے جاتے ہیں۔ اس شخص نے یہ بھی پڑھ کر سنایا کہ شمولیت کے فوراً بعد اسے کان پور چھوڑ دینا ہوگا۔ پہلے اسے ایک آزمائشی مہم سپرد کی جائے گی، جس میں اس کی کارکردگی کی بنیاد پر یہ طے کیا جائے گا کہ اس کے لیے کس شعبے میں کام کرنا مناسب ہوگا۔ اس بات کا تعین ہو جانے کے بعد اسے چھ ماہ کے لیے کسی تربیتی کیمپ میں بھیجا جائے گا۔ ضرغام حیدر کے ساتھ کیمپ کا سربراہ واعظ البشر بھی آیا تھا۔ اب آگے بڑھنے کی اس کی باری تھی۔ اس نے مسعود خاں سے دریافت کیا۔ 'کیا تم سچ مچ ہمارے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتے ہو یا تمھارا یہ فیصلہ کسی بیرونی دباؤ یا کسی مخصوص مجبوری کی وجہ سے ہے؟' اس نے مسعود کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ 'تم چاہو تو آخری فیصلہ کرنے کے لیے ابھی کچھ وقت طلب کر سکتے ہو؟'

'نہیں مجھے اب مزید وقت کی ضرورت نہیں ہے۔' مسعود نے اپنی خوف سے آلودہ بھرائی ہوئی آواز میں، لیکن مکمل خود اعتمادی کے ساتھ کہا۔ 'یہ تو میری دلی خواہش کی تکمیل ہے۔'

'یعنی حرکت البشر میں تمھارے داخلے کی کارروائی اب شروع کی جاسکتی ہے۔' اس نے کہا۔ 'جیسا کہ ابھی تم نے سنا، تنظیم میں داخلے سے پہلے تمھیں ایک آزمائش سے گذرنا ہے۔ اس میں تمھاری کارکردگی کی بنیاد پر یہ طے کیا جائے گا تمھیں کس طرح کا کام سپرد کیا جائے۔'

'میں ہر طرح کی آزمائش کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔' مسعود خاں نے سنجیدگی سے کہا۔

'تو سنو نوجوان، اکابرین تحریک نے طے کیا ہے کہ اس کے لیے تمھیں بنارس جانا ہوگا۔' ضرغام حیدر نے کہا۔ 'یہ بات اچھی طرح یاد رکھنا کہ وہاں تم ہر وقت ہماری نگرانی میں رہو گے۔ اس لیے نہیں کہ ہم تم پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ اس لیے کہ تمھاری کسی غلطی سے تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ آزمائش کی دیگر تفصیلات تمھیں وہاں روانہ ہونے سے پہلے بتادی جائیں گی۔'

'یہ آپ کی عین نوازش اور بندہ پروری ہوگی۔' مسعود نے کہا۔

'تو اپنا اسکوٹر اب یہیں چھوڑ دو۔' ضرغام حیدر نے کہا۔ 'ہمارے آدمی اسے مناسب جگہ پہنچا

دیں گے....اور تم ہمارے ساتھ چلو۔

مسعود خاں کو پہلے تو کچھ جھجک محسوس ہوئی لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ آگے بڑھا اور ان کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ ہو گیا جو فوراً ہی کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔

سولہ

بنارس اپنی رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ آج بھی تر و تازہ تھا۔ دوسرے ہندوستانی شہروں کی طرح یہاں بھی زمانے کے سرد و گرم کا اثر پڑتا رہتا تھا۔ یہ بنیادی طور پر ایک تجارتی شہر تھا، جہاں عام طور پر ہندو اور مسلمان باہم مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے کاروباری روابط انھیں ایک دوسرے سے دور نہیں ہونے دیتے تھے۔ لیکن جب جب یہاں ماحول میں فرقہ وارانہ تناؤ کی تخم ریزی کی جاتی ہے تو یہی روز کے ملنے جلنے والے ہندو مسلمان ایک دوسرے سے خوف زدہ بھی دکھائی دینے لگتے تھے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بھی۔ یہاں آخری ہندو مسلم فساد ہوئے اب ایک دہائی سے زیادہ وقت گذر چکا تھا اور کسی زمانے میں تیوہار کی طرح ہر سال آنے والے فسادات ان کے دل و دماغ سے محو ہونے لگے تھے۔ اب یہاں کے لوگ اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنے کاروبار اور روز مرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ فسادات کے نام ہی سے انھیں چڑھ ہو گئی تھی، کیونکہ جان و مال کے نقصان کے ساتھ ساتھ یہ ان کے کاروبار کو بھی بری طرح متاثر کرتے تھے، جو انھیں کسی صورت گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ حالانکہ کچھ شرپسند عناصر اس شہر کے امن و امان کو برباد کرنے کی کوششیں اب بھی کرتے رہتے تھے۔ لیکن یہاں کے عوام کی قابل تقلید دور بینی اور ہوش مندی کی وجہ سے انھیں منھ کی کھانی پڑتی تھی۔

صبح بنارس کا جاذب نظر اور دلکش حسن اب تاریخ کا حصہ بن چکا تھا۔ سبزے سے لہلہاتا آنند کانن اب کنکریٹ کے جنگل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ شہر کے ٹریفک اور صنعت کاروں کی بے راہ روی نے اس شہر کو بھی اس طرح ہندوستان کے دوسرے آلودہ اور مسموم شہروں کی صف میں کھڑا کر دیا تھا کہ سانس لینا دشوار ہونے لگا تھا۔ گذشتہ چند برسوں میں دہلی اور بمبئی کی طرح یہاں بھی دمے کے مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس شہر کا حسن قدرت کی فیاضی کے زیر سایہ اپنی تاریخی آن بان بچائے رکھنے کی کوشش میں تھا۔ لوگ اب بھی علی الصباح گنگا کنارے طلوع آفتاب کا منظر دیکھنے جاتے

تھے، جواب بھی لوگوں کو اپنے جاذب نظر حسن سے محظوظ کرنے کے علاوہ ان کے دلوں میں آنے والے دن کے لیے امید کی کرن روشن کرنے کا کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ ملک اور بیرون ملک کے سیاح اب بھی یہاں کثیر تعداد میں آتے تھے اور بنارس انھیں مایوس نہیں کرتا تھا۔ چونکہ عبدالرحمن انصاری کا گھر مدن پورہ میں تھا جو گنگا سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اس لیے وہ بھی روزانہ پابندی سے فجر کی نماز کے فوراً بعد اس دلفریب منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے دشاشومیدھ گھاٹ پر آیا کرتا تھا۔ یہاں آکر اسے ایسی شانتی ملتی تھی کہ وہ خود کو نئے حوصلے کے ساتھ اگلے دن کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر لیتا تھا۔

حالانکہ اس شہر میں مسلمان اقلیت میں تھے اور ان کی آبادی ایک چوتھائی سے بھی کم تھی لیکن ان میں باہمی نفاق کا یہ عالم تھا کہ ان لوگوں نے شہر کے اندر اپنے چھوٹے چھوٹے شہر بسا رکھے تھے۔ ان میں اکثریت انصاریوں کی تھی۔ جو آج بھی پوری تن دہی کے ساتھ اپنے آبائی پیشے یعنی مشہور زمانہ بنارسی ساڑیاں بنانے کے کام میں مصروف تھے۔ گذشتہ دو تین دہائیوں میں کاروبار کے طور طریقے بدلے تھے اور اب ان میں سے اکثر لوگ معاشی طور پر اپنے بزرگوں کے مقابلے میں زیادہ خوش حال ہو گئے تھے۔ اس لیے اکثر مخالفین اور حاسدین کی نظر بد ان پر پڑتی رہتی تھی۔ ان کا تمول، ان کی یہ فارغ البالی بدخواہوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھا کرتی تھی۔ چونکہ حالات اپنے موثرات کے خالق خود ہوتے ہیں اس لیے یہاں کے لوگ ہر طرح کی صورت حال سے نبرد آزمائی کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ غیر انصاری مسلمانوں میں صرف وہ لوگ یہاں آباد ہو گئے تھے جو اپنی ملازمتوں یا کاروبار کے جبر کی بنا پر یہاں رہنے پر مجبور تھے۔ ان کی تعداد بھی برائے نام تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان میں اتحاد تھا۔ انھوں نے بھی خود کو منقسم رکھنے کے نئے نئے پیمانے متعین کر رکھے تھے۔

غیر انصاری مسلمان تعداد میں کم ہونے کے باوجود انصاریوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، جب کہ اس کے برعکس انصاریوں کی اکثریت میں خلق و مروت اور ان لوگوں کو اپنے سے جوڑے رکھنے کا جذبہ کارفرما رہتا تھا۔ انصاریوں میں بھی باہمی اختلافات عروج پر تھے۔ ہر محلّہ اپنے کو دوسرے محلے سے زیادہ مہذب اور ہر شخص خود کو دوسرے سے زیادہ دانش مند سمجھنے کی علت میں مبتلا تھا۔ شاید یکا یک دولت کی ریل پیل نے ان کے اندر جلد سے جلد معزز اور مہذب بن جانے کی خواہش پیدا کر دی تھی۔ ان کے پاس پیسہ تھا لیکن اس کا صحیح مصرف کم ہی لوگ جانتے تھے۔ بیشتر بس اسی وہم میں جی رہے تھے کہ محض پیسہ ہونے

ہی سے معاشرے میں ان کی عزت بڑھ جائے گی۔ لیکن ایسا ہو نہیں پا رہا تھا۔ ہر شخص اپنے خیال میں دوسرے سے زیادہ معزز تھا۔ لیکن یہ موازنہ عموماً اپنے اپنے محلے میں باہمی طور پر ہی چلتا رہتا تھا اور غیر انصاریوں سے ان کے سلوک پر اثر انداز نہیں ہوا کرتا تھا۔ سماجی تقسیم کے علاوہ یہاں کے مسلمان عقائد کی بنیاد پر بھی منقسم تھے۔ حالانکہ یہ سب مسلمان تھے اور کہتے تھے کہ اسلام مساوات کا داعی ہے۔ ان کا تعلق مختلف النوع عقائد سے تھا۔ شیعہ اور سنی تو یہ تھے ہی۔ اس کے علاوہ فاطمی بوہرہ، بریلوی، دیوبندی، اہل سنت، اہل حدیث اور نہ جانے کیا کیا تھے، اس تفریق نے ان کے درمیان منافرت پھیلانے والوں کا کام بڑا آسان کر دیا تھا اور وہ بڑی تن دہی سے اپنا کام کرنے میں مصروف بھی رہتے تھے۔ مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے کچھ علما نے عقائد کی بنیاد پر اختلاف اور نفرت پھیلانے کو ہی مذہبی فریضہ اور جنت کی کنجی سمجھ رکھا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس صرف اپنے ہم عقیدہ مسلمانوں کے لیے جنت کا پروانہ تھا۔ عام مسلمان بڑے پیمانے پر ان کے دام فریب میں گرفتار تھے۔ اور اپنی روزمرہ کی زندگی ان کی ہدایات کے مطابق گذارنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے درمیان اکثر سر پھٹول کی بھی نوبت آتی رہتی تھی۔ اکثر مساجد میں دوسرے عقائد کے لوگوں کا آنا اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

لیکن اس کے باوجود اس شہر میں ایسے بھی مسلمان موجود تھے جو ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ وہ جب جہاں ہوں اور جو مسجد قریب ہو اس میں داخل ہو کر عبادت کا فرض ادا کر لیتے تھے۔ حالانکہ ان کی شناخت ہو جانے پر کوئی نہ کوئی بکھیڑا کھڑا ہو جانے کا اندیشہ ہمیشہ لاحق رہتا تھا۔ اکثر ایسے نمازیوں کے جانے کے بعد مسجد کو پاک کرنے کے لیے اسے غسل دینے کی ضرورت بھی پڑ جایا کرتی تھی۔ اور اس علت سے یہاں مسلمانوں کا شاید ہی کوئی محلہ ہو جو محفوظ رہا ہو۔ خواہ وہ انصاریوں کا ہو یا غیر انصاریوں کا۔

عبدالرحمن آج بہت پریشان تھا۔ بڑا الجھنوں بھرا تھا اس کا آج کا دن۔ اب رات میں بستر پر لیٹے لیٹے وہ دن میں رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا تو کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ جمعہ کا دن اور ایسا نامبارک کہ خدا کی پناہ! دشواریوں سے اس کا پرانا یارانہ تھا۔ وہ ان کا سامنا کرنے کا عادی بھی تھا۔ والد کے انتقال کے بعد جب سے اس نے مالک کی حیثیت سے 'کاشی ہینڈلوم' کا کاروبار سنبھالا تھا، آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا۔ مختلف النوع مسائل اس کے سامنے اپنا منھ پھیلائے کھڑے رہتے تھے لیکن

کوئی دن ایسا منحوس بھی ہوسکتا ہے، کہ اس کی ہمت جواب دینے لگے، یہ بات اس کے تصور میں نہیں تھی۔ سلسلے کی شروعات تو معمول کے ایک تجارتی مسئلے ہی سے ہوئی تھی اور پولیس، وہ تو جیسے اس کے پیچھے ہی پڑ گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں ایسا کیا کیا ہے ضرغام حیدر نے۔ برسوں ہو گئے نہ تو اس نے اس کے بارے میں سنا نہ وہ جانتا تھا کہ اب وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ لکھنؤ وہ اب بھی اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ لیکن اس کے گھر وہ بس ایک ہی بار گیا تھا۔ وہ بھی برسوں پہلے۔ وہاں اس کے نابینا والد اور بڑے بھائی سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ خلاف امید ان لوگوں نے اس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ گھر کے حالات پہلے کے مقابلے میں خاصے بہتر نظر آ رہے تھے۔ انھی سے معلوم ہوا تھا کہ ضرغام عرصہ ہوا گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ اور ایسا گیا کہ پلٹ کر کبھی نہ آیا۔ انھوں نے بتایا تھا کہ وہ ضرور کسی اچھی ملازمت میں ہوگا کیونکہ وہ نہایت پابندی سے ہمارے بینک اکاؤنٹ میں ہر ماہ ایک معقول رقم جمع کرتا رہتا ہے، جو ہماری ضروریات کی کفالت سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں ضرغام کے فراق میں اس کے والد کا رونا اس سے دیکھا نہ گیا تھا اور خود اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ شاید اس کے دل میں اپنے والد کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ ان سے ملنے کبھی نہیں گیا تھا۔ کیونکہ اسے یہی معلوم تھا کہ ضرغام کے والد اسے پسند نہیں کرتے۔ ان کے اندر آنے والی تبدیلیوں سے خود ان کا بیٹا ضرغام حیدر ہی واقف نہیں ہو سکا تھا تو بھلا وہ کیا جان پاتا۔ چنانچہ دوبارہ وہاں جانے کو اس کا جی ہی نہ چاہا۔ وہ فکر مند ہو گیا تھا کہ پولیس ضرغام جیسے سادہ مزاج شاعر کے بارے میں کیوں پوچھ تاچھ کر رہی تھی۔ ضرغام اور دہشت گرد، پولیس کی یہ بات اسے ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔ یہی سب سوچتے ہوئے نہ جانے کب وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

سترہ

اگست کا مہینہ تھا۔ بنارس میں گرمی اور حبس کی شدت میں کچھ کمی آئی تھی لیکن کسی حد تک اب بھی یہ اپنا جلال دکھا رہی تھی۔ آج صبح عبدالرحمٰن کی آنکھ تین بجے ہی کھل گئی تھی۔ اس کا سبب بجلی کا یکایک چلا جانا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بری طرح پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر جنریٹر آن کیا تاکہ گھر کے دیگر افراد کی نیند میں خلل نہ پڑے لیکن خود اس کی آنکھوں سے اب نیند غائب ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا اور الماری سے 'تزک جہانگیری' نکال کر پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد فجر کی اذان کی

آواز آئی تو وہ اٹھا، وضو کیا اور مسجد کے لیے روانہ ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنے معمول کے مطابق اس کا رخ گھاٹ کی جانب تھا۔ وہاں لوگوں کا اژدہام تھا۔ یہ سب صبح کی سیر کے لیے آنے والے لوگ ہی تھے۔ معلوم ہوا کہ گنگا سے ایک نوجوان کی لاش برآمد ہوئی تھی۔ پولیس بھی موجود تھی اور تفتیش کا کام چل رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ آج کے دن کی شروعات کچھ اچھی نہیں ہوئی۔ پھر بھی اس کے دل میں تجسس بیدار ہوا کہ یہ لاش کس کی ہو سکتی ہے۔ گنگا سے کسی لاش کا نکلنا ایسی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ ایسا آئے دن ہوتا ہی رہتا تھا۔ معلومات کی غرض سے وہ بھیڑ کے قریب پہنچا۔ اچانک اس کی نظر اپنے ایک شناسا پر پڑی۔ اس نے اسی سے دریافت کیا۔ 'جمال بھائی کا ہوا، ای بھیڑ کاہے جٹا ہے؟'

'بابو گنجے کے لڑکا کی لاش نکلی ہے دریا سے'۔ اس شخص نے جواب میں بتایا۔ 'کوئی اُکے گولی مار کے دریا میں بہا دینس ہے'۔

عبدالرحمٰن کے لیے یہ نام نیا نہیں تھا۔ بابو گنجا شہر کا مشہور غنڈہ تھا جو آج کل اسمبلی کا ممبر بھی بن گیا تھا۔ سارے شہر پر اس کے ساتھ اس کی دہشت کی بھی حکمرانی رہتی تھی، اسی دہشت کا فائدہ اٹھا کر وہ الیکشن جیتنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ آزاد ہندوستان کے ووٹ دینے والے ابھی اتنی ہی آزادی محسوس کر رہے تھے کہ وہ ایسا نہ کر کے اپنے خاندان کے لیے کسی طرح کا کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ اس لیے الیکشن میں اسے زبردست اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ سیاست میں داخل ہونے کے بعد اس کے روزمرہ کے کاموں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، وہی کوئلے کی دلالی تھی، وہی دکانوں سے غنڈہ ٹیکس کی وصولی تھی، وہی دل کی سیاہی کو ڈھکنے کے لیے سفید پوشی تھی، البتہ عام آدمی کے سامنے اب اس نے ہاتھ جوڑنا ضرور سیکھ لیا تھا۔ اس نے یہ بھی طے کیا تھا کہ اب وہ اپنے حلقے میں نہ خود کوئی واردات کرے گا اور نہ ہی کسی اور کو ایسا کرنے دے گا۔ ویسے بھی اس کا میدان عمل چندولی اور مغل سرائے تھا۔ اس لیے اس کے حلقے میں امن و امان تھا۔ آج اچانک اس کے بیٹے کا قتل ہو گیا تھا، تو شہر میں دہشت کا ماحول بننے کی امید تھی۔ گینگ وار۔ عبدالرحمٰن نے اب اور یہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے جمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ 'اچھا ہو تیہے کہ ہم لوگ اپنے اپنے گھر جائیں۔ ای ماملا تول پکڑیہے'۔

'ہاں ایسنے لگے ہے'۔ جمال نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا اور دونوں گفتگو کرتے ہوئے ساتھ ساتھ گھر کی طرف چل پڑے۔

آج کے دن کی مُروات اَچھی نَئی بھئی۔ اَلئی خیر کرے‘‘۔عبدالرحمن نے کہا۔

جمال خاموش رہا۔سشیل سنیما کے آگے کی گلی مڑتے ہی دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔

عبدالرحمن گھر آیا تو سب لوگ جاگ چکے تھے۔اس نے خاموشی سے وضو کیا اور اپنے معمول کے مطابق تلاوت قرآن پاک میں مصروف ہو گیا۔

اٹھارہ

مسعود کے لیے یہ شہر بالکل نیا تھا۔چوری چورا ایکسپریس پلیٹ فارم پر رکی تو رات کے بارہ بج کر پینتیس منٹ ہو رہے تھے۔یعنی بدھ کا دن ختم ہو کر جمعرات کا دن شروع ہو چکا تھا۔وہ باہر آیا تو اس کی سمجھ میں پہلے تو یہ نہ آیا کہ وہ آدھی رات میں کیا کرے اور کہاں جائے۔لیکن جس مہم پر وہ نکلا تھا اس کے مقابلے میں یہ دشواری بڑی معمولی تھی۔اس کی جیب میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ایک ہاتھ میں موبائل تھا اور دوسرے میں سوٹ کیس۔اس نے فوراً ہی فیصلہ کیا کہ ابھی اسے کسی ہوٹل میں ٹھہر کر آج کی رات آرام سے سونا چاہیے۔پھر صبح اٹھ کر وہ اپنے مہم کو انجام دینے کے لیے لائحہ عمل ترتیب دے گا۔

اس نے اسٹیشن کے سامنے دو ہوٹلوں کے گلو سائن جلتے بجھتے دیکھے۔اس کے قدم اس طرف بڑھے۔پھر کچھ سوچ کر اس نے رہائش کے لیے اسٹیشن سے دور کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔چنانچہ اس نے ایک آٹو رکشہ پکڑا اور اسے اوسط درجے کے کسی ہوٹل پر لے چلنے کو کہا۔ابھی وہ آٹو میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔اس نے اس میں کال کرنے والے کا نمبر دیکھا اور بغیر کوئی جواب دیے فون کاٹ دیا۔یہ ایک طرح کا اشارہ تھا کہ وہ ابھی مخدوش حالت میں ہے، جہاں بات کا جواب دینا محفوظ نہیں ہے۔اب اسے ہوٹل میں پہنچ کر سب سے پہلے کال کرنے والے کو اپنے سفر کی روداد سنانی تھی۔

چند منٹ بعد ہی آٹو لہزا ایبیر کے ایک ہوٹل کے سامنے رکا۔آٹو والا کاؤنٹر پر گیا اور کسٹمر لانے کی خبر دے کر اپنا کمیشن وصول کیا اور واپس آ کر رکشے سے مسعود کا سوٹ کیس اتار کر ہوٹل میں لے چلنے کی کوشش کی۔مسعود نے اس سے سوٹ کیس لے کر اسے اس کا کرایہ ادا کیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

’اب تم اتنا کشٹ کیوں کرتے ہو، یہ کام میں سویم کر لوں گا‘۔اس نے بڑی چابک دستی سے اپنی زبان بدل لی تھی۔

وہ اپنے سوٹ کیس کے ساتھ ہوٹل کے کاونٹر پر پہنچا۔ تو منیجر نے اس کے سامنے مسافروں کے اندراج کا رجسٹر کھسکا دیا۔ اس نے اطمینان سے رجسٹر کی تمام خانہ پری کی۔ نام کے خانے میں سوہن لال لکھا، باپ کے نام کی جگہ ماکھن لال اور مستقل پتے کی جگہ فتح پور کا ایک فرضی پتہ اور شہر میں ٹھہرنے کی مدت پانچ دن درج کر دی۔ یہاں آنے کے مقصد والے خانے میں اس نے لکھا کہ وہ یہاں کے ایک کالج میں داخلہ لینا چاہتا ہے، اسی کے لیے معلومات حاصل کرنے آیا ہے۔ منیجر نے ایک نظر اندراجات پر ڈالی، کرایہ لے کر رسید دی اور اسے دوسری منزل کے ایک کمرے کی چابی تھما دی۔

اپنے کمرے میں آنے کے بعد اس نے پہلے اچھی طرح کمرے کا جائزہ لیا۔ غسل خانے وغیرہ میں داخل ہو کر اسے اوپر نیچے سے دیکھا۔ اطمینان ہو جانے کے بعد واپس آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور بستر پر بیٹھ کر سب سے پہلے اپنے موبائل سے ایک مخصوص نمبر ڈائل کر کے اپنے مخصوص کوڈ میں بتایا کہ وہ بخیریت اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے۔

آدھی رات سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اسے لگا کہ اب اسے فوراً سو جانا چاہیے۔ لیکن سفر کی تکان کے باوجود نیند کا آنا اس کے اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ شاید وہ متفکر تھا۔ ہونا بھی چاہیے تھا۔ وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ کام اہم تھا کیونکہ اس کے مستقبل کا دارومدار اس کی یہاں کی کارکردگی پر ہی منحصر تھا۔ حالانکہ خود اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہے وہ اس کے لیے چنداں دشوار نہیں ہے۔ پہلے اسے یہاں کے ایک مسلم محلے مدن پورہ جا کر وہاں پر کاشی ہینڈلوم کے مالک عبدالرحمن انصاری سے ملنا تھا اور اس سے درخواست کرنی تھی کہ وہ لکھنؤ میں اپنے دوست ضرغام حیدر کے بیمار والد کی تیمارداری کا معقول انتظام کر دے۔ یہ کام نہ تو خطرناک تھا اور نہ اس میں کسی دقت کا اندیشہ تھا۔ لیکن اس کا اصل کام کچھ اور تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ کسی شرپسند تنظیم کا بنارس میں فساد برپا کرنے کی غرض سے قدیم کالی مندر کے تالاب کی جانب والی سیڑھیوں کے نیچے ایک طاقت ور ٹائم بم رکھنے کا منصوبہ ہے۔ ان کے منصوبے کے مطابق اسے اتوار کے دن شام ٹھیک پانچ بج کر تیس منٹ پر اس وقت پھٹنا ہے، جب وہاں درشن کے لیے لوگوں کی خاصی آمد و رفت رہنے والی تھی۔ اسے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ اس بم کو ناکارہ بنا دے۔ یہ کام کس طرح کیا جاتا ہے اس کے لیے اسے ساری اونچ نیچ سمجھا دی گئی تھی۔ کام پرخطر تھا لیکن تھوڑی سی احتیاط کے ساتھ اسے کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ خود اسے کوئی ایسا سامان لے کر نہ تو اندر جانا تھا، نہ لے کر باہر آنا تھا، جس سے وہاں تعینات حفاظتی عملہ اس پر شبہ

کرے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ پہلے کل دن میں کسی وقت جا کر اس جگہ کا معائنہ کرے گا۔ اور اگر ضرورت ہوئی تو مناسب منصوبہ بندی کر کے سنیچر کی رات وہاں ورشن کے لیے جائے گا اور کسی بہانے تاریکی کا فائدہ اٹھا کر یہ کام کر لے گا۔ وہ یہ بات بھی بخوبی جانتا تھا کہ ہنگامی ضروریات کے تحت اسے اپنے منصوبے پر ایک سے زاید بار نظر ثانی کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کب وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

الیمس

عبدالرحمن ابھی آ کر اپنی گدی پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے پڑوسی دلفریب ساریز کے منیجر پرویز حسن نے آ کر اسے بتایا۔ ''اَبْدُ رَمَان ، کُچھ بَتَاھَے ۔ او تورا بَنگالی گاھَک رَھا نے ۔ ارے وُئی جو توھیں دھوکا دیے رھا ۔ کَا نَام رَھا او کَا ۔ اَبھئیں آدھا گھنٹہ پَہلے ھَم او کے ندیسر ییں ٹَکسَال کے پَاس ٹَمبئی موٹر میں دیکھا رَھا ۔''

''اَچھا اُو بَساک ؟'' اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ''دھوکے باز ۔''

''ھَاں وَھی ۔ سَالا بَڑے آرام سے بَیٹھا ٹھنڈا پِیت رَھا ۔ آچھا ! کا اُو اَبھئیں ھُواں ھوئیے ؟''

''اَب ای تو نَئیں کَھہ سَکتے ۔ جَاکے ایک بَار ٹرائی کَر لو'' ۔ پرویز نے کہا۔

اس نے گدی کی تجوری مقفل کی اور کارندے کو ہوشیاری سے رہنے کی تلقین کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔ قریب سے گذرتے ایک رکشے کو روکا اور اس پر بیٹھتے ہوئے اسے ندیسر چلنے کو کہا۔

دیپک بساک بھی تین سال پہلے اس کا گاہک تھا۔ اس نے پہلی بار اسے اُدھار سامان فراہم کرنے سے معذرت کر لی تھی۔ اس کے بعد جب اس نے خود کلکتے جا کر اس سے اور اس کے کاروبار سے شناسائی حاصل کر لی تھی تو اسے بھروسا ہو گیا تھا۔ لیکن قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا تھا۔ شروع میں تو وہ وقت پر پیسے ادا کرتا رہا۔ لیکن اچانک ہی ایک دن خاموش ہو گیا۔ نہ تو وہ فون پر ملتا تھا اور نہ اس کے کسی خط کا جواب دے رہا تھا۔ وہ کلکتے گیا تو وہاں شوروم پر اس کی ملاقات کسی اور سے ہوئی۔ گدی پر جو بیٹھا تھا وہ دیپک بساک نام کے کسی شخص سے واقف بھی نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ جس سے وہ کاروبار کر رہا تھا وہ دکان کا مالک نہیں ایک معمولی منشی تھا۔ اصل مالک کو اپنے لڑکے کے کسی خانگی مسئلے کو حل کرنے کی غرض سے اس کے پاس امریکہ جانا پڑا تھا تو اس نے اس دوران اپنا کاروبار اپنے بھروسے کے منشی کے سپرد کر دیا تھا۔ واپسی پر اسے پتہ چلا کہ

اس نے غبن کیا ہے۔ وہ تاجر تھا، پولیس سے دور رہنا چاہتا تھا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اور اس کا کاروبار اخباروں کی سرخی بنے، اس لیے اسے ملازمت سے برطرف کر کے خاموش بیٹھ گیا اور پولیس کو اطلاع نہیں دی۔ جب عبدالرحمن نے اس سے اپنی بات بتائی تو اس نے ٹکا سا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ آپ جیسے اور بھی دو تین لوگ ہیں جن کے ساتھ اس نے دھوکا کیا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ کو اس سے لین دین کرنے سے پہلے اس کے بارے میں اچھی طرح معلومات کر لینی چاہیے تھی۔ اور وہ اپنا سا منھ لے کر کلکتہ سے واپس لوٹ آیا تھا۔ اب اسے اس شخص کی دیدہ دلیری ہی کہی جائے گی کہ آج وہ بنارس میں تھا۔ یہی سوچتے سوچتے وہ مدیسر پہنچ گیا تھا۔ وہ شخص اب بھی اسی دکان پر موجود تھا جہاں پرویز حسن نے بتایا تھا۔ اور بڑی بے تکلفی سے دکان کے مالک سے گفتگو میں مصروف تھا۔ وہ اس جعل ساز کی ہمت پر حیران تھا کہ وہ اس کا پانچ لاکھ غصب کرنے کے بعد بھی بلا خوف بنارس آ گیا تھا۔ اس کی دلیری دیکھ کر اسے ایک بار شبہ بھی ہوا کہ یہ کوئی اور نہ ہو۔ پھر بھی اس نے ہمت کی اور دکان میں داخل ہو گیا۔

'آداب بجا لاتا ہوں بساک جی'۔ اس نے طنزیہ انداز میں اسے اس طرح مخاطب کیا جیسے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

اس شخص نے غور سے عبدالرحمن کی جانب دیکھا اور کہا۔ آداب، کینتو ھام تو آپ کو پیچانا نیئی '۔ اس کے چہرے پر بھی اجنبیت کے نقوش نمایاں تھے۔ 'ھم بوشوک نیئیں ھے ھم تو شوندیپ بینرجی '۔

'بڑی اچھی ایکٹنگ کر لیتے ہیں آپ'۔ اس نے کہا۔ یعنی آپ مجھے نہیں پہچانتے'؟

'شوج موچ ھام آپ کو چینھا نئیں۔ شاید ھم آپ سے پرتھوم بار ھی مل رَھا ھَے'۔ اس نے کہا۔

پاس کھڑا ہوا ایک نوجوان ان کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی کوئی تاجر ہے۔ لیکن اس کی محتاط نگاہیں کچھ اور ہی کہانی بیان کر رہی تھیں۔ بھرے بازار میں اس کی شخصیت کچھ ایسی نہیں تھی کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے۔ یہ نوجوان خفیہ طور پر مدن پورہ ہی سے عبدالرحمن کا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک آیا تھا۔ وہ ان دونوں کی گفتگو میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ جیسے جیسے دونوں میں گرما گری بڑھ رہی تھی، اس کی آنکھوں

کی چمک بھی بڑھتی جارہی تھی۔

'آپ یہیں رکے رہیے گا، میں پولیس کو بلاتا ہوں۔ اس کی مدد سے شاید آپ کی یادداشت جلدی واپس آجائے گی'۔ عبدالرحمن نے اس کو دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔

موشائے آپ کا خد سے باھر جاتا ھاے۔ آپناجوبان شومبھالیے تو'۔۔ وہ شخص ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ آپ ھیں کون آر ھم سے کیا چاھتے ھائیں'۔

'میں کاشی ہینڈلوم کا مالک عبدالرحمن ہوں۔ اور آپ کلکتہ کے بنگال ڈریسیز کے فرضی مالک دیپک بساک ہیں، جس نے دو سال پہلے میری گدی سے پانچ لاکھ کا سامان خریدا تھا اور پھر ایسے غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ'۔

'آپ جے کوئی بی ھوں، آپ کو گولت پھامی ھوتا آئی لوگتا'۔ اس شخص نے کہا۔ 'آمرا نام شوندیپ بینرجی۔ آر موئی کولکاتا مے نوئی، پہلا ایک شال شے اِیئی دیب ناتھ پُرامیں زاھتا'۔ اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ لیکن عبدالرحمن کو اس بات کو پورا یقین تھا کہ یہ وہی شخص ہے۔ کیونکہ اس کی ٹھوڑی کے زخم کا نشان بھی اب اس کی یادداشت کی تصدیق کر رہا تھا۔

'تو اس سے پہلے آپ کلکتہ میں رہتے ہوں گے؟' عبدالرحمن بولا۔

'بھائی صاحب، آپ کو واقعی غلط فہمی ہو رہی ہے'۔ یہ بات دکان کے مالک نے کہی۔ 'یہ میرے دوست ہیں اور میں انھیں کافی عرصے سے جانتا ہوں۔ آپ کی مرضی ہے تو شوق سے پولیس کی مدد لیجیے اور اس کی تصدیق کرا لیجیے'۔

'تا ھوتم شیتھو، اِیئی تائش ھرزا اوپومان کورتا'۔ اس نے غصے سے ابلتے ہوئے کہا۔ 'پولش کے تو آمی ڈاکبو ای نوئی'۔

اس کی یہ خود اعتمادی دیکھ کر اب دبنے کی باری عبدالرحمن کی تھی۔ وہ خود بھی پولیس کو نہیں بلانا چاہتا تھا۔ اس نے تو محض اسے دھمکانے کی غرض سے پولیس کا نام لیا تھا لیکن یہ شخص اس کی دھمکی میں نہ آکر الٹا اسے ہی دھمکی دے رہا تھا۔ جب اس سے کوئی جواب دیتے نہ بنا تو اس سے بس اتنا کہا۔ 'ابھی تو میں چلتا ہوں لیکن جلدی ہی دیکھ لوں گا کہ تم دیپک بساک ہو یا سندیپ بنرجی'۔

بیس

جمعہ کا دن تھا۔ عام طور پر وہ آج کے دن خود کو خالی رکھا کرتا تھا لیکن آج کے واقعات نے اس کے اس معمول کو خاصا متاثر کر دیا تھا۔ اسے جمعہ کی نماز کے لیے مسجد پہنچنے میں اچھی خاصی تاخیر ہو گئی تھی۔ جب وہ مسجد میں داخل ہو رہا تھا تو تکبیر ہو رہی تھی۔ اور وہ حی علی الصلوٰۃ کے منتظر بیٹھے ہوئے لوگوں کو پھلانگتا ہوا آگے کی صف میں اپنی مقررہ جگہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وہ ابھی تیسری ہی صف تک پہنچا تھا کہ ایک شخص کسی اجنبی کا گریبان پکڑے ہوئے چلانے لگا۔ 'دیکھو یہ ٹانگ پھیلا کر نماز پڑھنے والا ہماری مسجد میں گھس آیا ہے۔ نکالو سالے کو۔ ہم سب کی نماز خراب کر دے گا یہ'۔ یہ سنتے ہی مسجد میں افراتفری کا ماحول برپا ہو گیا تھا۔ چاروں طرف سے 'مارو سالے کو' جیسی آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ اس شور شرابے میں مکبّر نے بھی تکبیر آدھی چھوڑ دی تھی اور اس شخص کو گھور کر دیکھنے لگا تھا جو بقول شخصے ان کی مسجد میں دراندازی کا مرتکب ہوا تھا۔ یہ اجنبی شاید کوئی مسافر تھا جو نہیں جانتا تھا کہ یہاں کتنے شدت پسند مسلمان رہتے ہیں۔ وہ اپنی عادت اور معمول کے مطابق شاید تکبیر شروع ہوتے ہی مسجد میں کھڑا ہو جانے والا تنہا فرد تھا۔ اور اسی بنیاد پر اس کی شناخت کر لی گئی تھی کہ وہ بریلوی نہیں ہے اور غلط طور پر اس مسجد میں گھس آیا ہے۔

عبدالرحمن محلے کا ایک صاحب ثروت شخص ہی نہیں، اس مسجد کی انتظامیہ کا صدر بھی تھا۔ مسجد اور اس سے ملحق مدرسے کے روزمرہ کے تمام اخراجات کی ذمے داری اس نے اپنے اوپر لے رکھی تھی۔ یہاں کے کسی متنازعہ انتظامی امر میں اس کی بات فیصلہ کن اور حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ گریبان پکڑ کر چیخنے والے شخص کی نظر اس پر پڑی تو وہ جیسے اور بھی جوش میں آ گیا۔ وہ اجنبی کو مختلف خطابات سے نوازنے میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ اس وقت مسجد میں، خدا کے گھر میں کھڑا ہے۔ اس کی امید کے خلاف عبدالرحمن نے اسے ڈانٹا اور اجنبی کو اس کے چنگل سے آزاد کرتے ہوئے بآواز بلند کہا۔ 'ابی کا ہنلکت کرے تو، بیٹھ جاو۔ ای بھی مسجد میں نماز پڑھیہے۔ ہم لوگ کے ساتھ'۔

یہ سن کر مسجد کے سارے نمازیوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ عبدالرحمن کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ موقعے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سارے لوگ خاموش رہ گئے۔ حسب معمول جمعہ کی جماعت ہوئی۔ لیکن نماز کے فوراً بعد جب سارے نمازی مسجد سے رخصت ہو گئے تو کمیٹی کی ایک

ہنگامی نشست منعقد ہوئی۔

’ہمرے حساب سے آج تو جو کیھو او ٹھیک نئیں بھوآ‘۔ایک بزرگ نے بات چیت کا آغاز کیا۔

’باپ دادے کے زمانے سے چلی آ رہی رسم کے ایسے توڑ دینا کون سی اکل مندی ہے‘۔دوسرے رکن نے کہا۔

’سدر صاحب سے امید نئیں رہی ایسی بے دینی کی بات کریں‘۔تیسرے شخص نے اپنی رائے ظاہر کی۔

’تو ہمیں ہمری بات کا جواب دیوے کا پڑئیے‘۔پہلے بزرگ نے عبدالرحمن کو خاموش دیکھ کر براہ راست کہا۔

’ہم جو بھی کیا ہے او گلت نئیں رہا‘۔عبدالرحمن نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔’ایسی روایت جے سے ہمرے اتحاد کے نکسان پہنچے توڑ دینا ہی ٹھیک ہے۔بڑے لوگ جو کہئین ہیں او اللہ کے رسول کا عمل نئیں ہے جو چھوڑا نئیں جا سکتے۔تو لوگ اپنی بنائی چھوٹی سی دنیا میں رہے، تو کا جانو۔۔۔ کا جانو کہ اے بکھت ساری دنیا میں مسلمانن کے ساتھ کا سلوک ہو رہا ہے‘۔

اس نے مسجد میں موجود اراکین پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ان سب کے چہرے پر بغاوت کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔اس نے اصل موضوع کی جانب واپس آتے ہوئے کہا۔’اے بکھت مسلمانن کے آپس میں مل جل کے رہے میں ہی بھلائی ہے‘۔اس نے کھڑے ہوتے ہوئے آخری بات کی۔’اگر تو لوگ کے ہمری بات سمجھ میں نئیں آوتی تو ہم جائیتے۔تو لوگ اپنا دوسرا سدر چن لواور او کے ہمرے گھر بھیج دئیو۔او ہم سے مسجد کا چارج لے لئیبے‘۔یہ کہتے ہوئے وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

’اماں ان کا رویہ ہمری سمجھ سے باہر ہے‘۔ایک رکن نے کہا۔’تنی ساہرہ لکھ کا لیئین ہیں کہ جب دیکھو بگھارا کرے تن۔اب تو مذہب پر بھی آنچ آوے لگی ہے۔ہم ایسا نا ہووے دئیہیں۔ہم سنی لوگ کے ای مسجد کے واسطے دوسرا سدر چن لینا چہئیے‘۔

'ای کا بکر بکر کئیے جاگتو تو لوگ'۔ بزرگ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ 'جانے تو بھی کی سنذر ہوئے کا کا مطلب ہوئے۔ھمیں عبد الرحمن کی بات پر سوچے کے چئیے'۔

'پلّو، اب ھم کا کھیں، تو ای مسجد کے سب سے بزرگ نماجی ھتو، تو بھی وہی کھے تو؟ تو ٹھیک ھے اب تو جانو اور سنذر سائب جانیں۔ ھم تو جائیتے۔ ای مسجد ویں نماز پڑھنا اب ھتیں جائز نئیں لگتے۔ توھیں لوگ پڑھو'۔ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

اکیس

عبدالرحمن مسجد سے نکل کر اپنے گھر کی طرف چلا تو سوچ رہا تھا کہ کیا اس نے واقعی زیادتی کی ہے؟ اسے لگا نہیں، جو کام اس نے اب کیا ہے کافی پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ اب دیکھو یہ لوگ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ کچھ بھی کریں مجھے کیا۔ نماز پڑھنی ہے تو یہ مسجد نہیں کوئی اور سہی۔ پھر گھر تو کہیں گیا نہیں ہے۔ اس روز کی چائیں چائیں سے تو فرصت ملے گی۔ ثواب گناہ دینے والا تو اوپر والا ہے۔ کیا وہ ہماری نیت کو نہیں جانتا۔ یہی سب سوچتے ہوئے وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس کے دوست پرویز حسن نے بتایا کہ اس کے گھر کے باہر ایک سپاہی کے ساتھ سب انسپکٹر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اب یہ کون سی مصیبت آ گئی۔ کیا بسا ک نے خود پولیس کو مطلع کر دیا ہوگا کہ میں اسے پریشان کر رہا ہوں۔ لیکن اس کو اس کی توقع کم ہی تھی۔ پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے سب انسپکٹر کے میرے گھر پر بیٹھ کر انتظار کرنے کی۔ اس کی کچھ پولیس والوں سے دوستی ضرور تھی لیکن وہ کبھی کسی پولیس والے کو گھر نہیں بلاتا تھا۔ کہیں یہ صبح گھاٹ والے معاملے کے بارے میں نہ ہو۔ ممکن ہے وہ کچھ تفتیش کرنے کے لیے آیا ہو۔ اسے یہ سوچ کر قدرے اطمینان ہوا۔

'نمستے، رحمن جی'۔ سب انسپکٹر گلاب سنگھ نے بلند آواز میں کہا۔ اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

'نمستے'۔ عبدالرحمن نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ 'کیسے آنا ہوا؟' اس نے پوچھا۔

'اب یہ نہ پوچھو رحمن جی'۔ انسپکٹر نے کہا۔ 'ذرا بھیلوپور تھانے تک چلے چلیے۔ ایس او صاحب آپ سے کچھ بات چیت کرنا چاہتے ہیں'۔

'کیوں'؟ وہ کچھ گھبرا گیا تھا۔

'یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم'۔ اس نے پیشہ ورانہ بے اعتنائی سے جواب دیا۔ 'سرکاری نوکر ہیں، جو حکم ملا بجالائے۔ ہمیں تو یہی آدیش ملا ہے کہ آپ کو تھانے میں بلا لائیں'۔

'اچھا تو ذرا رکیے، چلتا ہوں۔ ذرا اندر جا کر کپڑے وپڑے بدل لوں'۔

'ایسے ہی چلے چلیے نا۔ کسی شادی بیاہ میں تھوڑے ہی جانا ہے'۔ سب انسپکٹر نے کچھ بدتمیزی سے کہا۔

عبدالرحمن نے ایک لمحے کو کچھ سوچا۔ جیب سے موبائل نکال کر اپنے وکیل کا نمبر ڈائل کر کے اس سے کہا۔ 'ہمیں بھیلو پور تھانے میں بلایا گیا ہے۔ ذرا آپ آجائیے فوراً'۔ اس کے بعد اس نے انسپکٹر سے کہا۔ چلیے انسپکٹر صاحب'۔

انسپکٹر اسے لے کر تھانے میں سیدھے ایس او کے کمرے میں پہنچا۔ ایس او نے بے رخی سے اسے سامنے کی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ قریب دس منٹ تک وہ کسی کاغذ پر کچھ لکھتا رہا، ایسے جیسے وہ عبدالرحمن کو بھول گیا ہو۔ عبدالرحمن بھی یہی چاہتا تھا کہ کچھ دیر ہو تا کہ اس کا وکیل آجائے اور اس سے ہونے والی ساری بات چیت اس کے سامنے ہو۔ ابھی ایس او اپنے کام میں منہمک ہی تھا کہ اس کا وکیل رجت شریواستو کمرے میں داخل ہوا۔ 'جے بھولے شنکر'۔ اس نے نہایت بے تکلفی سے خالص بناری انداز میں کہا۔

'جے شری رام'۔ ایس او نے جواب دیا اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے جواب کا یہ انداز اس کے نظریات کی عکاسی کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنے کاغذات ایک طرف سرکاتے ہوئے عبدالرحمن سے کہا۔ 'آپ ہی کا نام عبدالرحمن انصاری ولد حاجی عبدالاحد انصاری ہے'؟ اس نے ایک کاغذ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ 'کاشی ہینڈلوم کے مالک'۔

'ہاں'۔ عبدالرحمن نے مختصر سا جواب دیا۔ اسے سکھایا گیا تھا کہ پولیس سے زیادہ بات نہیں کرنی چاہیے۔

'یہ بناری ساری کے ساتھ ساتھ آتنک واد کا دھندا کب سے شروع کر دیا'؟

'یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ'۔ عبدالرحمن نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ 'میں جب سے پیدا ہوا

ہوں، مدن پورہ میں رہتا ہوں۔ سب لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ اپنی انکوائری کر لیجیے تو پتہ چل جائے گا کہ میں کون ہوں اور کس طرح کی زندگی گذارتا ہوں۔ یہ تو آپ نے بڑا ہی سنگین الزام مجھ پر لگا دیا ہے'۔ اس نے اپنے وکیل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ 'اب آپ ہی بتایئے ان کو وکیل صاحب'۔

'سر آپ اس طرح میرے کلائنٹ پر بنا کسی ثبوت کے ایسا بے سر پیر کا آروپ نہیں لگا سکتے'۔ رجت شریواستو نے مداخلت کرتے ہوئے اپنے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔

'گھبرایئے نہیں وکیل صاحب۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس بات کو مجھے نہیں، عدالت کو طے کرنا ہے'۔ ایس او گجیندر سنگھ نے اپنی بات کو مزید واضح کرتے ہوئے عبدالرحمن سے پوچھا۔ 'جرگام حیدر سے آپ کا کیا سمبندھ ہے؟'

'کیوں اسے کیا ہوا'۔ اس نے پوچھا لیکن فوراً ہی اس غیر ضروری سوال سے گریز کرتے ہوئے سیدھا جواب دیا۔ 'ہم دونوں لکھنؤ یونیورسٹی میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے اور بہت اچھے دوست تھے'۔

'کیا اب بھی آپ کی اس سے بھینٹ ہوتی رہتی ہے؟'

'نہیں۔ وہ کئی سال پہلے اچانک ایک دن اپنے گھر سے بھاگ گیا تھا، اس کے بعد سے اب تک میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی'۔

'یہ کب کی بات ہے؟'

'سات آٹھ سال ہو گئے، اس کے بعد میرے والد کا انتقال ہو گیا اور میں مستقل طور پر بنارس آ گیا تھا'۔

'کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ اب کہاں ہے اور کیا کرتا ہے؟'

'نہیں، میرے پاس اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا'۔ عبدالرحمن بولا۔ 'ہاں کبھی کبھی اس کی یاد بہت بے چین کرتی ہے'۔

'وہ اب ایک دیش دروہی اور بھیانک آتنک وادی ہے'۔ ایس او نے کہا۔ 'کیا یہ بات آپ کو معلوم ہے؟'

یہ سن کر عبدالرحمن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اسے ایس او کی بات پر یقین نہیں آیا۔ اتنا نازک مزاج شاعر اور آتنک وادی نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ 'نہیں، ایس او صاحب، آپ کو کچھ غلط

ضمی ہوئی ہوگی۔ وہ ایک نرم مزاج شاعر اور سیدھا سادہ انسان ہے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ میں اس کی دیش بھگتی کی گواہی دے سکتا ہوں'۔

'ہماری اطلاع پختہ ہے، عبدالرحمن صاحب'۔ ایس او نے کہا۔ 'ہمیں کھبر ملی ہے کہ وہ جلد ہی آپ سے بھینٹ کرنے کے لیے بنارس آنے والا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہوئی تو آپ کے حق میں یہی اچھا ہوگا کہ آپ ہمیں اس بات کی ترنت کھبر دے کر اپنی دیش بھگتی کا ثبوت دیں، ورنہ ہم تو اسے دیکھ ہی لیں گے کہ وہ کیسے کاشی کی پوتر دھرتی پر پاؤں رکھتا ہے۔ پر ہمیں نہ بتا کر آپ ضرور کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے'۔

'اب یہ نوبت آ گئی ہے کہ ہم جیسے لوگوں کو قدم قدم پر اپنی دیش بھگتی کا ثبوت دینے کی ضرورت پڑتی ہے'۔ عبدالرحمن کے لہجے میں طنز شامل ہو گیا تھا۔ 'مجھے یقین نہیں آتا ایس او صاحب، لیکن اگر ایسا ہوا تو آپ یقین جانیے کہ میں سب سے پہلے آپ کو مطلع کروں گا'۔

'تو اب آپ جا سکتے ہیں'۔ گجیندر سنگھ نے کہا۔ 'لیکن ہماری بات بھولیے گا نہیں'۔ اس کے لہجے میں دھمکی کا عنصر شامل تھا۔

عبدالرحمن اپنے وکیل کے ساتھ تھانے سے باہر نکلا۔ اس کے چہرے پر خوف اور تھکن کے آثار تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج کا یہ منحوس دن ابھی کون کون سی بری خبریں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

بائیس

صبح کے سات بجے تھے۔ مدن پورہ کی گلیوں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ صبح معمول کی سیر سے واپسی کے فوراً بعد اپنے گھر کے باہر ایک اجنبی نوجوان کو اپنا منتظر پانے اور اس سے ملاقات کا تحیر اور اس سے ہونے والی گفتگو سے پیدا شدہ خوف اب بھی عبدالرحمن کے چہرے سے عیاں تھا۔ اس خوف سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے کمرے میں نہایت انہماک سے تلاوت کلام پاک میں مصروف تھا کہ صدر دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔ اس کی تلاوت میں خلل پڑا تو چہرے پر ناگواری کے کچھ آثار ہویدا ہوئے۔ اب کون ہوگا اس وقت؟ اس نے سوچا۔ پھر قرآن مجید کو پوری

عقیدت سے بوسہ دیا اور اسے جز دان میں رکھ کر دروازے تک آیا۔ اپنے خوف کے سائے میں وہ کسی بھی ناگہانی بات کی توقع رکھتا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سامنے دیپک بساک کھڑا ہے۔ پہلے تو اسے دیکھ کر اس کی تیوریوں پر بل پڑے پھر اس کے چہرے پر فکرمندی نمایاں ہوئی۔ ابھی وہ اپنے تجسس پر قابو پا کر اس کے آنے کے مقصد کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے کہا۔ 'ایئی جے رحمان شاھیب، بھیتر آنے کو نوئی بولبین کی؟'

'کیوں نہیں'۔ اس نے کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ 'ٹھہریئے'۔ اس نے ملحق بیٹھک کا دروازہ کھولا اور لائٹ آن کر کے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس شخص کا استقبال کیسے کرے جس نے اس کے ساتھ صریح بے ایمانی کی تھی اور جس سے ابھی کل ہی اس کی تو تو میں میں ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ بولا۔ 'تشریف لائیے، بساک جی'۔

'کال جے ھام جے بانیبچی کیاء شیٹی جونو آمی اونیک لوجّت !' اس نے کچھ جھینپتے ہوئے کہا۔ 'آر پچھلا بھول کا واسطے آمی ماپھی چائی موشائے۔ ھمرا گولتی کھوما کے لائک تو نوئی، بلکی آپ کا اُدارتا آمی جانی، آر آشا کورتا کی آپ آم کو کھوما کور دیں گے'۔

عبدالرحمن اب بھی خاموش تھا۔ اس کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ راتوں رات اس شخص کو کیا ہو گیا کہ اچانک اس نے نہ صرف خود کو پہچان لیا بلکہ میری شناخت بھی کر لی۔ 'چلیے یہ سب چھوڑیے۔ یہ بتائیے کہ اس وقت آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی'۔ اس نے اپنی متانت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ حالانکہ اس کے لہجے کی درشتگی اب بھی نمایاں تھی۔

'ھام آپ کے ای بولنا مانگتا ھائی جے ھامرا اشلی نام شوندیپ بینرجی ھاے، جانیشا ھام آپ کے کال نادیشر مے بولا۔ کِنتُو اے بی شتّو جے جاب ھام آپ کا شاتھ کاروبار کیاتھاتو شیٹی شومے تہ آپنا نام ھام دیپک باشاک ھی بولا ہوتایا تھا'۔ اس شخص نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ 'دور آشل میرا دیل مے تھورا بود نیاتی آ گویا تھا راھمان شاھیب، کِنتُو آب آمی کھوب لوجّت'۔

عبدالرحمن اس کی اس وضاحت سے مزید حیران ہوا۔ آخر اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔ یہ معجزہ

آخر ہوا کیسے۔ اسے خیال آیا کہ خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ بالآخر اس کا انصاف میرے در پر دستک دے رہا ہے۔ وہ خدائے قادر کے کرم پر سراپا سپاس بنا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ سوچ رہا تھا۔ کیا یہ شخص اپنے کیے پر واقعی نادم ہوگا اور آج میرے پیسے واپس کرنے کے ارادے سے یہاں آیا ہوگا۔ یا اس کا کوئی اور سبب ہو سکتا ہے۔ کہیں یہ مجھے کسی چکر میں پھنسانے کی کوئی سازش تو نہیں۔ ابھی وہ کل رونما ہونے والے پے در پے واقعات کے طلسم سے پوری طرح باہر نہیں نکل پایا تھا۔ خوف کسی حد تک اب بھی اس پر سایہ فگن تھا۔ جو کچھ وہ سامنے بیٹھے شخص کی زبانی سن رہا تھا اسے اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی وہ بولا۔ 'آپ جیسا شخص ایسی بد دیانتی کرنے پر کیوں مجبور ہوا یہ میں نہیں پوچھوں گا۔ لیکن یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس طرح آج اپنی غلطی مان لینے کا ریزن کیا ہے؟'

'راھمان شاھیب اب بشتار مے موت جائیے موشلے۔ کاھے شے اِش شے ھام کو آر شورمنداگی ھی ھوگیا۔ کل کے بباک اور آج کے سندیپ نے کہا۔ 'ھام ایک گوریب مانش۔ خام تو نیجی موجبوری مے آپکا شاتھ لین دین مے بے اِمانی کی یا۔ آپ کا شاب ھساب کیتاب شاتھ لایا ھاے۔' اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے عبدالرحمن کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ 'ھنارا ھیشاب سے ھام چار لاکھ شوتر ھجار اونھ شوروپیا کا دین دار ھاے آپ کو۔ توتکال اِیتنا روکوم کا اِنتیجام تو ھومارے جوتشا مانش کے لیے شمبھو نوئی تھاشیتی جوتا گھار مے جو تھالی کار آگیا، شیش جے بوج گویا ھائے اُش کا ادایگی کا لییے کام شے کام ایک شال کا موھلات دیجیے'۔ اس نے اپنی جیب سے ایک پیکٹ نکال کر عبدالرحمن کو دیا۔ 'اِش مے دونئی لاکھ ھاے'۔

عبدالرحمن کبھی حساب کتاب کے اس کاغذ کو دیکھ رہا تھا جو اس شخص نے ابھی ابھی دیا تھا، کبھی اس کی شکل کو، جہاں اسے نہ تو کسی سازش کا کوئی شائبہ دکھائی دے رہا تھا اور نہ ریا کاری کا اور کبھی اس پیکٹ کو جس میں اس کے کہنے کے مطابق دو لاکھ روپے تھے۔ یکا یک وہ اپنی تمام تر تاجرانہ صلاحیتوں کے ساتھ بیدار ہو گیا۔ پہلے اس نے لفافہ کھولا، جس میں ایک ہزار اور پانچ سو روپے کے پرانے نوٹوں کی بے ترتیب گڈیاں تھیں۔ اس نے انھیں گننا شروع کیا جس میں اسے کچھ وقت لگا۔ رقم واقعی اتنی ہی تھی جتنی بتائی گئی تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کہا۔ 'چلو اچھا ہوا بساک جی میرا مطلب ہے سندیپ جی کہ آپ راستے پر آ گئے۔ لوگوں کو سمجھانے کے خدا کے اپنے طریقے ہوا کرتے

ہیں۔اس نے آپ کو عقل دی۔اس کے لیے میں بھی خدا کا شکر گزار ہوں اور آپ کو بھی ہونا چاہیے۔اس نے درمیان میں ایک لمبی سانس لی۔"لیکن یہ تو کل رقم کا آدھا بھی نہیں ہے۔"

"ہام بوخت موجبور ہلے زاھمان شاھبب"۔یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

اس کی بھرائی ہوئی آواز سن کر عبدالرحمن گفتگو کو مزید طول دینے سے گریز کرتے ہوئے اٹھا اور اندر چلا گیا۔وہاں سے کچھ کاغذ، ایک اسٹیمپ پیپر اور قلم لے کر آیا۔پہلے اس نے کاغذ پر اسے دینے کے لیے وصول کردہ رقم دو لاکھ روپے کی رسید تیار کر کے دی، جس میں کل رقم کے ساتھ ادا کی گئی اور باقی بچی ہوئی رقم کا بھی اندراج تھا۔اس کے بعد اسٹیمپ پیپر پر اس سے بقیہ رقم کو سال بھر کے اندر واپس کر دینے کا حلف نامہ لکھ کر اس پر اس کے دستخط لیے، جسے اس نے بغیر کسی چون و چرا کے کر دیا۔اسے باقی رقم جتنی جلد ممکن ہو، ادا کرنے کی تلقین کی اور اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔جسے سندیپ بنرجی نے رخصت کا اشارہ سمجھا اور وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس سے مصافحہ کر کے خاموشی سے رخصت ہو گیا۔

تیئیس

وارانسی۔(نیج پرتی ندھی دوارا) وشوَسنت سُوتروں سے گیات ہوا ہے کہ کچھ آتنک وادی کاشی کے ایسے وششٹ استھلوں پر تم وسپھوٹ کرنے کے پریاس میں ہیں، جہاں سے اس نگر کی ایکتا کو کھنڈت اور یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کو نشٹ کیا جا سکے۔جن پد کی سُرکشا ویوستھا چُست دُرست بنائے رکھنے کے لیے سیماؤں پر سگھن جانچ کے ساتھ ساتھ رات میں پولیس دوارا اہن چیکنگ ابھیان بھی چلایا جا رہا ہے۔مُکھیہ مُکھیہ استھانوں پر میٹل ڈیٹکٹر لگائے گئے ہیں اور وہاں وشیش روپ سے گہن چیکنگ کی جا رہی ہے جس میں بم ڈسپوزل دستے، ڈاگ اسکواڈ کے ساتھ سبوتیج چیکنگ بھی شامل ہے۔وارانسی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پی اے سی، آر پی ایف اور جی آر پی کے سہیوگ سے ٹرین کے بھیتر اور ریلوے پلیٹ فارموں پر بھی ابھیان چلانے کا آدیش جاری کیا ہے۔

نگر پرشاسن کے ساتھ ساتھ سنت ودوانوں، دھارمک

نیتاؤں ، ساہتیہ کاروں، رنگ کرمیوں اور سماج سیویوں نے بھی جنتا سے آگرہ کیا ہے کہ وہ ایسی وِکٹ پرستھتی میں اپنی سُوجھ بوجھ کا پریچے دیتے ہوے ان دیش دروھی آتنک وادیوں کے اس پریاس کو وِپھل بنانے میں پرشاسن کا سہیوگ کریں۔ یدی اُنھیں کہیں کوئی اپنتی جنک وستو یاسندگدھ ویکتی دکھائی دے تو ترنت پولیس کو سوچت کریں۔ سڑک پر پڑی کسی لاوارث وستو کو ہاتھ نہ لگائیں، چاہے وہ کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو۔ ایسی وستوؤں میں بوتل، کمپیوٹر کے پین ڈرائیو، موبائل فون،پرس،کھلونے، بیگ، ریڈیو، بیگ، اٹیچی یا ان جیسی کوئی دوسری وستو بھی ہو سکتی ہے۔ ان کا نشانہ ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ، ایر پورٹ، پل ، فلائی اوور سنیما ہال، دھرم شالائیں، مسافر خانے، مندر یا مسجد جیسے پوتر دھارمک اِستھل کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے سَمَسْت ناگرکوں سے نویدن ہے کہ وہ اتی رکت ساودھانی برتیں۔

ناگرکوں سے یہ بھی نویدن ہے کہ وہ اس بیچ کسی نئے نوکر، کرایے دار، یا اپریچت مہمان کو اپنے گھر میں ٹھہرانے سے پہلے پولیس کو اوشیہ سوچت کریں۔ نگر کے ہوٹلوں سے بھی یہ اپیکشا کی جاتی ہے کہ وہ ہوٹلوں میں تلاشی ابھیان چلانے والے پولیس جنوں کے ساتھ سہیوگ کریں گے۔

چوبیس

جمعرات کی صبح اپنے ہوٹل کے کمرے میں وہ کافی دیر سے اٹھا تھا۔ اسے جلدی تھی بھی نہیں۔ سفر کی تکان اب یکسر رفع ہو چکی تھی۔ ناشتہ اس نے باہر نکل کر ایک دوسرے ہوٹل پر کیا تھا۔ اس کے بعد رکشہ لے کر وہاں سے سید حامدن پورہ کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ اس کی آج کی مہم صرف یہ تھی کہ اسے وہاں جا کر عبدالرحمٰن انصاری کے کاروباری ٹھکانے اور رہائش گاہ کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنی تھی۔ اس سے ملاقات کرنے کا پروگرام اس نے سنیچر کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ یہ معلومات

فراہم کرنے کے بعد اسے کالی مندر جانا تھا جہاں اسے اپنے اصل کام کے بارے میں جغرافیائی معلومات کی طلب تھی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ شر پسندوں نے ابھی وہاں بم نہیں رکھا ہوگا۔ لیکن جگہ کو ایک نظر دیکھ لینا اس کی منصوبہ بندی میں معاون ہوگا۔ یہ سارے کام اس نے بغیر کسی مشکل کے کر لیے تھے۔ اسے اپنے منصوبے پر نہ صرف مکمل اعتماد تھا بلکہ اسے سب کچھ بہت آسان بھی لگ رہا تھا۔ چنانچہ کاموں سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ مدن پورہ پہنچا اور کاشی ہینڈلوم کے آس پاس وقت گذارنے لگا، تا کہ عبدالرحمن کی جملہ سرگرمیوں پر نظر رکھ سکے۔

دوسرے دن جمعے کو وہ علی الصباح ہی عبدالرحمن کی رہائش کے آس پاس تھا۔ آج اس کا ارادہ تھا کہ سارے دن اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھے گا، تا کہ اس کے مزاج کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ گھاٹ پر گیا، اس نے اپنی دکان کھولی، پھر وہ ندیسر کے لیے روانہ ہوا تو وہ اس کا تعاقب کرتا رہا۔ وہاں اس نے کسی بنگالی شخص سے اس کی تو تو میں میں کا مشاہدہ کیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ بنگالی اسے پریشان کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ اس کی مہم کا حصہ نہیں تھا پھر بھی اپنے طور پر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے میں عبدالرحمن کی مدد کرے گا۔ وہاں سے اس نے اس کا تعاقب چھوڑ کر سندیپ بنرجی کا پیچھا کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے گھر تک پہنچ گیا۔ ابھی اسے اپنے گھر میں داخل ہوئے کچھ ہی لمحے گذرے تھے کہ اس نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ سندیپ نے ہی کھولا تھا۔ اپنے سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر اس نے پوچھا کہ وہ کس سے ملنا چاہتا ہے۔ اس نے اسی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے اسے اندر بلا لیا۔ بات اس نے بغیر تمہید کے شروع کی۔ وہ آدمی اس کی توقع کے برعکس بڑا بزدل نکلا۔ اس نے دیکھا کہ صرف اپنے تنظیمی تعارف، پستول کی نمائش اور چند دھمکی آمیز جملوں سے ہی اس کا کام ہو گیا تھا۔

اگلے دن سنیچر کی صبح فجر کے بعد وہ عبدالرحمن سے ملنے کی غرض سے اس کی رہائش گاہ پر پہنچا تو دیکھا کہ وہ بے حد پریشان ہے۔ لیکن وہ اس کی پریشانی کا سبب معلوم نہ کر سکا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ عبدالرحمن نے ہی کھولا تھا۔ ایک اجنبی کو دیکھ کر اسے کچھ حیرانی ہوئی۔ پھر بھی اس نے اسے اندر بلایا اور آنے کا مقصد پوچھا۔ ضرغام حیدر کا نام سنتے ہی خوف سے اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ کل شام ہی تو اسے پتہ چلا تھا کہ اس کا دوست اب کسی دہشت گرد تنظیم سے وابستہ ہو گیا ہے۔ دوران گفتگو مسعود

نے اسے یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم جیسے متعدد لوگ حرکت البشر سے وابستہ ہیں اور دوسروں جیسے ہی محب وطن ہیں۔ ہم لوگ اپنے انداز سے ملک وقوم کی خدمت میں مصروف ہیں۔ عام طور پر ہم لوگ قانون کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے لیکن جہاں قانون ہار جاتا ہے یا اپنے فرائض کی ادائیگی سے پہلوتہی کرتا ہے، وہاں سے حرکت البشر کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ ہمیں پوشیدہ اس لیے رہنا پڑتا ہے کہ اس ملک کے حالات مسلمانوں کی فلاح کے لیے کیے جانے والے کاموں کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ یہاں ایسے لوگ کثیر تعداد میں ہیں جو مسلمانوں اور ان کے مفادات کے دشمن ہیں۔ ہماری حکومت بھی کہیں نہ کہیں ان کے سامنے بے بس نظر آتی ہے۔ اس تنظیم کے قیام کا سبب بھی یہی ہے۔ اس لیے پولیس اور سیاسی رہنماؤں کی باتوں سے گمراہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ کے اندر ملک وملت کا ذرا بھی درد ہے تو آپ کو اپنے دوست کی حمایت کرنی چاہیے۔ اس کے بعد اس نے اسے ضرغام کا پیغام سنایا۔ عبدالرحمن کی حالت اب بھی غیر تھی۔ اس کے چہرے سے بھی اس کا خوف نمایاں تھا۔ پھر بھی اس نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی کسی کو لکھنؤ بھیج کر اس کے والد کے علاج اور تیمارداری کا معقول انتظام کر دے گا۔ اس طرح مسعود کا یہ کام بھی تھوڑی الجھن کے ساتھ انجام کو پہنچ گیا تھا۔ لیکن اس نے اس سے سندیپ کے تعلق سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اب اسے عبدالرحمن کو چھوڑ کر اپنے اصل کام کی جانب متوجہ ہونا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر مدن پورہ آتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ لیکن جب اس نے مختلف طریقوں سے اس کی تصدیق کی تو یہ اس کا وہم ثابت ہوا۔ اب یہ اتفاق بھی ہو سکتا تھا کہ ٹائٹ جینز اور ٹاپ میں ملبوس وہ ماڈرن لڑکی جو اسے لہرابیر چوراہے پر نظر آئی تھی وہی تھوڑی دیر بعد مدن پورہ روڈ پر بھی دکھائی دی۔ ممکن ہے وہ کوئی سیاح ہو جو بنارس میں سیاحت کا لطف لے رہی ہو۔ اس نے جلد ہی تعاقب کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی جانب متوجہ ہو گیا۔

عبدالرحمن سے ملنے کے بعد وہ پہلے بازار گیا، جہاں سے گیروے رنگ کے کچھ معمولی کپڑے خریدے، جنھیں پہن کر اسے عام درشنارتھی کی طرح کالی مندر جانا تھا۔ آج کا دن اس کی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ سوہن لال کی حیثیت سے اس کی شناخت کے اس کے پاس مضبوط شواہد تھے۔ اس لیے اس جانب سے اسے اطمینان تھا۔ ان تیاریوں کے بعد وہ ہوٹل آ گیا تا کہ اپنی تیاریوں کو

آخری شکل دے سکے۔

مغرب کے بعد تقریباً سات بجے وہ ہوٹل سے نکلا۔ اچانک وہ لڑکی اسے پھر نظر آئی۔ اب وہ سیاہ ساری میں ملبوس تھی۔ وہ رکشے پر سوار تھی۔ یہ اتفاق اب مسعود کو کھٹکنے لگا تھا لیکن اسے اطمینان ہوا کہ رکشہ چل رہا تھا اور اس کا رخ کھیبر چوڑا کی طرف تھا۔ اس کی تیاری مکمل تھی۔ اس نے ایک آٹو رکشہ کرائے پر لیا اور سیدھا کالی مندر کے لیے چل پڑا۔ وہاں کافی چہل پہل تھی۔ آنے والے خطرات سے بے خبر لوگ مندر میں آ جا رہے تھے۔ ابھی وہ اپنی مقررہ جگہ پر جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ لڑکی اسے ایک بار پھر نظر آئی۔ اب کی بار وہ تحائف کی دکان پر کھڑی کچھ چیزیں خرید رہی تھی۔ مسعود پریشان ہو گیا۔ اس کا دل اب اسے اتفاق ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، جانے یہ لڑکی کون ہے اور اس سے کیا چاہتی ہے؟ کیا اس کی یہاں آمد خفیہ نہیں رہی۔ اسے خوف ہوا کہ کہیں اس کا سارا منصوبہ طشت از بام نہ ہو گیا ہو۔ وہ بے حد فکر مند ہو گیا تھا، لیکن اب اس کے پاس اس مسئلے میں الجھنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے احتیاط کے ساتھ اس کی نظر بچا کر اپنے آپ کو بھیڑ میں گم کر لیا اور جب کوشش کے باوجود وہ لڑکی اسے پھر نظر نہ آئی تو اسے قدرے اطمینان ہوا۔

وہ نہایت خاموشی سے تالاب کے کنارے کنارے اپنی مقررہ جگہ پر پہنچا اور سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ جہاں وہ بیٹھا تھا اس پتھر کے نیچے ایک خالی جگہ تھی جسے وہ کل دیکھ کر جا چکا تھا اور جسے شاید دھماکا کرنے والوں نے خاص طور پر تیار کیا تھا۔ اتنے بڑے تالاب میں ایک چھوٹے سے سوراخ پر بھلا کون توجہ دیتا۔ وہ بالکل ایسے بیٹھا تھا جیسے دنیا سے اکتایا ہوا کوئی نوجوان روحانیت کی تلاش میں بیٹھا ہو۔ تاریکی بڑھ رہی تھی اس نے بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ اس سوراخ میں ڈالا۔ پیاز کے برابر ایک گول سی چیز اس کے ہاتھ میں آئی۔ شر پسندوں نے مقررہ وقت پر اپنا کام کر لیا تھا۔ یہی اس کی منزل تھی۔ وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اس کے فیوز کا تار الگ کیا اور بڑی سرعت سے اسے تالاب میں اچھال دیا۔ وہ بے حد خوش تھا لیکن اس کی اس خوشی کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کا کام ہو چکا تھا اور اب یہ مندر محفوظ تھا۔ اس پر آنے والا خطرہ ٹل چکا تھا۔ لیکن وہ اب بھی وہیں بیٹھا ہوا اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے متعدد لوگوں کی جان بچا لی ہے اور اپنی آزمائش پر بھی کھرا ثابت ہوا تھا۔ وہ تنہا تھا۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت وہ اٹھا اور تاریکی میں رقص

کرنے لگا۔ اچانک ایک پولیس والا اس کی طرف آتا دکھائی پڑا۔ اس نے اسے ناچتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ کانپ گیا۔ لیکن اب وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

'یہاں کیا کر رہے ہو تم'؟ پولیس والے نے پوچھا۔

'کچھ نہیں، بس ویسے ہی آ کر بیٹھ گیا تھا' مسعود نے کہا۔

'تم ناچ کیوں رہے تھے؟ کہاں سے آئے ہو؟ یہاں کے تو نہیں لگتے'۔

'ہاں، میں دیوی درشن کے لیے آیا ہوں'۔

'لیکن تم مندر میں تو گئے نہیں۔ میں بڑی دیر سے تمھیں دیکھ رہا تھا کہ تم یہاں بیٹھے بیٹھے جانے کیا کیا کر رہے تھے۔ کیا نام ہے تمھارا'؟

'سوہن لال نام ہے میرا، حولدار صاحب آپ مجھے اکیلے نہیں چھوڑ سکتے'۔ اس نے کچھ بولڈ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

'ذرا اٹھو یہاں سے'۔ اس نے اسے اٹھا کر اس کے نیچے پتھر کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے شبہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ 'میرے ساتھ چلو، کوئی اور ہے تمھارے ساتھ؟ تم ٹھیک آدمی نہیں لگتے ہو مجھے'۔

'کیوں پریشان کرتے ہو یار'۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

وہ اسے پاس ہی قائم کردہ عارضی چوکی تک لے گیا۔ وہاں ایک سب انسپکٹر بیٹھا تھا۔ اس نے اسے سیلیوٹ کیا اور بولا۔ 'دیکھیے سر یہ آدمی مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتا'۔

عین اسی وقت، جب سب انسپکٹر مسعود خاں سے پوچھ تاچھ شروع کرنے والا تھا، وہ لڑکی چوکی میں داخل ہوئی، جسے مسعود نے آج کئی مختلف مقامات پر دیکھا تھا۔ اس نے مسعود کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ چوکی میں موجود سب انسپکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ 'سر کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ میں یہاں سے رام نگر قلعے تک کیسے جا سکتی ہوں'۔

ایک خوب صورت لڑکی کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر سب انسپکٹر نے جوان کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس لڑکی سے کہا۔ 'آپ یہاں سے آٹو رکشہ کر لیجیے۔ وہ ڈیڑھ سو روپے لے گا اور آپ کو وہاں تک پہنچا دے گا۔ کافی دور ہے رام نگر یہاں سے'۔

'تھینک یو۔ کہتے ہوئے وہ لڑکی چوکی سے باہر نکل گئی۔

اب سب انسپکٹر نے سپاہی کی طرف دھیان دیا، جو مسعود خاں کو کلائی سے پکڑے کھڑا تھا۔' کیا کیا ہے اس نے'؟ اس نے بڑے لاابالی پن سے پوچھا۔

'تالاب کے کنارے بیٹھا بیٹھا جانے کیا کر رہا تھا'۔

'کیا کر رہا تھا'؟ اس نے پوچھا۔

'پہلے کنڈ کو گھورے جا رہا تھا، پھر کھڑے ہو کر مستی میں ناچنے لگا'۔

'کنڈ کو گھورنا اور مستی میں ناچنا کوئی اپرادھ نہیں ہے بلونت سنگھ'۔ اس نے اس سے کہا' چھوڑ دو اسے، کیوں لوگوں کو ناحق پریشان کرتے رہتے ہو'۔

'یس سر'۔ اس نے سیلیوٹ کرتے ہوئے کہا۔ اور اسے ساتھ لے کر چوکی سے باہر نکل آیا۔

مسعود خوش تھا کہ اس نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے لیا تھا۔ لیکن اسے اس پراسرار لڑکی کو لے کر پریشان تھا کہ یہ آخر کون ہو سکتی ہے۔ اچانک اسے خیال آیا، کہیں یہ وہ تو نہیں جسے اس کی حفاظت کے لیے یہاں مامور کیا گیا ہے۔

مسعود خاں کا یہ اندازہ بالکل درست تھا۔ وہ ڈروانہ بہرام تھی، جسے حرکت البشر نے مسعود کی حفاظت پر مامور کیا تھا۔

پچیس

خالی سڑک پر سفید رنگ کی ٹاٹا سومو کار نہایت تیز رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ اس کے سیاہ شیشے اس طرح چاروں طرف سے چڑھے ہوئے تھے کہ باہر سے کوئی بھی ڈرائیور اور سامنے بیٹھے شخص کے سوا اندر بیٹھے کسی اور شخص کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ بے آواز گاڑی اتنی نئی تھی جیسے ابھی اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہی اسے شوروم سے نکالا گیا ہو۔ اس پر ابھی رجسٹریشن کی نمبر پلیٹ بھی نہیں تھی۔ نمبر کی جگہ چونے سے نہایت بے ڈھنگے پن سے انگریزی کے حروف 'اے ایف' لکھے گئے تھے۔ برسات کا موسم ہونے کے باوجود یہ خام سڑک صاف شفاف اور کیچڑ سے عاری تھی۔ جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تیز بارش ہوئی ہوگی جو سڑک کی گندگی اور کیچڑ بہا لے گئی ہے۔ ہاں کہیں کہیں چھوٹے

بڑے گڑھے کار کی رفتار کم ضرور کر دیتے تھے۔ تا حد نظر ہرے بھرے کھیت آنے والے واقعات سے بے تعلق فطرت کی دل فریبی میں اضافہ کر رہے تھے اور خاموشی سے اس سنسان راستے سے گزرنے والی اس پراسرار کار کو دیکھ رہے تھے۔ اس سڑک پر وقفے وقفے سے کچھ مسافر بسیں چلتی تھیں، جو ہمیشہ ضرورت سے زیادہ لوگوں کو اپنے اندر ٹھونسے رہتی تھیں۔ اس علاقے کے لوگوں کو ابھی کاروں کا چسکا نہیں لگا تھا۔ اس لیے اس طرح کی قیمتی کاریں اس سڑک پر کم ہی نظر آیا کرتی تھیں۔ لیکن جب جب ایسا ہوتا تھا آس پاس کے گاؤں میں کچھ نہ کچھ غیر معمولی واقعات ضرور رونما ہوا کرتے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کار میں بیٹھے لوگوں کی منزل کوئی گاؤں ہی ہے۔ لیکن ایک گھنٹے کے سفر کے بعد بھی وہ ابھی اپنی منزل مقصود سے دور تھے۔ کار میں ڈرائیور سمیت کل چھ لوگ سوار تھے۔ ان کے چہروں پر تناؤ تھا۔ ٹھاکر رن ویر سنگھ سامنے کی سیٹ پر تھے۔ ان کی پیشانی کی شکنیں ان کی فکرمندی کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان کے دو محافظ ان کی پشت پر مستعد تھے۔ ایک وہ جوانھیں موجودہ سرکار نے فراہم کر رکھا تھا اور دوسرا ان کا اپنا ملازم تھا۔ ان کے علاوہ کار میں پولیس کا ایک افسر بھی اپنی پوری وردی میں موجود تھا اور ٹھاکر صاحب کے کل پروہت پنڈت برہم دت چترویدی بھی ساتھ تھے۔ کار کے فرش پر کچھ دستی بم، بندوقیں، ریوالور اور رائفلیں ایک بورے میں لپیٹ کر رکھی ہوئی تھیں۔ جو ان کی آج کی مہم کی خوفناکی پر دلالت کر رہی تھیں۔ ایک بڑی ٹنکی میں پٹرول بھی بھرا ہوا رکھا تھا۔ یہ لوگ آپس میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے، جیسے ساری باتیں ہو چکی تھیں اور جو کچھ ہونا تھا پہلے سے طے ہو چکا تھا۔ اب بس کام کے انجام دینے کا وقت تھا۔

کار کے ڈرائیور اور ٹھاکر رن ویر سنگھ نے دیکھا کہ اچانک کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے کھڑے پرانے ٹرک کا انجن بیدار ہوا اور انھیں کی سمت آگے بڑھنے لگا۔ کار کے ڈرائیور نے اپنی رفتار کچھ کم کر دی۔ اسے ٹرک ڈرائیور کی حماقت اور ناعاقبت اندیشی پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے تنبیہی انداز میں ہارن بجایا۔ لیکن وہ ٹرک اس کی تنبیہ کو نظر انداز کرتا ہوا بیچ سڑک پر رفتہ رفتہ اپنی رفتار بڑھا رہا تھا اور بڑی بے پروائی سے انھی کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ یہاں سڑک بھی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ کار کا ڈرائیور ٹرک ڈرائیور کی منشا سمجھ پاتا ایک زوردار آواز کے ساتھ ٹرک کار سے ٹکرائی اور نیچے کھڈ میں گر گئی۔ جارح ٹرک کی اگلی سیٹ سے ہمدان علی خاں نیچے

کودے۔ان کے پیچھے پیچھے ان کا ڈرائیور سریش کمار بھی دوسری طرف سے کودا۔ دونوں سڑک کے ایک طرف کھڈ میں گری ہوئی کار کے پاس پہنچے۔ ہمدان علی خاں نے قریب جا کر کار کو غور سے دیکھا۔ کار کا سامنے کا حصہ بری طرح پچک گیا تھا۔ اندر ایک طرف کار کے ڈرائیور کا مردہ جسم مڑے تڑے اسٹیرنگ وہیل میں پھنسا ہوا تھا اور دوسری طرف ٹھاکر رن ویر سنگھ کی گردن کھڑکی کے کانچ میں الجھی تھی۔ ان کے سینے پر بھی گہرے زخم تھے۔ وہ مر چکے تھے۔ ان کے دونوں باڈی گارڈ اس حد تک زخمی اور بیہوش حالت میں پڑے تھے کہ ان کا زندہ حالت میں کسی قریبی اسپتال تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ پولس کی وردی والا شخص ابھی کراہ رہا تھا۔ اسے زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی۔ ہمدان علی خاں نے حقارت سے اس پر ایک نظر ڈالی اور اپنا ریوالور نکال کر اس کے سینے پر ایک فائر جھونک دیا اور وہ ایک ہی لمحے میں تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ تمک لگائے ہوئے شخص کو وہ پہچان نہیں سکے۔ وہ بھی زخمی اور بیہوش حالت میں پڑا تھا لیکن اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ پہلے تو ہمدان خاں نے اسے بھی ختم کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنا پستول والا ہاتھ اٹھایا بھی، لیکن پھر کچھ سوچ کر ریوالور پر ایک پھونک ماری اور اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ان کے چہرے پر اطمینان کی ایک جھلک دکھائی دی۔ انھوں نے اپنے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ 'مطلب یا کہ وا لرکا کی کھبریا اک دم سہی رھی'۔

'میں تو پہلے سے کہت رھیوں سردار کہ لاگت ہے یا لرکا جھوٹ نہیں بولت'۔ ڈرائیور نے کہا۔ 'پر آپ اوھی کا گھروا ماں بند کرکے اپن بات کا پرکھب جروری سمجھت رھیں'۔

'ھاں، اگر ہم گلت نہیں کیہن۔ ایسے مامِلَن مَاں تسدیک بہت جروری ہوت ہی۔ اب چل کے اوئیں لرکا کا کُچھ اِنام وِنام نے کے چھوڑ دیاب، وہو کھس ھتھوں کُھس'۔ ہمدان علی خاں نے کہا۔ 'ٹھاکر رن بیر سنگھ ھمار بہت پران دوس رھین۔ ھم دونوں مل کے نا جانے کے تھو مہم سر کیے ھونگے۔ ھم کا انہوں یکین نہیں آوت کہ اوئیں ھمرے کھلاف ہوئی کے ھمیں برباد کرے کے بارے ماں سوچت رھیں'۔ انھوں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ 'آکھر رھیں تو کاپھر نا'۔

یہ سن کر سریش خاموش ہو گیا۔ وہ گذشتہ اٹھارہ برسوں سے ان کے ساتھ تھا۔ وہ ان کے تمام اچھے برے کاموں میں ہمیشہ شریک رہا لیکن اس نے کبھی سردار ہمدان علی خاں کو اس طرح مذہب کی

بنیاد پر حقارت آمیز لہجے میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔ اس نے اس خیال کو ان کی ہنگامی سنک سمجھ کر جھٹک دیا اور بولا۔ "سردار، مُنھ چھوٹا ھے اَر بات بڑی، پر آپ کا اوئیں پولیس والے کا گولی نہ مارے کا رھی۔ اب پولیس ایٹی کالکونوں ترا اکسیڈنٹ نہ مانی اَر تہتیس کری"۔

"چُپ بے، کونوں کام کرے کے پھلے پٹھان یا سب نہیں سوچت۔ بس اوئی کا مارے کا جی نہا مار دٹیین"۔ ہمدان علی خاں نے اس سے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن انھیں بھی اب اپنی اس غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ اچانک اداس ہو گئے۔ خاموشی سے ٹرک پر بیٹھ کر انھوں نے ڈرائیور سے گاؤں واپس چلنے کو کہا۔ اب وہ سوچ رہے تھے کہ جائے حادثہ کا معائنہ کرنے کے بعد پولیس کن کن امکانات کی بنیاد پر تفتیش کرے گی۔

ٹرک ڈرائیور نے نہایت اطمینان سے پہلے ٹرک کو کچھ پیچھے کیا، ایک لمبا ٹرن لیا اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف سڑک پر آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ سسر کھدیری ندی کے پاس پہنچے، جو برسات میں اپھان پر تھی۔ انھوں نے پل کے اوپر سے ٹرک کو ندی میں کدا دیا اور اس پار کھڑی اپنی جیپ میں بیٹھ کر اپنے گاؤں واپس آ گئے۔

چھتیس

چندن پور کے رہنے والے بیشتر مرد آج اپنے ہاتھوں میں تیل پلائی ہوئی لاٹھیاں لیے پوری طرح مستعد تھے۔ بستی کے باہر برگد کے بڑے پیڑ کے نیچے جمع ہو کر وہ اپنے مربی ٹھاکر رن وِیر سنگھ کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے لیے آج کا دن اور دنوں کی طرح نہیں تھا۔ انھیں خوشی تھی کہ انھیں آج ایک بار پھر موقع مل رہا تھا کہ وہ ٹھاکر رن ویر سنگھ کے لیے کچھ کر سکیں۔ آج ٹھاکر صاحب پہلی بار بہ نفس نفیس ان کے گاؤں آ رہے تھے۔ اس سے پہلے ہمیشہ ان کا کوئی کارندہ ان کے لیے کام لے کر آیا کرتا تھا۔ ان کے خود آنے کی خبر ان کا ایک آدمی ایک ہفتے پہلے انھیں دے گیا تھا۔ لیکن وہ لوگوں کے پوچھنے کے باوجود یہ نہیں بتا پایا تھا کہ ان کے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ بات خود ٹھاکر صاحب انھیں بتائیں گے۔ گاؤں کے لوگ یہ بہر حال جانتے تھے کہ کام کی نوعیت پچھلے کاموں سے اہم ضرور ہوگی لیکن مختلف نہیں

ہوگی۔شاید اب کی بار یہ کام کچھ بڑے پیمانے پر کرنا ہوگا جبھی وہ خود یہاں آرہے ہیں۔اس آدمی نے یہ بھی بتایا تھا کہ سارا سامان اور ہتھیار وغیرہ وہ خود اپنے ساتھ لائیں گے۔وہ صبح اٹھ کر جلدی جلدی تیار ہوئے تھے، ان کے بدن پر صاف اور دھلے ہوئے کپڑے تھے اور اب وہ بستی کے باہر برگد کے پیڑ کے نیچے بڑی بے چینی سے ٹھاکر صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ٹھاکر صاحب نے اس سے پہلے بھی متعدد بار ان کی خدمات حاصل کی تھیں اور انھوں نے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے دیے ہوئے کاموں کو انجام دیا تھا۔وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ٹھاکر صاحب چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے بھی ان کی امید سے زیادہ معاوضہ دیتے ہیں۔لیکن آج کا کام تو کچھ غیر معمولی لگ رہا تھا۔کیونکہ ٹھاکر صاحب نے کہلوایا تھا کہ اس کام کا معاوضہ پہلے سے دوگنا دیا جائے گا۔وہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ ان کا اگلا سال عیش و آرام کے ساتھ گزرنے والا ہے۔ابھی تک جو کام وہ کرتے تھے وہ سب لوٹ مار جیسا تھا لیکن ٹھاکر صاحب نے کہلوایا تھا کہ یہ کام دھرم کا ہے۔یعنی اس بار پیسے کے ساتھ ساتھ پنیہ بھی ملے گا۔ان کی مدد سے ٹھاکر صاحب کا کیا فائدہ ہوتا تھا یہ تو وہ نہیں جانتے تھے لیکن ان کاموں سے نجی طور پر انھیں یہ فائدہ ہوا تھا کہ کسی زمانے میں نہایت طاقت ور سمجھے جانے والے مسلمان پٹھانوں کی بستی کوٹ کا دبدبہ ان کے پے بہ پے کارناموں کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا۔اب ان کی جگہ خود ان کا اپنا دبدبہ تھا۔اب چندن پور کا نام سن کر لوگوں کی روح کانپتی تھی۔علاقے کی پولس بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ پاتی تھی۔اور اگر کبھی کچھ ہو بھی جائے تو ٹھاکر صاحب آگے آکر معاملے کو سنبھال لیتے تھے۔اس طرح تھوڑے دن حوالات کی سیر کرنے کے علاوہ ان کا کچھ بھی نقصان نہیں ہوا کرتا تھا۔اب آس پاس کے مسلمان، جن کے کبھی ڈنکے بجا کرتے تھے، ان سے ڈرے سہمے رہتے تھے۔اور ان سے عزت کے ساتھ برابری کا سلوک کرنے لگے تھے۔

چندن پور قصبہ کوٹ کے پاس ایک چھوٹی سی بستی تھی جس میں بمشکل پچاس ساٹھ خاندان آباد تھے۔ان میں کچھ کیوٹ تھے اور کچھ کھٹک۔ان کا ذریعہ معاش کوٹ کے پٹھانوں کے کھیتوں میں کام کرکے یا انھیں ادھیا بٹائی میں لے کر جی توڑ محنت کرنا تھا۔چونکہ یہاں کی زمینیں زیادہ زرخیز نہیں تھیں اور فصل پوری طرح بارش پر منحصر تھی، اس لیے اکثر انھیں اتنا غلہ بھی نہیں مل پاتا تھا کہ سال بھر اپنے افراد خاندان کا پیٹ پال سکیں۔شاید یہی وجہ تھی کہ ان کی اکثریت چوری ڈکیتی، یہاں تک کہ قتل و غارت گری کو بھی معاش کا ذریعہ بنائے ہوئے تھی۔ان کی کوشش یہ ضرور ہوتی تھی کہ وہ کوئی واردات

اپنے گاؤں یا آس پاس کے گاؤں میں نہ کریں۔ ٹھاکر رن ویر سنگھ ابھی چند برسوں سے ان کے مربی اور سرپرست کی حیثیت سے ابھرے تھے۔ وہ نہ صرف مشکل اوقات میں ان کی مدد کرتے تھے بلکہ ان کے لیے کچھ جائز یا ناجائز کاموں کا انتظام بھی کر دیتے تھے، جس کے معاوضے کے طور پر ملنے والی رقم سے ان کا اور ان کے خاندان کا خرچ چل جاتا تھا۔ یہ سب لوگ اپنی اس طرح کی زندگی سے پوری طرح مطمئن تھے۔

صبح سے وہ بڑی بے چینی سے ٹھاکر صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ چار پانچ گھنٹے گذر جانے کے باوجود ابھی تک ٹھاکر صاحب نہیں پہنچے تھے، اس بات سے وہ بے حد فکرمند تھے۔ پہلے تو انھیں خیال ہوا کہ شاید انھوں نے اپنا یہاں آنے کا ارادہ بدل دیا ہوگا لیکن جو لوگ ٹھاکر صاحب کو قریب سے جانتے تھے اور ان کی عادتوں سے واقف تھے وہ اس خیال کی تردید کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹھاکر صاحب بات کے دھنی ہیں۔ ان کی کہی بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ یہاں آنے کا وعدہ کریں اور نہ آئیں۔ ہو سکتا ہے ان کے ساتھ کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ لیکن جب ان کا انتظار نا امیدی میں بدلنے لگا اور دوپہر ہو گئی تو ان کی بے چینی بڑھی۔ انھوں نے بستی کے ایک نوجوان کو سائیکل سے دوڑایا کہ وہ اس راستے پر جا کر کچھ خیر خبر لائے۔ اسے یہ بھی تاکید کی گئی کہ اگر ان کی گاڑی راستے میں نہ دکھائی دے تو وہ ان کے گھر تک چلا جائے اور صحیح صورت حال کی اطلاع لے کر آئے۔ ان کے گھر کا فاصلہ تقریباً بیس میل کا تھا لیکن یہ فاصلہ طے کرنا ان کے روزمرہ کا حصہ تھا۔ وہ نوجوان گیا لیکن ایک گھنٹے کے اندر ہی واپس آ گیا۔ اس کے پاس دل دہلا دینے والی یہ خبر تھی کہ ٹھاکر صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ٹھاکر صاحب کی گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی ہے اور وہ اس حادثے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ پہلے تو انھیں اس خبر پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ٹھاکر صاحب جیسا دبنگ آدمی اس طرح مر سکتا ہے لیکن اس نوجوان کی سنجیدگی انھیں یقین کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اوپر والے کا حکم بڑے چھوٹے کا لحاظ نہیں کرتا۔ نوجوان نے جائے حادثہ کی تفصیلات بتائیں تو معلوم ہوا کہ وہ جگہ ان کے گاؤں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ سب فوراً ہی وہاں کے لیے پیدل روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ پولیس آ چکی ہے۔ ٹھاکر صاحب اور ان کے دو ساتھیوں کی لاشیں پنچ نامہ کے بعد پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی جا چکی ہیں۔ باقی لوگوں کو جو شدید طور پر زخمی تھے

اسی گاڑی سے فتح پور کے اسپتال بھیج دیا گیا ہے۔ اب وہاں پر تفتیش کی کارروائی چل رہی تھی۔ پولیس کی پریشانی یہ تھی کہ جائے حادثہ کے آس پاس کوئی بستی نہیں تھی چنانچہ اس حادثے کا کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا۔ ان کی تشویش کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ پولیس کا ایک اعلیٰ افسر بھی مرنے والوں میں شامل تھا اور وہ حادثے سے نہیں پستول کی گولی سے مرا تھا۔

چندن پور کے باشندوں کو پولیس کی ان سرگرمیوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ ٹھاکر صاحب اب زندہ نہیں تھے اس لیے ان کی ذات سے ان کی تمام دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ اب انھیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ آئندہ ان کا کیا ہوگا۔ ٹھاکر صاحب ان کے مستقبل کی خوش حالی کی ضمانت تھے۔ اب ان کے مر جانے کے بعد وہ اپنی زندگی کس طرح گذاریں گے۔ انھیں نہ یہ معلوم تھا کہ آج ٹھاکر صاحب ان سے کیا کام لینے والے تھے اور نہ انھیں اب اس بات کو جاننے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ انھیں تو بس افسوس اس بات کا تھا کہ آج ان کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا تھا اور اچھی خاصی رقم ان کے ہاتھ آتے آتے رہ گئی۔ ان کی موت انھیں فکر مند کر رہی تھی کہ اب قریب و دور کوئی ان کا سر پرست نہیں رہ گیا تھا جو مشکل وقتوں میں ان کی مدد کر سکے۔ انھیں اس بات کی بھی فکر دامن گیر تھی کہ جیسے ہی کوٹ کے پٹھانوں کو اس بات کی اطلاع ملے گی کہ ٹھاکر صاحب نہیں رہے تو وہ ان سے گن گن کر بدلہ لیں گے۔ علاقے کی پولیس الگ ان سے خار کھائے بیٹھی تھی۔ اب ان کے خلاف کارروائی کرنے سے انھیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ کچھ دکھ اور کچھ خوف کے سائے میں تھکے قدموں سے اپنے ایسے ہی خیالات میں ڈوبے اُتراتے وہ اپنے گاؤں کی جانب لوٹ رہے تھے۔

ستائیس

مسعود خاں کو حیدر آباد کی سالار مسجد میں بم رکھنے کی اطلاع ایک دوسری تنظیم کے خفیہ شعبے میں تعینات اپنے ایک معتبر مخبر سے ملی تھی۔ اس اطلاع پر پوری طرح اعتبار کیا جا سکتا تھا۔ اب اس مذموم اور خوف ناک منصوبے کو کامیاب نہ ہونے دینے کی ساری ذمے داری مسعود کی تھی۔ اس نے اس کی اطلاع اکابرین حرکت البشر کو دے دی تھی اور حسب توقع انھوں نے یہ کام اسی کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کا پہلا کام ایسا لائحۂ عمل تیار کرنا تھا جس سے اس حادثے کو ٹالا جا سکے۔ وہ حرکت البشر کے اس اصول کو کبھی فراموش

نہیں کرسکتا تھا کہ انھیں اپنے سارے کام ہمیشہ پوشیدہ طور پر انجام دینے ہیں۔یعنی نہ ستائش کی تمنا ہو اور صلے کی پروا۔ان کی تنظیم کا واحد مقصد بس انسانیت کی بہبود اور اس کو ممکنہ حد تک ہر خطرے سے محفوظ رکھنا ہے۔اسے یاد آرہا تھا کہ خود اس کی آزمائش بھی اسی نوع کے کام سے کی گئی تھی۔اس نے بنارس میں نہایت کامیابی کے ساتھ ایک مندر کو تباہ ہونے اور متعدد افراد کو جان کے زیاں سے بچایا تھا اور اس طرح ایک بہت بڑا فتنہ وجود میں آنے سے پہلے ہی فرو ہو گیا تھا۔وہ اپنی اس آزمائش میں کامیاب رہا تھا۔جب اسے اپنا رپورٹ کارڈ ملا تھا تو اس میں اس کی ہمدردی، دوراندیشی اور فوری طور پر ذہانت کے استعمال کی تعریف کی گئی تھی۔اس کارنامے کے طفیل ہی اسے حرکت البشر کے اکابرین کا اعتماد حاصل ہوا تھا اور اسے شعبہ عمل کے ایک ذمے دار عہدے پر فائز کر دیا گیا تھا۔لیکن اسی کارڈ پر اس کی کچھ کمزوریوں کی جانب بھی اشارہ کیا گیا تھا جن کا تعلق اس کی نفسیات سے تھا۔اس کے بعد سے جب جب اسے کوئی مہم درپیش ہوتی تو یہ کمزوریاں اسے خوف زدہ کرنے لگتی تھیں اور وہ کچھ زیادہ ہی محتاط ہو کر اپنے کام میں لگ جاتا تھا۔اب اسے اس طرح کے کاموں کا خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔اس نے اپنی ذہانت اور مختلف کارناموں سے تنظیم کے اکابرین کو متاثر کیا تھا اور ہر بار اسے پہلے سے زیادہ اہم ذمے داریاں سپرد کی جانے لگی تھیں۔

اس وقت وہ بھوپال میں قیام پذیر تھا اور اپنے متعدد ماتحتوں کے ساتھ یہاں تنظیم کے استحکام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مصروف تھا۔ادھر کافی دنوں سے ہندوستان کے طول و عرض میں کچھ امن و امان تھا، اس لیے یہ وقت ایسے کاموں کے لیے وقف کیا گیا تھا جس کے دور رس نتائج مرتب ہو سکیں۔وہ کافی دنوں سے بھوپال کے مسلمانوں کو متحد کرنے اور انھیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شامل رہنے کی تلقین میں مصروف تھا۔یہ کہنا تو قبل از وقت تھا کہ وہ کامیاب ہوا تھا لیکن اسے لگ رہا تھا کہ آنے والے ایک دو برسوں میں اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔حرکت البشر میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے اور اخراجات کی حدوں سے بے نیاز ہونے کے باوجود وہ جینڈ ماسٹر چوراہے کے پاس دو کمرے کے ایک نہایت معمولی فلیٹ میں رہتا تھا۔کھانے کا انتظام بھی اس نے بدھوارہ چوراہے کے ایک معمولی اور سستے ہوٹل میں کیا تھا۔اسے آرام دہ زندگی گذارنے کا شوق تھا بھی نہیں۔اس طرح وہ اپنی تنظیم کے اہم کاموں کے لیے پیسہ بچاتا تھا اور اپنے پسندیدہ معیار کے

مطابق زندگی بھی گذار رہا تھا۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس شہر میں اس کے گاؤں کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد آباد تھی اور اسے ہر لمحہ پہچان لیے جانے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ اس میں اس کی بڑھی ہوئی داڑھی اور آنکھوں پر مستقل چڑھا ہوا گہرے کالے رنگ کا چشمہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ وہ ان محلوں میں کچھ زیادہ ہی محتاط رہتا تھا جہاں ان لوگوں کی آبادی زیادہ تھی۔ ان میں سے وہ بیشتر لوگوں کو پہچانتا بھی تھا لیکن وہ کبھی اس شناسائی کا اظہار کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ اس شہر میں اس کا پہلا سال اسی ڈر کے ساتھ گذرا تھا لیکن اب اس کی خود اعتمادی بحال ہو چکی تھی۔ وہ ان میں سے اکثر کے گھر دعوت بھی کھا چکا تھا اور انھیں شک بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ جس شخص کی خاطر مدارات کر رہے ہیں وہ ان کے گاؤں کا رہنے والا ہی نہیں ان کا رشتہ دار بھی ہے۔

حیدرآباد میں رچی جانے والی اس سازش کی خبر سے اس کے دل کا کوئی گوشہ کچھ مسرور بھی تھا۔ شاید اس لیے کہ کافی دنوں کے وقفے کے بعد ایک بار پھر ایک اہم ذمے داری اس کے سپرد کی گئی تھی اور ایک بار پھر اس میدان میں وہ اپنی مہارت اور ذہانت کا ثبوت فراہم کر سکتا تھا۔ اسد البشر سے فون پر بات کیے ہوئے اسے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس وقت اس کے کمرے کی گھڑی رات کے بارہ بجا رہی تھی۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ ایسا اکثر اس وقت ہوا کرتا تھا جب وہ کسی اہم اور خطرناک ذمے داری کو پورا کرنے کے لیے مستعد ہوتا تھا۔ اسے اس کی فکر بھی نہیں تھی۔ کیونکہ سونا اور آرام کرنا اس کی ترجیحات زندگی کا حصہ نہیں تھے۔ یہ محض زندگی کی ضرورت تھی اور وہ اسے اسی حد تک اہمیت دیتا تھا جتنا زندہ رہنے کے لیے ضروری ہو۔ چنانچہ وہ اس وقت تجارات کے سناٹے میں، جب ساری دنیا نیند کی آغوش میں تھی، گہری فکر میں غلطاں تھا۔ اچانک وہ اٹھا۔ جیسے وہ اپنے غور و فکر سے کوئی نتیجہ نکال چکا ہو۔ اس نے اپنے خفیہ موبائل پر اپنے ایک ماتحت علی حسین کو فوراً آ کر ملاقات کرنے کا حکم دیا۔ اس کی رہائش گاہ قریب ہی تھی۔ بیس منٹ کے اندر وہ آ بھی گیا۔ مسعود نے اس سے کہا کہ وہ اپنے تمام رفیقوں کو ٹیلی فون بوتھ سے اطلاع دے کہ فوراً اسی وقت وہ عیدگاہ ہال کے پاس اپنے مقررہ مقام پر پہنچیں۔ علی حسین کے جانے کے بعد وہ خود بھی تیار ہونے لگا۔

اٹھائیس

ٹھاکرن ویر سنگھ کی حادثاتی موت کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اب چندن پور کے لوگ فکر مندی کے حصار سے باہر نکل کر اپنے شب و روز کی طرف لوٹ آئے تھے۔ حالانکہ اس فکر سے باہر نکلنا ان کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ لیکن وقت تو ہر طرح کے غموں پر مرہم رکھ دیتا ہے، ان کا یہ زخم بھی وقت ہی نے مندمل کر دیا تھا۔ اب وہ نئے حوصلے کے ساتھ کھیت مالکوں سے ان کے کھیتوں کو حاصل کرنے اور ان زمینوں پر جی توڑ محنت کے لیے تیار تھے۔ اس کے لیے انھوں نے ان تمام لوگوں سے روابط بہتر بنانے شروع کر دیے تھے جن کے پاس ان کی خدمات حاصل کرنے کے لیے کھیت تھے۔ یہ لوگ کوئی اور نہیں کوٹ اور قریب کے گاؤں غازی پور کے مسلمان پٹھان ہی تھے۔ جن سے رشتے استوار رکھنا انھوں نے پچھلے چند برسوں میں ضروری نہیں سمجھا تھا۔ لیکن اب ان دونوں جگہ ان کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ وہ معصوم پٹھانوں کی کمزوریوں سے واقف تھے اور ان سے اپنا کام نکالنا بخوبی جانتے تھے۔ برسات کا موسم قریب تھا۔ چنانچہ یہ لوگ اگلے وقتوں کی طرح گھر گھر جا کر لوگوں کے کھپریل اور چھپر ٹھیک کرنے کی پیشکش کر رہے تھے۔ جو اس گاؤں کا قدیمی دستور تھا۔ یہاں یہ بات عرصے سے طے شدہ تھی کہ جو لوگ کھیتی کرنے کے لیے کھیت مالکوں کے کھیت لیں گے وہ بیگار میں ان کے گھروں کی دیکھ بھال اور مرمت کا کام بھی کریں گے۔ خصوصاً برسات سے پہلے۔ اس کے لیے انھیں کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا البتہ دن بھر کے کھانے پینے کی ذمہ داری کام کروانے والوں کی ہوتی تھی۔ ان کی یکا یک اس طرح سے گاؤں میں آمد و رفت کو ایک طرف جہاں مسلمان سمجھ نہیں پا رہے تھے وہیں دوسری طرف چندن پور کے نوجوان اپنے پھر سے محنت مزدوری کرنے کے تصور سے دکھی تھے۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا وہ بھی وہی کچھ کر رہے تھے جو اُن کے بزرگ ان سے کہہ رہے تھے۔ ان کے دلوں میں یہ خلش تھی کہ اب انھیں پھر ان مسلمانوں کی غلامی کرنی ہوگی جن کو وہ ایک مدت سے نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ عام طور پر ان پٹھانوں کو یہ احساس نہیں ہو پایا تھا کہ ان مزدوروں کے، جنھیں وہ 'پَرجا' کہتے تھے، اس بدلے ہوئے رویے کا سبب ٹھاکرن ویر سنگھ کی موت ہے۔

ایک صبح جب چندن پور کے لوگ اپنے معمول کے مطابق اٹھ کر کھیتوں پر کام کے لیے جانے کی تیاری کر رہے تھے تو ان کی نظر کوٹ کی جانب سے آتے ہوئے دس بارہ گھڑ سواروں پر پڑی، جن کی سربراہی سیاہ گھوڑے پر سوار سردار ہمدان علی خاں کر رہے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں

بندوقیں اور رائفلیں بھی تھیں۔ اور ان کا رخ ان کے گاؤں کی جانب ہی تھا۔ ان کو اس طرح اپنی طرف آتے دیکھ کر سارے گاؤں میں جیسے بھگدڑ مچ گئی اور جتنی جلدی ہو سکا سب لوگ اپنے اپنے گھروں کے اندر جا کر جس کے پاس جو ہتھیار تھا لے کر باہر آ گیا۔ ان کو آنے والوں کی نیت کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن انھیں اس بات کی تسلی تھی کہ آنے والوں کی مجموعی تعداد ان کے گاؤں کے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ نہیں تھی۔ فرق تھا تو بس یہ کہ آنے والے لوگوں کے پاس جدید ترین ہتھیار تھے اور ان کے گاؤں والوں کی اکثریت بس لاٹھیوں کے سہارے تھی۔ یہاں چند ہی لوگ تھے جن کے پاس اپنی بندوقیں تھیں۔ وہ بھی بہت پرانے انداز کی۔

بالآخر ہمدان علی خاں گاؤں میں داخل ہوئے۔ گاؤں والوں کو یہ دیکھ کر کچھ تسلی ہوئی کہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جو اس بات کی دلیل تھی کہ ان کی نیت لڑائی جھگڑے کی نہیں ہے اور ڈرنے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً اپنا رویہ بدلا اور دوڑ دوڑ کر ان مہمانوں کے لیے پانی اور ناشتے کا انتظام کرنے لگے۔ ہمدان علی خاں سیدھے گاؤں کے مکھیا کے گھر کے پاس جا کر رکے اور باہر بچھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ نندکمار نے ان کے پاؤں چھوئے اور عزت سے انھیں گڑ اور پانی پیش کیا۔

ہمدان خاں نے صرف پانی لے کر پیا اور اس سے مخاطب ہوئے۔ 'نندا، تے تو سمجھی گئے ہوئیہے کہ ہیاں ہمار آوے کا مکسد کا ہوئی سکت ہے'۔

'ہم کچھ نہیں سمجھن مالک'۔ نندکمار نے واقعی کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

'ہم یہ بتاوے آئے ہن کہ ایں دوئی چار سال ماں تم لوگن نے ہمرے گاؤں والن کا جون ترا پریسان کرے رہیو۔ ہم اب چاہی تو دوئی بنٹ ماں یا گاؤں اور ہیاں رہے والن کا پرلوک پہنچا دیئی'۔ ہمدان علی خاں کا انداز خالص پٹھانی اور دھمکی آمیز تھا لیکن ان کے چہرے میں نرمی تھی اور وہ شعوری طور اپنے لہجے کو سخت ہونے سے بچا رہے تھے۔ 'پر ہم ہیاں یا سب کھے کرے نہیں دوستی کا ہاتھ بڑھائے کا آئین ہن۔ اگر تم سب ہمار دوستی کا کبول کر لیہو تو آگے آوے والا وخت بڑا اچھا گجر جائی۔ تمہارو اور ہمارو۔ پر اگر تم لوگن کا یا منجور نہ ہووے تو صاف صاف ہم کا بتا دیہو۔ جواب ابہن دیاب جروری نہیں نا۔ تم اپنے تمام لوگن سے بات کر لیاو۔ اور جو کچھ پھیسلا کرو اکے ہم کا بتا دیہو'۔

'مالک ہم آپ کی پرجا ہن، ہم بھلا کا آپ لوگن سے لڑب'۔ نندکمار نے ایسے کہا جیسے

اس نے اپنے تمام لوگوں سے پہلے ہی بات کرلی ہو۔'ھم جانت ھن کہ ھمرے اور آپ لوگن کے بیچ مَاں کُچھ گلت لوگ پُھوٹ ڈلوا دیہن رھن. اَب ھمری سمجھ ماں سب آگا ھے. آپ اَب ھمری تَرپھ سے نِشچنت رَھو. ھم این لائک تو ھن نھیں پر آپ چاھیں تو ھم کا اَپنا دوس سمجھ سکت ھیں.ھمار پُورو وَج اور ھم آپ کا نمک کھائن ھن. ھم آپ لوگن کے لیے اپن جان بھی دئی سکت ھن'۔

ہمدان علی خاں کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔وہ ان کیوٹوں اور کھنگوں کو ایک عرصے سے جانتے تھے۔اگر ان کی روزی روٹی کا معقول بندوبست کر دیا جائے تو انھیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔اس لیے انھیں ان کی اس بات پر آسانی سے یقین آ گیا کہ ضرورت پڑنے پر وہ ان کے لیے جان دے سکتے ہیں۔وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے لیے جان لینا اور جان دینا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔بس ان کو استعمال کرنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔پچھلی بار وہ اس معاملے میں ٹھاکر رن ویر سنگھ سے ہار گئے تھے لیکن اب کی بار وہ کوئی غلطی کرنا نہیں چاہتے تھے۔وہ سمجھ رہے تھے کہ سب سے پہلی ضرورت ان سب کے دلوں میں اپنے لیے اعتماد پیدا کرنا ہے۔انھوں نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے نند کمار سے کہا۔'نندا، دیکھو آب ھم دوس ھن۔اور دوستی کا نِبّاھ کرے کی کھاتر کَھت ھن کہ جَبھوں این گائوں کے لوگن کا ھمار جَرورَت پرے تو بے جھجک ھمرے دَروَاجے پر آ جائے. ھم اُن کی ھر جَرورَت پوری کر دیاب.'آپ گھر جاکے ھم تین بوَرَا گوھوں اور تین بوَرا چَنا اپنے آدمی سے بھجوا دیاب. تُم جھِیکا جھِیکا جَرورَت ھوے نہ دیھو'۔یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور نند کمار کو گلے سے لگا لیا۔گاؤں والوں نے یہ انہونی ہوتے دیکھی تو خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔یہ اس بات کا بھی ثبوت تھا کہ اپنے مکھیا کے فیصلے پر تمام گاؤں میں اتفاق رائے ہے۔اس سے پہلے ایسا کبھی ہوا بھی نہیں تھا کہ کسی پٹھان نے کسی کیوٹ کو اس طرح گلے سے لگایا ہو۔اس کے بعد ہمدان علی خاں اپنے تمام آدمیوں کو ساتھ لے کر جس طرح آئے تھے اسی طرح اپنے گاؤں کی طرف واپس چلے گئے۔

ہمدان خاں زبان کے پکے تھے۔وہ بھی زبان کے لیے جان تک دے دینے کی روایت پر کاربند تھے۔وہ مہر و محبت کی طاقت بھی جانتے تھے اور اس پر پورا یقین بھی رکھتے تھے۔انھوں نے گھر

پہنچتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنے کیے گئے وعدے کے مطابق اپنی ہی بیل گاڑی سے گیہوں اور چنے کے بورے نندکمار کے پاس چندن پور بھجوا دیے۔ ان کے اس عمل نے جیسے ان کے بارے میں چندن پور کے لوگوں کی رائے ہی بدل دی تھی۔ اب وہ ہندو مسلمان بھول گئے تھے۔ جیسے ہندو مسلمان کی تفریق ان کے لیے روٹی روزی سے وابستہ ایک مسئلہ تھا اور کچھ نہیں۔ روٹی روزی کا مسئلہ حل ہوا تو سارا تعصب جیسے ہوا ہو گیا۔ اب وہ خود کو ان کے احسان تلے دبا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ پیٹ میں روٹی گئی تو نوجوانوں کو بھی یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ میل جول میں بڑی برکت ہے۔ دوستی کی اس استواری کے پیچھے ہمدان علی خاں کا خواہ کوئی بھی مقصد رہا ہو، لیکن اس واقعے سے دونوں گاؤں کے رہنے والوں کو یک گونہ اطمینان نصیب ہوا تھا۔ ان کے درمیان اعتماد میں اضافہ ہوا تھا۔ اور دل خوش کن بات یہ تھی کہ آنے والے دنوں میں دونوں گاؤں کے لوگ بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگے تھے۔

اکتیس

بالآخر حیدر آباد کی سالار مسجد میں بم دھماکا ہو ہی گیا۔ اس حادثے میں متعدد لوگوں کے زخمی ہونے کے ساتھ ساتھ سولہ لوگوں کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ ظاہر ہے یہ حادثہ مسجد کے صحن میں عین جمعہ کی نماز کے وقت ہوا تھا۔ اس لیے مرنے والے صرف مسلمان ہی تھے۔ حادثے کے بعد ہمیشہ کی طرح سرکاری عملہ حرکت میں آیا۔ انتظامیہ اور پولیس کے اعلیٰ حکام، مختلف سیاسی جماعتوں کے عوامی نمائندے، صوبے کے وزیر اعلیٰ، مرکزی وزیر داخلہ جوق در جوق جائے حادثہ کی جانب روانہ ہوئے تاکہ وہاں کے لوگوں کا دکھ درد بانٹ سکیں۔ ان کے رویے سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان کے دل میں سچ مچ متاثرین سے ہمدردی ہے یا وہ اپنی سیاست چمکانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ کیونکہ جہاں ایک طرف وہ ہونے والے حادثے پر اپنے افسوس کا اظہار کر رہے تھے وہیں دوسری طرف پریس کے لوگوں سے مسکرا مسکرا کر باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ ان کا یہ رویہ صورت حال کی غمناکی اور سنجیدگی کو متاثر کر رہا تھا۔ ہاں ان کے آنے کے بعد زخمیوں کے علاج کا معقول بندوبست کیا گیا۔ متاثرین کی امداد کا اعلان ہوا، صوبائی حکومت کی جانب سے بھی اور مرکزی حکومت کی جانب سے بھی۔ شہر میں امن و امان قائم رکھنے کی اپیلیں کی گئیں اور کسی طرح کی ناگوار صورت حال کے رونما ہونے دینے کے پختہ انتظامات کیے گئے۔ لیکن

اس حادثے کی تفتیش کے لیے پولیس کی توجہ کا مرکز محض وہ مسلمان تھے جوان کے نقطۂ نظر سے اس طرح کے کاموں کی تربیت پڑوسی ملک میں حاصل کرنے کے بعد ہمارے ملک میں عدم استحکام پیدا کرنے کے لیے ایسی حرکتیں انجام دیتے تھے۔ انھیں یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ ہمارے اپنے ملک میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ انھیں اس زاویے سے معاملے کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی کہ یہ کام ہمارے ہی ملک کی ایسی تنظیمیں بھی انجام دے سکتی ہیں، جن کی آنکھوں میں اس ملک کے مسلمان تنکے کی طرح کھٹکتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی تھی کہ کوئی مسلمان مسجد میں، وہ بھی ایک تاریخی اہمیت کی حامل مسجد میں، عین جمعہ کی نماز کے وقت، جب وہاں مسلمانوں کے علاوہ کسی اور کے ہونے کا امکان نہیں ہوسکتا تھا، یہ کام نہیں کرسکتا تھا۔ انھیں اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ مسلمانوں سے نفرت کرنے والی یہ فرقہ پرست تنظیمیں ملک کی آزادی کے بعد سے کافی مستحکم ہوئی ہیں۔ ان منظم تنظیموں سے ایسی توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ ایسے مذموم کام انجام دے کر ایسے حالات پیدا کردیں کہ شک مسلمانوں پر جائے۔ ان پولیس والوں سے بہتر اس بات کو بھلا کون سمجھ سکتا تھا کہ مسلمان ایسے کام کرتے کم ہیں اور بدنام زیادہ ہوتے ہیں۔ سرکاری مشنری یہ سب جاننا بھی نہیں چاہتی تھی کیونکہ ان کے آقا ایسا کچھ سننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے ساری تفتیش بس خانہ پری کے لیے ایک مخصوص زاویے سے ہورہی تھی۔ آئے دن کوئی نہ کوئی نیا انکشاف ہورہا تھا۔ دھماکا کیسے ہوا۔ اس دھماکے کے پیچھے کون ہے اور اس نے حادثے میں استعمال ہونے والی اشیا کہاں سے حاصل کیں اور ان کا استعمال کس طرح کیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر کچھ لوگوں کی گرفتاری بھی عمل میں آئی۔ لیکن یہ سب اس سے قطعی مختلف نہیں تھا جیسا کہ اس طرح کے کسی بھی ایسے حادثے کے ہونے کے بعد ہمیشہ سے ہوتا رہا تھا۔ اطلاعات کی آسان فراہمی کے اس دور میں اس سے متعلق تمام سرگرمیوں کا علم ہندوستان کے ہر شہری کو ہورہا تھا لیکن اس کے باوجود کسی کو یہ پتہ نہ چل پایا کہ ان مرنے والوں میں ایک ایسا اجنبی نوجوان بھی شامل تھا جس نے اس مسجد کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگادی تھی۔

اور مرنے والا وہ اجنبی نوجوان سید منظور احمد تھا۔ جسے حرکت البشر کے شعبۂ عمل سے مسعود خاں نے اس کام کے لیے متعین کیا تھا۔

تیس

مسعود فکر مند تھا۔ اسے فکر مند ہونا بھی چاہیے تھا۔ اس کے موبائل پر حیدر آباد سے اس کے منصوبے کی ناکامی کی اطلاع آچکی تھی۔ خلاف توقع یہ خبر سن کر وہ حیران و ششدر رہ گیا تھا۔ اسے یہ بات سمجھ میں بھی نہیں آرہی تھی۔ کیونکہ اس نے سارا منصوبہ ایک طویل غور و فکر کے بعد بنایا تھا، جو ہر اعتبار سے محفوظ اور کارگر تھا۔ پھر چوک آخر کہاں اور کس سے ہوئی۔ لاکھ غور و فکر کے بعد بھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ ناکامی بہر حال ناکامی ہوتی ہے۔ اب بعد از ناکامی غور فکر سے فائدہ بھی کیا تھا۔ اب یہ صداقت روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ اس کا بنایا ہوا منصوبہ عمل کی کسوٹی پر کھوٹا ثابت ہوا تھا۔ اس منصوبے کی ناکامی نے صرف اسے تکلیف ہی نہیں پہنچائی تھی بلکہ اس کا اثر اس کی زندگی اور مستقبل پر بھی پڑنے کا قوی امکان تھا۔ اس ناکامی سے تنظیم کے اکابرین کی نظر میں اس کی فکری صلاحیتوں پر سوالیہ نشان بھی لگ سکتا تھا۔ حرکت البشر کے اکابرین کو اس کی تربیت، مہارت اور کام کرنے کے طریقے پر پورا بھروسا تھا لیکن اس ناکامی کے بعد اب اس کی کارکردگی اور ذہانت شک کے دائرے میں آگئی تھی۔ اس سے تنظیم میں اس کا اعتبار ہی مجروح نہیں ہونے والا تھا بلکہ مجموعی طور پر تنظیم کا وقار بھی خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ اور یہ سب وہ زیاں تھا، جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ اسے اس تنظیم میں کام کرتے ہوئے خاصا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس دوران اس نے قرار واقعی کئی کارنامے انجام دیے تھے اور اس کے اکابرین نے کھلے دل سے اسے، اس کی ذہانت اور اس کے طریقہ کار کو سراہا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ ان اکابرین کی نظر میں ناکامی کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ اسی لیے اب وہ سوچ رہا تھا کہ اب اکابرین حرکت البشر یا تو اسے معزول کر کے ملک بدر کر دیں گے یا پھر سزا کے طور پر اسے گولی ماردی جائے گی۔ معزول کیے جانے کے مقابلے میں گولی مار دیے جانے کا امکان زیادہ قوی تھا کہ اس طرح تنظیم کے اسرار محفوظ رہتے تھے۔ لیکن اس وقت اسے اپنی جان جانے کا خوف نہیں، یہ فکر دامن گیر تھی کہ اس کی اس ناکامی سے تنظیم کے اعتبار کو کتنا نقصان پہنچ سکتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی جان کے مقابلے میں تنظیم کے مقاصد زیادہ اہم ہیں۔

لیکن وہ جیسا سوچ رہا تھا ویسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

اسی رات اسے شعبہ فکر سے حافظ البشر کا فون ملا۔ ان کی آواز میں نرمی اور لہجے میں اطمینان کی جھلک تھی۔ اس سے مسعود کو بھی کچھ تسلی ہوئی۔ وہ اس سے کہہ رہے تھے کہ حیدر آباد میں جو ہوا وہ تمہارے

منصوبے کی ناکامی نہیں، اپنوں ہی میں سے کسی کی غداری کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے مسعود خاں کو بتایا کہ حرکت البشر کی تجربہ کار جاسوس دردانہ بہرام نے انھیں یہ اطلاع فراہم کی، اس لیے اس میں شک کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے ایک لمحے کو توقف کیا، پھر بولے 'اب اس غدار کی تلاش اور اسے سزا دینے کا یہ کام تمھارے سپرد کیا جاتا ہے، اور یہ تمھارا اخلاقی فرض ہے کہ تم اس غدار ملک وقوم کو، جس نے چند سکوں کے عوض اپنی زندگی اور اپنے مقاصد کو فروخت کر دیا ہے، تلاش کرو اور اسے قرار واقعی سزا دینے کی پوری کوشش کرو۔ وہ پھر تھوڑی دیر کو رکے، پھر گویا ہوئے 'تم جانتے ہو کہ ہم ایسے لوگوں کے لیے کس قسم کی سزا تجویز کرتے ہیں'۔

حافظ البشر کی بات سن کر مسعود کی جان میں جیسے جان آ گئی۔ لیکن ساتھ ہی اس کی تشویش میں اضافہ بھی ہو گیا۔ وہ یہ سن کر حیران تھا کہ یہ مذموم حادثہ خود ان کے ہی کسی آدمی کی غداری کا نتیجہ ہے۔ وہ ایک عجیب سی کیفیت سے دو چار تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ حافظ البشر سے کیا کہے۔ ایک طرف وہ شرمندہ بھی تھا اور دوسری طرف خوش بھی کہ اس کی تنظیم میں اب بھی اس کا وقار محفوظ ہے۔ اسے خاموش پا کر حافظ البشر نے فون پر کہا 'تم چپ کیوں ہو مسعود خاں'۔

'نہیں امیر، دراصل یہ خبر میرے لیے بڑی حوصلہ شکن ثابت ہوئی ہے۔ میں نے اس معاملے پر بہت غور کیا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا، میرا منصوبہ پختہ تھا اور اس میں ناکامی کے ہر امکان پر میں نے کافی غور وخوض کیا تھا'۔ مسعود خاں نے جواب دیا۔

'تم جتنی جلد ممکن ہو اس مغالطے سے باہر نکلو کہ یہ ناکامی تمھاری کسی غلطی کا نتیجہ ہے'۔ حافظ البشر نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ 'ہمارے پاس اس بات کے وافر شواہد موجود ہیں کہ منظور احمد بھی اس حادثے میں مرنے والوں میں شامل ہے۔ ظاہر ہے جس نے بھی اسے بم دھماکے کے وقت کی اطلاع دی تھی وہ غلط تھی کیونکہ وہ جس وقت بم کو ناکارہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا، دھماکا اسی وقت ہوا، ایک گھنٹے بعد نماز کے وقت نہیں، اور اسے بھی دوسرے کئی لوگوں کے ساتھ اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا'۔

'ہاں اب رفتہ رفتہ یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی ہے امیر'۔ مسعود نے جیسے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ 'مجھے کچھ وقت دیجیے، میں ان شاء اللہ بہت جلد اس کی تہہ تک پہنچ کر حافظ البشر کو مطلع کروں گا'۔

ہمیں تمھاری دور بینی اور خوش تدبیری سے یہی امید ہے۔" حافظ البشر نے کہا اور فون منقطع کر دیا۔

حافظ البشر سے فون پر گفتگو ہو جانے کے بعد مسعود کی فکری جہت مکمل طور پر تبدیل ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنے اندر ایک نئی توانائی اور ایک نیا ولولہ محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ ان تمام باتوں، تمام واقعات اور تمام پہلوؤں پر ایک بار پھر نئے سرے سے اور بڑی باریکی سے غور کر رہا تھا جو منظور احمد کے انتخاب، اسے اور اس کے ساتھیوں کو یہ ذمے داری تفویض کرنے اور انھیں تمام اونچ نیچ سمجھانے کے دوران پیش آئی تھیں۔ وہ ان چاروں کو بہت قریب سے اور بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے ان میں سے ایک ایک کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ ان کے عادات و اطوار، ان کے رہن سہن، ان کے نقطۂ نظر، تنظیم سے ان کی وابستگی کی وجوہ سب اس کے دائرۂ فکر میں ایک ایک کر کے آ جا رہے تھے۔ وہ ان سے ہونے والی ایک ایک بات کو اپنے ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک اسے جیسے روشنی کی ایک کرن دکھائی دی۔ اب وہ جلدی میں تھا اور فوری طور پر کچھ باتوں کی تصدیق کر لینا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس شخص کی تلاش اس کے لیے زیادہ دشوار نہ ہوگی جس کی غداری نے اسے اس شرم ناک صورت حال سے روبہ رو کر دیا ہے۔ وہ اٹھا، اپنا فلیٹ بند کر کے نیچے اترا، اسکوٹر نکالا اور کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

اکتیس

آخرکار پولیس نے ٹھاکر رن ویر سنگھ اور ان کے تین ساتھیوں کی کار حادثے میں ہلاکت اور ایک پولیس افسر کے قتل کی گتھی اپنے طور پر سلجھالی تھی۔ پنڈت برہم دت چترویدی کی قسمت اچھی تھی۔ وہ ایک ہفتے اسپتال میں رہ کر اب مکمل طور پر صحت یاب ہو کر اپنے گھر واپس آ چکے تھے۔ پولیس نے اس واقعے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے تفتیش کی تھی۔ ایک تو اتفاقی طور پر ہونے والا کار حادثہ اور دوسرے لوٹ مار۔ اس سلسلے میں آس پاس کے گاؤں سے پانچ لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ان میں چار مسلمان تھے اور ایک ہندو۔ پولیس کے مطابق ان میں سے دو نے اپنا جرم قبول بھی کر لیا تھا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ اس نے وہ پستول بھی برآمد کر لیا تھا جس سے پولیس افسر پر گولی چلائی گئی تھی۔ اپنے دعووں کے تمام ثبوت حاصل

کر لینے اور گواہوں کا معقول انتظام کرنے کے بعد پولیس نے یہ کیس فتح پور کی ضلع عدالت کے سپرد کر دیا تھا اور اس واقعے کے بعد سیاسی طور پر جو طوفان اٹھا تھا اور محکمہ پولیس میں جو اتھل پتھل مچی تھی، جس کے طفیل انھیں اپنے افسران اعلیٰ سے مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں، ان پر لگام لگ گئی۔ ان کی اس کامیاب تفتیش کے بعد جیسے سب پوری طرح مطمئن ہو گئے تھے۔

لیکن رن ویر سنگھ کے چوبیس سالہ بیٹے کنور مہیندر سنگھ کو پولیس کی کارکردگی اور اس کی تفتیش کے نتائج پر یقین نہیں تھا۔ اس کے حساب سے یہ منصوبہ بند قتل تھا اور وہ اپنے والد کے قاتلوں کی گرفتاری چاہتا تھا۔ اسے پولیس کی کامیابی کی اس خبر سے کوئی خوشی بھی نہیں ہوئی تھی۔ پولیس کی اس دلیل سے بھی اسے اتفاق نہیں تھا کہ حادثہ اتفاقی تھا، جس کی وجہ سے جائے واردات پر ہی اس کے والد کی جان نکل گئی تھی اور حادثے کے بعد اتفاقاً وہاں پہنچے چند لٹیروں نے اسلحوں اور نقدی کی لالچ میں زخمی پولیس افسر کو گولی مار دی تا کہ ان کی لوٹ مار میں کوئی مزاحمت نہ کر سکے۔ یہ بات پولیس نے ہی اسے بتائی تھی کہ اس دن ٹھاکر صاحب کی تحویل میں جو تین لاکھ روپے نقد تھے وہ غائب تھے۔ اور گاڑی میں موجود اسلحے کے ذخیرے میں بھی کچھ کمی کا اندیشہ تھا۔ مہیندر سنگھ نے ان کی باتیں غور سے سنی تھیں لیکن ان کی باتوں کی سچائی پر اسے شبہ تھا۔ البتہ وہ نہ خود ان سے الجھنا چاہتا تھا اور نہ معاملے کو مزید الجھانا چاہتا تھا، اس لیے خاموش رہنا ہی اسے زیادہ ٹھیک لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ پولیس نے کسی طرح کیس کو ختم کرنے اور اپنے افسران اعلیٰ کو مطمئن کرنے کے لیے بس خانہ پری کر لی ہے اور اس کیس کی تفتیش کا کام ان کے بس کا ہے ہی نہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس معاملے میں کچھ کرنا ہے تو یہ سب اب اسے خود ہی کرنا ہوگا۔ لیکن اس کی نظر میں اپنی تعلیم کی تکمیل اس کام کے مقابلے میں زیادہ اہم تھی۔ اب کچھ معلوم بھی ہو جائے تو اس کے والد واپس تو نہیں آ سکتے تھے۔

اس کی نگاہ میں اس کے باپ کا قتل منصوبہ بند طریقے سے کیا گیا تھا۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اس کے والد کے دشمنوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس حادثے میں زندہ بچ جانے والے واحد شخص پنڈت برہم دت چترویدی اس کے اس خیال سے متفق نہیں تھے۔ انھیں پولیس کی تفتیش سے نکلے نتائج پر ہی پورا یقین تھا۔ انھوں نے مہیندر سنگھ کے بار بار پوچھنے کے بعد اسے بتایا تھا کہ جس کار سے ٹھاکر صاحب کی کار کی ٹکر ہوئی تھی، اس کا ڈرائیور بری طرح شراب کے نشے میں دھت تھا۔ ان

کی باتوں سے مہیندر سنگھ کو محسوس ہوا تھا کہ وہ کافی ڈرے سہمے ہوئے ہیں، اس لیے جو سچ وہ جانتے ہیں، بتانا نہیں چاہتے۔ یہ بات کسی حد تک سچ بھی تھی۔ پنڈت جی واقعی خوف زدہ تھے اور جلد سے جلد اس واقعے کو بھول جانا چاہتے تھے۔ وہ اس طرح کے پر تشدد معاملوں میں ملوث ہونے کے عادی نہیں تھے۔ اس دن ٹھاکر رن ویر سنگھ کے اصرار پر وہ ان کے ساتھ چلے ضرور گئے تھے لیکن اب انھوں نے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ وہ اس طرح کے بکھیڑوں سے ہمیشہ دور رہیں گے۔ ویسے بھی وہ پولیس کی طویل پوچھ تاچھ سے بری طرح عاجز آچکے تھے۔

مہیندر سنگھ کم عمر اور نا تجربے کار ضرور تھا لیکن اسے پولیس کا بیان مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے اسے اپنی خاندانی روایات کے برخلاف اپنے اس طرح کے کاموں سے دور رکھ کر اعلیٰ تعلیم دلانے کا بندوبست کیا تھا۔ ان کی کوشش رہتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ عرصہ گھر سے دور رہے تاکہ وہ اس راستے کے بارے میں کچھ نہ جان پائے جس پر وہ خود گامزن تھے۔ یہی سب سوچ کر انھوں نے اس کا داخلہ کان پور شہر میں کرایا تھا جہاں وہ اس سال ایم کام کے پہلے سال کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اسے اپنے والد کے یوں اچانک دنیا چھوڑ دینے کا دکھ تھا لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس قتل کا اصل مقصد کیا رہا ہوگا۔ کبھی اسے شک ہوتا تھا کہ یہ ان کے سیاسی حریف ٹھاکر جگت سنگھ کا کام ہو سکتا ہے اور کبھی لگتا کہ ان کے کسی اور دشمن نے ان کو مار ڈالنے کے لیے کوئی منصوبہ بند طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس دن ٹھاکر رن ویر سنگھ کس مہم پر نکلے تھے اور ان کا کیا ارادہ تھا، اس کے بارے میں بھی اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس پر اسے حیرت بھی نہ تھی کہ ان کے والد ہمیشہ ہی اپنے پراسرار کاموں کو اسی طرح راز داری سے انجام دینے کے عادی تھے۔ لیکن چونکہ جس دن یہ واقعہ ہوا تھا اس دن ان کی گاڑی کا رخ قصبہ کوٹ کی جانب تھا، اس لیے اسے لگا کہ ان کے دیرینہ دوست ہمدان علی خاں کو ان کی اس مہم کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ان کی اس مہم میں شریک بھی رہے ہوں اور انھیں ساتھ لینے کے لیے ہی وہ اس دن گھر سے نکلے ہوں۔ یہی سوچ کر وہ ایک دن اپنے چند خیر خواہوں کے ساتھ کوٹ جا کر ہمدان علی خاں سے ملا اور ان سے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی۔ لیکن اس بات چیت سے اسے کوئی نئی بات نہ معلوم ہو سکی۔

ٹھاکر رن ویر سنگھ کی آخری رسوم کے دن سب سے پہلے پہنچنے والے چند لوگوں میں ہمدان علی

خاں بھی شامل تھے۔ انھوں نے کنور مہیندر سنگھ کو گلے سے لگا کر بڑی محبت سے کہا تھا کہ وہ اپنے کو یتیم نہ سمجھے اور انھیں اپنے والد کی جگہ سمجھے اور کبھی کوئی ضرورت ہو تو بلا تکلف ان سے کہے۔ اس دن باتوں باتوں میں انھوں نے ٹھاکر صاحب سے اپنی دیرینہ دوستی کے دوران رونما ہونے والے کئی واقعات کی تفصیل بھی اسے بتائی تھی۔ مہیندر سنگھ کو ان کی محبت آمیز تسلی تشفی سے قلبی سکون بھی ملا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے والد ہمدان علی خاں پر کتنا بھروسا کرتے تھے۔ لیکن اس دن انھوں نے حادثے کے تعلق سے کوئی بات نہیں کی تھی اور اس دوسری ملاقات میں بھی انھوں نے ان کے والد کے ارادوں سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا۔ البتہ انھوں نے یہ ضرور بتایا کہ اس بیچ ان کا ربط ضبط چندن پور کے کیوٹوں سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ شاید وہ لوگ ان کی مہم یا ان کے ارادوں کے بارے میں کوئی معلومات فراہم کرسکیں۔

یہ بات مہیندر سنگھ کے لیے نئی تھی۔ وہ اس معاملے کی معلومات حاصل کرنے کے کسی امکان کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا، اس لیے اس نے ہمدان علی خاں سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ چل کر چندن پور کے کیوٹوں سے بات چیت کریں۔ ممکن ہے وہاں سے انھیں کوئی نئی بات معلوم ہو۔ اس پر ہمدان علی خاں بخوشی تیار ہو کر مہیندر سنگھ کے ساتھ چندن پور گئے تھے۔

وہاں سے یہ بات تو معلوم ہوئی کہ اس دن ٹھاکر رن ویر سنگھ پہلی بار ان کے گاؤں آنے والے تھے۔ لیکن انھیں بس یہ اطلاع دی گئی تھی کہ وہ سب مسلح ہو کر تیار رہیں۔ انھیں کس مہم پر جانا ہے اس کی تفصیلات سے انھیں لاعلم رکھا گیا تھا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ٹھاکر صاحب کے حادثے کی خبر کا انھیں یقین نہیں آیا تھا اور وہ سب تصدیق کے لیے جائے حادثہ پر بھی گئے تھے لیکن اس وقت تک وہاں پولیس آ چکی تھی اور ان کی تفتیش کا کام شروع ہو چکا تھا اس لیے تھوڑی دیر رک کر وہ گاؤں واپس آ گئے تھے۔ انھوں نے بھرے ہوئے دل سے کہا کہ ان کے انتقال کے بعد ان کا سارا گاؤں خود کو اناتھ محسوس کر رہا ہے۔ اس پر کنور مہیندر سنگھ نے ان کے مکھیا کو کچھ رقم دینی چاہی کہ وہ انھیں اپنے لوگوں میں تقسیم کر دے لیکن مکھیا نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔ ایسا کرتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کہا کہ وہ ٹھاکر صاحب کے وفادار ہیں اور اس طرح وفاداری کا معاوضہ لینا انھیں منظور نہیں ہے۔ کنور مہیندر سنگھ گاؤں والوں کے اس رویے سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ اس بات چیت کے بعد وہ اور ہمدان خاں وہاں سے اٹھ کر سیدھے کوٹ آ گئے تھے۔ ہمدان خاں

نے اصرار کر کے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک دن اپنے یہاں ٹھہرنے پر مجبور کیا اور مہیندر سنگھ کو ان کی یہ بات ماننی پڑی۔ البتہ اس نے اپنے ایک آدمی کو گھر بھیجا تا کہ وہاں یہ اطلاع دی جا سکے کہ وہ آج قصبہ کوٹ کے ہمدان علی خاں کا مہمان ہے۔ گفتگو کے دوران ہمدان علی خاں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ چونکہ ٹھاکر صاحب کی شخصیت بڑی پر اسرار تھی اس لیے اب وہ اس معاملے کو یہیں ختم کر کے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچے۔ اس معاملے کو جتنا کریدا جائے گا اسے اتنا ہی دکھ ہوگا۔ یہ مشورہ مہیندر سنگھ کو بھی مناسب معلوم ہوا اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ ان کی اس نصیحت پر عمل کرے گا اور اپنی تعلیم پر پوری توجہ صرف کرے گا۔ باتوں باتوں میں انھوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ پہلے انھیں بھی جگت سنگھ پر شک تھا لیکن اب انھیں یقین ہو گیا ہے کہ اس معاملے سے جگت سنگھ کا کچھ لینا دینا نہیں تھا۔

بتیس

موسم نہایت خوش گوار تھا۔ طلوع آفتاب کے منظر نے اس کا لطف دوبالا کر دیا تھا۔ بھوپال سے ہوشنگ آباد جانے والی سڑک پر اس وقت بھی خاصی آمد و رفت تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سڑک پر اب کئی مقامات ایسے تھے جو عوام کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے لگے تھے۔ منڈی دیپ جو کبھی ایک معمولی گاؤں تھا، اب ایک صنعتی شہر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہاں متعدد کارخانے قایم ہو چکے تھے جہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ کام کر رہے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ بھوپال سے روز آتے جاتے تھے۔ کچھ اور آگے چل کر بھیم بیٹکا تھا، جو اپنی قدیم ترین راک پینٹنگز کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہو چکا تھا اور یہاں ملکی و غیر ملکی سیاحوں کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر لگا رہتا تھا۔ برکھیڑا تھا جو اپنی لذیذ گلاب جامنوں کے لیے قریب و دور شہرت رکھتا تھا اور اس سڑک سے گذرنے والے یہاں رک کر اس کا ذائقہ لینا نہیں بھولتے تھے۔ اسی بھیڑ میں ایک بند گاڑی بھی شامل تھی جس میں مسعود خاں اپنے پانچ رضا کاروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مسعود کے بدن پر اس وقت کا لر دار معمولی کرتا، ڈھیلی افغانی شلوار اور پاؤں میں سیاہ سینڈل تھے۔ یہ لباس بھوپال میں عام طور پر نہیں پہنا جاتا تھا۔ ایسا شاید اس نے اس لیے کیا تھا کہ اسے پہلی نظر میں شمال مشرقی ہندوستان کا کوئی مسافر تصور کیا جائے اور بھوپال سے اس کا راست تعلق ظاہر نہ ہونے پائے۔ ان سب کا ارادہ اٹارسی جانے کا تھا، جہاں سے مسعود کو حیدرآباد جانے والی ٹرین دکشن ایکسپریس پکڑنا تھی اور باقی رضا کاروں کو اٹارسی ہی سے

واپس بھوپال لوٹ آتا تھا۔اس معمولی ٹرین کے انتخاب کے پیچھے بھی اس کا کچھ خاص مصلحت تھی، ورنہ حیدرآباد جانے کے لیے اب زیادہ تیز رفتار اور آرام دہ گاڑیاں بھی موجود تھیں۔اس ٹرین کو بھوپال سے بھی پکڑا جا سکتا تھا۔شاید یہ اس کا غیر معمولی محتاط مزاج تھا، جس کے تحت اس نے اٹارسی سے اس ٹرین پر سوار ہونا پسند کیا تھا۔دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اس سفر کا کوئی عینی شاہد ہو۔اتنے دنوں سے بھوپال میں رہتے ہوئے اب کچھ ایسے لوگ تو بہر حال تھے ہی جو اس کو کسی نہ کسی حیثیت سے جانتے تھے۔کوئی اسے طالب علم سمجھتا تھا تو کوئی سماجی کارکن۔کسی کی نظر میں وہ ایک معمولی کلرک تھا جو منڈی دیپ کی کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا تو کوئی اسے ایک لاابالی بے روزگار نوجوان کی حیثیت سے جانتا تھا۔خود اس نے اس سے زیادہ تفصیلات نہ تو کبھی کسی کو فراہم کی تھیں اور نہ ضرورت سے زیادہ کبھی کسی کو اپنے قریب آنے دیا تھا۔بھوپال سے ٹرین پکڑنے کی صورت میں اس بات کا قوی امکان تھا کہ پلیٹ فارم پر ان میں سے کوئی ٹکرا جائے، جب کہ اٹارسی میں اس کا امکان کم تھا۔

حیدرآباد جا کر اسے دو کام کرنے تھے۔ایک تو یہ معلوم کرنا تھا کہ منظور احمد کو دھوکا دینے والا شخص کون ہے؟ اور اب وہ کہاں ہے؟ اور دوسرے یہ کہ بم حادثے کے پیچھے جن لوگوں کا ہاتھ تھا، مستقبل میں ان کے منصوبے کیا ہیں؟ دردانہ بہرام اب بھی وہیں تھی۔اس کی حاصل کردہ معلومات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنی تھی اور متعلقہ لوگوں کو اپنے طور پر سزا دینے کا انتظام کرنے کے ساتھ ساتھ مقامی سطح پر ان سے مسلسل نبرد آزمائی کا معقول انتظام بھی کرنا تھا۔حیدرآباد جیسے شہر میں مسلمانوں کے لیے کچھ بھی کرنے والے لوگوں کی قلت نہیں تھی، اس لیے یہ کام اتنا دشوار نہیں تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ان کاموں کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ اسے حیدرآباد میں سرگرم ایک مسلم فلاحی تنظیم کے سربراہ سے ملاقات بھی کرنی تھی۔

گذشتہ دو دنوں کے مسلسل غور و فکر کے بعد وہ ایک حتمی فیصلے پر پہنچا تھا۔اس درمیان اس نے حیدرآباد میں منظور احمد کے باقی تین ساتھیوں سے فون پر بات چیت بھی کی تھی۔ان لوگوں نے بتایا تھا کہ ان کے پاس اس تعلق سے وافر معلومات ہیں، جسے وہ فون پر نہیں بتا سکتے۔چنانچہ اس کام کو اس نے اپنے حیدرآباد پہنچنے تک کے لیے ملتوی کر رکھا تھا۔مختصراً ان لوگوں سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں اس کے مطابق حیدرآباد میں ہونے والے بم حادثے کے پیچھے ایک ایسی مقامی تنظیم تھی جس کا کام ہی یہ تھا

کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو بدنام کر کے ان کی عام امیج کو بگاڑا جائے تاکہ عوام ان کو ایک ہندوستانی شہری کی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے دہشت گرد کی طرح دیکھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اس طرح کا ماحول بناتے رہیں گے تو رفتہ رفتہ مسلمان عوامی ہمدردی سے محروم ہو جائیں گے اور ہندوستان کو مسلمانوں سے پاک کرنے کا ان کا کام نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ یہ بم دھماکا بھی ان کی اسی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھا، جو مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے رچی گئی تھی۔

تینتیس

ہمدان علی خاں کا شمار قصبہ کوٹ کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ وہ پرانے زمین دار تھے۔ اُن کے بزرگ اُن کے لیے اتنا کچھ چھوڑ گئے تھے کہ انھیں تمام زندگی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی کوٹھی میں آرام و آسائش کا تمام جدید ساز و سامان موجود تھا۔ بجلی پیدا کرنے کے لیے ایک بڑا جنریٹر قصبے میں صرف انھیں کے گھر پر تھا، جو ان کے گھر کی ضروریات کی تکمیل تو کرتا ہی تھا، وقتاً فوقتاً قصبے والوں کو ان کے یہاں ہونے والی شادی بیاہ کی تقاریب کے موقعے پر بلا قیمت فراہم بھی کیا جاتا تھا۔ ہر کمرے میں بجلی کے پنکھے تھے، تین ٹی وی تھے، فریج تھا، ان کے نجی استعمال کے لیے ایک کمپیوٹر تھا۔ شہروں میں ان چیزوں کا مہیا ہونا بھلے ہی کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا ہو لیکن دور دراز کے اس قصبے میں ان تمام چیزوں کا ہونا کسی عجوبے سے کم نہیں تھیں۔ ایک پرانی جیپ تھی، جسے وہ صرف شہر آنے جانے اور اپنے شکار کا شوق پورا کرنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ آس پاس کے علاقوں میں آنے جانے اور اپنے کھیتوں کے معائنے کے لیے وہ عام طور پر گھوڑوں کا استعمال کرتے تھے۔ دس بارہ خدمت گار تھے، جو گھر کے روزمرہ کا کام کاج دیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور الگ تھے، جو وقت پڑنے پر اپنے مالک کے لیے لاٹھی اور رائفل چلانے کا کام بھی کر سکتے تھے۔ آس پاس کے علاقوں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ اس عزت کے پس پشت ان کے زمین دار ہونے کی صفت کے علاوہ ان کی جنگجویانہ طبیعت کا بھی خاص کردار تھا۔ بات بات پر انھیں غصہ آجایا کرتا تھا۔ اس لیے قصبے میں رہنے والے عام لوگ ان کی عزت اس لیے بھی کرتے تھے کہ وہ ان سے خوف زدہ رہتے تھے اور ان کی خفگی کو برداشت کر پانے کی حالت میں نہیں تھے۔

ٹھاکرن ویر سنگھ کی بدنیتی کے بارے میں اطلاع پہنچانے والا نوجوان ہمدان علی خاں کی زندگی میں کچھ انقلابی تبدیلیوں کا پیغام بھی لایا تھا۔ کسی بھی طرح کے انعام واکرام کو قبول کرنے سے انکار کا سبب اس نے جب یہ بتایا کہ اس نے اپنی زندگی امت مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر رکھی ہے اور اس کے لیے اب دنیاوی آرام و آسائش کا کوئی مطلب نہیں رہ گیا ہے، تو پہلے تو ہمدان خاں کو یقین ہی نہیں آیا کہ اس عمر کا کوئی نوجوان اس طرح کی قربانی دے سکتا ہے، لیکن یہاں تو سب کچھ سامنے ہی تھا۔ یقین تو کرنا ہی تھا۔ ان جیسے شخص کو اطلاع پہنچانے کا کام کم جوکھم بھرا نہیں تھا۔ اس کام میں ذرا سی چوک ہونے پر اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔ لیکن اس نے یہ کام بے خوف ہو کر بہ حسن وخوبی انجام دیا تھا۔ ہمدان خاں کی زیادتیوں پر بھی اس نے کوئی منفی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ بلکہ نہایت صبر و شکر کے ساتھ مناسب وقت کا انتظار کیا تھا، تا کہ ان پر حقیقت حال واضح ہو جائے۔ اور جب ہمدان خاں اپنے طور پر اس اطلاع کی تصدیق کر چکے تو اپنے اور اپنے قصبے والوں کی جان بچانے والے اس نوجوان پر جیسے انھیں بے حد پیار آ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس وقت وہ انھیں اپنے مرحوم بیٹے کی طرح لگا تھا۔

اپنی مختصر سی گفتگو میں اس نوجوان نے حرکت البشر کا تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کے سارے اخراجات کی ذمہ دار اس کی تنظیم ہے۔ ان اخراجات کے علاوہ تنظیم کی جانب سے اس کے افراد خاندان کو جو معاوضہ ملتا ہے وہ ان کی ضروریات کی کفالت کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ہمدان خاں اس نوجوان کے کردار و مزاج سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ یکایک انھیں خیال آیا تھا کہ انھوں نے تو اپنی ساری زندگی باہمی جدال وقتال ہی میں صرف کر دی ہے۔ جس میں وقت اور دولت کے زیاں کے علاوہ کبھی کچھ ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ انھیں احساس ہوا کہ ان کی ناموری، ان کی شہرت اور دبدبہ صرف لوگوں میں ان کی طرف سے پیدا ہونے والے خوف کے سبب سے ہے۔ اس کے مقابلے میں اس نوجوان کی زندگی ان کو قابل رشک نظر آ رہی تھی، کیونکہ اس کا مقصد نیک تھا۔ چنانچہ اسے رخصت کرتے وقت وہ اس سے یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے تھے کہ اگر وہ خود حرکت البشر کے لیے کچھ کرنا چاہیں تو کیا تنظیم ان کی اس پیشکش کو قبول کرے گی؟ جواب میں نوجوان نے بتایا کہ تنظیم کو مالی تعاون دینے والے مسلمانوں سے ان کے ذرائع آمدنی اور کاروبار کے بارے کوئی پوچھ تاچھ نہیں کی جاتی۔ چنانچہ وہ جب چاہیں تنظیم کو مالی تعاون دے سکتے ہیں۔ اور اگر ان کا ارادہ عملی تعاون کا ہے تو اس کے لیے تنظیم کے اپنے قاعدے قانون

ہیں۔اس پر ہمدان خاں نے تنظیم کے لیے عطیے کے طور پر اسے ایک لاکھ روپے نقد دینے کی پیشکش کی لیکن اس نوجوان نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ تنظیم کے لیے عطیات قبول کرنے کا مجاز نہیں ہے،تاہم وہ اتنا ضرور کر سکتا ہے کہ اس کی اطلاع متعلقہ شعبے تک پہنچا دے۔اس پر انھوں نے اس نوجوان سے کہا تھا کہ وہ مالی طور پر تو تعاون کے لیے تیار ہیں ہی لیکن اب وہ عملی طور پر بھی اپنی زندگی ایسے کاموں کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں۔اس پر نوجوان نے صرف اتنا کہا کہ وہ حرکت البشر کے ذمے داروں تک یہ اطلاع پہنچا دے گا۔اس کے بعد تنظیم کو جو مناسب معلوم ہوگا،کرے گی۔وہاں سے جانے کے بعد اس نوجوان نے اپنے اکابرین حرکت البشر تک یہ اطلاع پہنچانے میں تاخیر نہیں کی تھی۔کیونکہ پندرہ دنوں کے اندر ہی ان کا ایک نمائندہ آ کر ان سے ملا تھا اور ان سے عطیہ وصول کر کے رسید دے گیا تھا۔

ان کو حرکت البشر کا رکن بنانے یا نہ بنانے کا فیصلہ کرنے کے عمل میں کچھ وقت لگا۔ان کے بارے میں جملہ معلومات حاصل کرنے اور تحقیق و تفتیش کے اپنے طے شدہ معیار کے مطابق مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد تنظیم نے انھیں باقاعدہ رکنیت دینے سے تو انکار کر دیا تھا لیکن یہ رعایت دی تھی کہ اگر وہ چاہیں گے تو وقتاً فوقتاً جب تنظیم کو ان کی ضرورت ہوگی،ان کی خدمات لی جا سکتی ہیں۔اس پر انھوں نے اپنی رضامندی دے دی تھی۔تنظیم کے مطابق ہمدان خاں میں استقلال،صبر و ضبط اور دور اندیشی کی کمی تھی۔وہ اپنی زندگی میں کسی طرح کے اصول و ضوابط کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔غصے کے دوران عام طور پر وہ آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور لازمی مصلحتوں کا لحاظ نہیں رکھ پاتے تھے۔ان کی فکر میں اجتماعیت کا فقدان تھا۔ظاہر ہے ان کی یہ تمام عادتیں تنظیم کی ساکھ کو نقصان پہنچا سکتی تھیں۔ہمدان خاں کو اس فیصلے سے تھوڑی مایوسی تو ہوئی تھی لیکن انھوں نے اس پر اپنے ردعمل کا اظہار کرنے سے گریز کیا تھا۔ایسا لگتا تھا کہ وہ اس تحریک کے لیے واقعی کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔اس واقعے کے بعد سے ہمدان علی خاں کے مزاج میں واضح تبدیلیوں کے آثار نمودار ہوئے تھے۔انھوں نے اپنے روزمرہ کے لڑائی جھگڑوں سے بڑی حد تک دست کشی اختیار کر لی تھی۔یوں تو ان کی ساری زندگی ہی میدان کارزار تھی۔لیکن یہ بات اب ان کی سمجھ میں آئی تھی کہ تشدد کو مثبت انداز میں کس طرح سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ان تمام معاملات کے طے ہو جانے کے بعد خاصا عرصہ گذر گیا اور تنظیم کی جانب سے کسی

نے کسی کام کے لیے ان سے رابطہ قائم نہیں کیا۔انھیں یہ لگنے لگا تھا کہ جیسے حرکت البشر کے لوگ انھیں فراموش کر چکے ہیں۔لیکن ایک دن اچانک جب انھیں پہلے خط کے ذریعے اوراس کے دو دن بعد موبائل پر یہ اطلاع ملی کہ انھیں فلاں روز لکھنو جا کر وزیر داخلہ جناب اکرام الدین قریشی سے ملاقات کر کے ان سے علاقے کے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے کچھ بندوبست کرنے کی درخواست کرنا ہے،تو وہ خوش ہوے۔حالانکہ پیغام دینے والے کا سخت اور ترش لہجہ انھیں کچھ ناگوار معلوم ہوا تھا۔اس کی کسک کو برداشت کرنے کے باوجود وہ کچھ مسرور تھے کہ چلو حرکت البشر نے انھیں کسی لائق تو سمجھا۔اس ناگواری کا سبب محض یہ تھا کہ ہمدان خاں نے ساری زندگی حکم دینا تو سیکھا تھا،کبھی یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ کوئی انھیں حکم دے اور وہ اس کی تعمیل کریں۔اپنے اندر اٹھے اس اشتعال کو انھوں نے بڑی مشکل سے روکا تھا۔انھیں لگا تھا کہ اگر وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو انھیں ایسی ناگوار صورت حال برداشت کرنے کی عادت ڈالنی پڑے گی۔

موبائل پر انھیں یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ جب وہ لکھنو روانہ ہوں تو اس کی اطلاع مناسب طریقے سے دے دیں تا کہ اس سے متعلق کاموں کو وہاں پر انجام دیا جا سکے۔تحریک سے رابطہ قائم کرنے کے مختلف طریقے انھیں پہلے ہی بتائے جا چکے تھے۔فوری طور پر انھیں یہ کام بڑا معمولی لگا تھا۔یہ بھی کوئی کام ہوا،انھوں نے سوچا تھا۔کیونکہ انھیں تو توقع ایسی تھی کہ تنظیم ان سے کسی علاقے کے ہندوؤں کا صفایا کرنے جیسا کام لے گی۔یہ کام تو اس کے مقابلے کچھ بھی نہیں تھا۔لیکن چونکہ حرکت البشر کی جانب سے پہلی بار انھیں کوئی کام سونپا گیا تھا اس لیے وہ فوراً ہی ان امکانات پر غور کرنے لگے کہ وزیر داخلہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وہ کیا طریقہ کار اختیار کریں۔انھیں اپنے شکاری دوست انوپ مشرا کی یاد آئی،جن کے تعلقات وزیر داخلہ سے بہت اچھے تھے۔دونوں مرادنگر کے رہنے والے تھے اور پہلی جماعت سے دسویں تک کی تعلیم دونوں نے ساتھ ساتھ حاصل کی تھی۔اب وہ جنگلوں کو ٹھیکے داری کا کام کرتا تھا،جہاں کوئی اس کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ہمدان خاں کی ملاقات اس سے جنگل ہی میں شکار کے دوران ہوئی تھی اور دونوں بہت جلدی اچھے دوست بن گئے تھے۔یہ خیال آتے ہی انھیں یک گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ویسے یہ کام ان کے لیے دشوار نہیں تھا۔ان کے روابط ایسے کئی لوگوں سے تھے جن کی وساطت سے وہ وزیر موصوف سے ملاقات کا انتظام کر سکتے

تھے۔ چنانچہ وہ سب کچھ بھول کر لکھنو جانے کی تیاری کرنے لگے۔

چونتیس

عبدالرحمن وردونا ایکسپریس سے ٹھیک دس بجے لکھنو پہنچ گیا تھا۔ آج وہ یہاں اپنے کسی کاروباری کام سے نہیں کسی اور وجہ سے آیا تھا۔ پچھلی صبح جب وہ گنگا گھاٹ پر سیر کے لیے گیا تھا تو اچانک اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس میں نظر آنے والا نمبر اس کے لیے اجنبی تھا۔ وہ عام طور پر اجنبی لوگوں سے بات نہیں کرتا تھا لیکن ادھر کچھ دنوں سے اس کے اس رویے میں تبدیلی آ گئی تھی اور اب وہ کسی کال کو کینسل نہیں کرتا تھا۔ جواب میں اس نے اسی اجنبیت کے ساتھ 'ہلو' کہا تو دوسری طرف اسے ایک کرخت سی لیکن پروقار آواز سنائی پڑی۔ کوئی پوچھ رہا تھا کہ 'کیا آپ نے کبھی پنسل کا استعمال کیا ہے؟ HB پنسل کا؟' پہلے تو وہ کچھ سمجھا نہیں۔ اسے یہ سوال نہایت بے تکا معلوم ہوا۔ لیکن جب سے اس نے حرکت البشر کو تعاون دینا شروع کیا تھا، اکثر ہی اس طرح کی عجیب وغریب طرز کلام سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ اس نے HB پر غور کیا تو اس کی سمجھ میں فوراً آ گیا کہ یہ حرکت البشر کا مخفف ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مودب ہو گیا اور جواب میں 'اللہ اکبر' کہہ کر بغور ہدایات سننے لگا۔ ابھی کچھ عرصے سے ہی اس نے حرکت البشر کی عارضی رکنیت قبول کی تھی اور جب جب اسے کسی کام کے لیے طلب کیا جاتا تو وہ ترجیحی طور پر نہایت خندہ پیشانی سے اسے انجام دیتا۔ موبائل پر اسے نہایت تفصیل سے ہدایت دی گئی تھی کہ وہ کل لکھنو جائے اور وہاں ہوٹل گوہر محل کے کمرہ نمبر ۲۱۳ میں ٹھہرے ہوئے شخص سے ملاقات کرے اور اسے یہ پیغام دے کہ وہ جس کام کے لیے آیا ہے، اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ نیز اسے یہ مشورہ دے کہ وہ فوراً لکھنو سے واپس اپنے گھر چلا جائے۔

لکھنو اس کے لیے نئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن اب کی بار وہ یہاں کافی عرصے کے بعد آیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اب یہاں جگہ جگہ بلند عمارات کا ایک جنگل اُگ آیا تھا۔ اس نے اپنی اعلیٰ تعلیم یہیں لکھنو یونیورسٹی سے ہی حاصل کی تھی۔ وہ اس شہر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ لیکن اسے لگ رہا تھا کہ جیسے یہ شہر اس کے لیے اجنبی ہو گیا ہے۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ہوٹل گوہر محل پرانے شہر کی ایک گلی میں واقع ہے۔ یہ ایک معمولی سا ہوٹل تھا، جہاں عام طور پر کم آمدنی والے لوگ آتے تھے۔ آس پاس کے گاؤں کے وہ لوگ جنھیں اکثر کسی مقدمے یا علاج کے سلسلے میں لکھنو آنا پڑتا تھا، اسی ہوٹل میں ٹھہرتا

پسند کرتے تھے۔ وجہ ظاہر تھی کہ شہر کے وسط میں اس سے سستا اور ضروری سہولتوں سے آراستہ کوئی دوسرا ہوٹل موجود نہیں تھا۔ وہ اسٹیشن سے سیدھا ہوٹل گوہر محل پہنچ گیا۔ ہوٹل کی تین منزلہ یہ قدیم اور بوسیدہ سی نظر آنے والی عمارت کبھی کسی متمول لکھنوی نواب کی رہائش گاہ رہی ہوگی لیکن اب اپنے شاندار اور پروقار ماضی پر ماتم کناں ایک معمولی ہوٹل کی شکل میں کھڑی تھی۔ عبدالرحمن نے اپنی کلائی گھڑی دیکھی، گیارہ بج کر دس منٹ ہورہے تھے، ہوٹل پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور صدر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ ابھی وہ بورڈ پر آویزاں ٹھہرے ہوئے مسافروں کی فہرست ہی دیکھ رہا تھا کہ کاونٹر پر موجود شخص نے اس سے پوچھ لیا کہ وہ کس سے ملنا چاہتا ہے۔ اس درمیان اس نے دیکھ لیا تھا کہ کمرہ نمبر ۳۱۳ میں ٹھہرے ہوئے شخص کا نام ہمدان علی خاں ہے۔ چنانچہ اس نے اسے یہی نام بتا دیا۔ جواب میں اس نے کہا۔'روم نمبر ۳۱۳، تیسری منزل پر دائیں طرف دوسرا کمرہ۔'

یہ ایک طرح کا اجازت نامہ تھا کہ اب وہ جا کر ہمدان علی خاں سے مل سکتا ہے۔ اس نے جواب میں 'شکریہ' کہا اور زینے طے کرنے لگا۔

کمرہ نمبر ۳۱۳ کے دروازے پر کوئی کال بیل نہیں تھی، جیسی کہ عام طور پر ہوٹلوں میں ہوا کرتی ہے۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک رعب دار آواز سنائی دی۔'کون؟' جلد ہی دروازہ کھلا اور سامنے ایک گیم شحیم، دراز قد شخص اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اس نے پوچھا۔'کہیے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟'

'اس بے وقت زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں لیکن کیا آپ نے کبھی پنسل کا استعمال کیا ہے، HB پنسل کا؟' عبدالرحمن نے اس شخص کی شناخت کو یقینی بنانے کی غرض سے طے شدہ رمزیہ انداز میں پوچھا۔

'یہ کیا بکواس ہے'۔ اس شخص کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔'مجھے اجنبیوں سے مذاق کرنا بالکل پسند نہیں ہے'۔ وہ بولا۔

'میں مذاق نہیں کر رہا ہوں'۔ عبدالرحمن نے لہجے کی نرمی اور سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

نکلا بول'۔

'بدتمیزی پر بدتمیزی کیے جا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آپ سنجیدہ ہیں'۔ ہمدان خاں نے

جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

ایک بار اسے لگا کہ شاید وہ غلط جگہ پر آ گیا ہے۔ لیکن سب کچھ اتنا واضح تھا کہ ایسی کسی غلطی کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ ہوٹل، کمرہ نمبر ۳۱۳، سامنے کھڑے ہوئے شخص کا حلیہ سب ان تفصیلات کے عین مطابق تھا جو اسے فون پر بتائی گئی تھیں۔

ہمدان علی خاں اس شخص کی احمقانہ دیدہ دلیری پر حیران تھے۔ جب اس نے ان کی بات کے جواب میں تاخیر کی تو انھوں نے کہا۔ 'شاید آپ غلطی سے میرے کمرے میں آ گئے ہیں، ملنا کسی اور سے ہے آپ کو۔'

'مجھے ہمدان علی خاں سے ملنا ہے'۔ بالآخر عبدالرحمن نے اشاروں کی زبان چھوڑ کر واضح الفاظ میں کہا۔

اجنبی کے منہ سے اپنا نام سن کر ہمدان علی خاں کی حیرانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ کچھ سنبھلے، اجنبی کو از سرِ نو غور سے دیکھا کہ شاید وہ اسے پہلے سے جانتے ہوں اور پہچاننے میں بھول کر رہے ہوں، لیکن یہ چہرہ کوشش کے باوجود ان کی یادداشت کے پردے پر نہیں ابھرا۔ آخر تھک ہار کر انھوں نے دروازہ کھولتے ہوئے اس اجنبی سے کہا۔ 'اندر تشریف لے لائیے، بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ لیکن معافی چاہتا ہوں، میں آپ کو پہچان نہیں پایا'۔

عبدالرحمن نے کہا۔ 'جب ہم اطمینان سے باتیں کریں گے تو ہمارا تعارف بھی ہو جائے گا'۔

اس نے اندر داخل ہوتے ہی احتیاطاً دروازہ مقفل کر دیا تاکہ کمرے میں اچانک کسی ملازم یا بیرونی شخص کی دراندازی ممکن نہ ہو سکے۔ ہمدان علی خاں پلنگ پر بیٹھ گئے تو وہ بھی نہایت بے تکلفی کے ساتھ سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلا سوال وہی کیا، جس کی وجہ سے وہ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ 'محترم، جب آپ ہمدان علی خاں ہی تھے، تو آپ نے میرے پہلے سوال کے جواب میں ' اللہ اکبر' کیوں نہیں کہا؟'

'اوہ ہو، تو HB کا مطلب حرکت البشر ہے'۔ ہمدان علی خاں کو جیسے اب جا کر سارا معاملہ سمجھ میں آیا۔ انھوں نے حیران ہوتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ 'میری بات کا برا مت مانو۔ میں سچ سچ سمجھ نہیں پایا تھا۔ مجھے اس طرح اشاروں کنایوں میں باتیں کرنے کی عادت بھی نہیں ہے۔ ایک لمبے

کے توقف کے بعد وہ خود بولے۔ اچھا، اب میں سمجھا 'بلا بول' کا مطلب بھی یہی تھا'۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ خود اپنی ذہانت پر عش عش کر رہے ہوں۔ جوش میں ان کی آواز بھی کچھ ضرورت سے زیادہ بلند ہو گئی تھی۔

'ذرا دبی ہوئی آواز میں بات کیجیے محترم۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ عبدالرحمن نے انھیں متنبہ کرتے ہوئے کہا۔ 'یہ ہوٹل ایسی باتوں کے لیے بہت محفوظ جگہ نہیں ہے۔'

ہمدان خاں کو اس شخص کی یہ تنبیہ ناگوار معلوم ہوئی لیکن اس پر وہ کچھ بولے نہیں۔

دراصل ہمدان علی خاں نے اس اجنبی شخص کو پہلی ہی نظر میں ناپسندیدہ قرار دے لیا تھا اور اب تعارف کے باوجود وہ معمول پر واپس نہیں لوٹ پا رہے تھے۔ پھر اس شخص کی باتیں متواتر انھیں مشتعل کر رہی تھیں۔ انھیں لگ رہا تھا کہ یہ شخص نہ تو ان کی عمر کا لحاظ کر رہا ہے اور نہ ان کے جاہ و جلال سے مرعوب ہے۔ مزاجاً وہ ایسی باتوں کو برداشت کرنے کی عادی نہیں تھے۔ رفتہ رفتہ ان کا خون کھولنے لگا تھا، لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنے غصے کو قابو میں کیے ہوئے تھے۔ دوسری جانب عبدالرحمن سوچ رہا تھا کہ اس کے سامنے جو عجیب و غریب شخص موجود ہے وہ اتنا ذہین نہیں ہے جتنا وہ سمجھ رہا تھا یا اس کے مطابق جیسا حرکت البشر کے کسی کارکن کو ہونا چاہیے تھا۔ پھر اس نے سوچا ضرور اس شخص میں کوئی غیر معمولی صفت ہوگی، جس سے میں ابھی تک واقف نہیں ہو سکا، ورنہ تنظیم اس کی خدمات کیوں قبول کرتی۔ لیکن وہ خود کو ان غیر ضروری باتوں میں الجھانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے فکر کے اس حصار سے باہر نکلا۔ اس نے طے کیا کہ بہتر یہی ہوگا کہ وہ جلد از جلد ضروری ہدایات اس کے گوش گزار کر کے یہاں سے روانہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے بغیر کسی تمہید کے راست گفتگو شروع کی۔ 'محترم، چند روز قبل آپ کو حرکت البشر کی جانب سے جو ہدایات دی گئی تھیں اور جو کام سپرد کیا گیا تھا، اس کے تحت آج شام چار بجے آپ کو وزیر داخلہ اکرام الدین قریشی صاحب سے ملاقات کرنی تھی، لیکن اب فی الحال اس ملاقات کی ضرورت نہیں رہی اس لیے سابقہ ہدایات منسوخ کی جاتی ہیں۔ اس کی جگہ نیا حکم یہ صادر ہوا ہے کہ آپ ان سے آج نہیں ملیں گے اور جتنی جلدی ممکن ہو سکے، واپس اپنے گھر چلے جائیں گے۔ اگلی ہدایات آپ کو وہیں مل جائیں گی۔'

'ہمدان علی خاں حکم سننے کا عادی نہیں ہے۔ اسے صرف حکم دینا آتا ہے۔ سمجھے'۔ ہمدان خاں لیکا یک بھڑ پڑے۔ اس بار وہ اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ پائے۔ وہ کوئی بچہ نہیں تھے کہ جب چاہا کہہ دیا کہ لکھنو جاؤ تو لکھنو چلے جائیں اور جب کہیں واپس گھر جاؤ تو گھر۔ 'بس' ہو بائیں انھوں نے کہا۔ 'وزیر سے تو میں ملوں گا۔ کچھ نہیں تو میں ان سے اپنے علاقے کی فلاح و بہبود کے بارے میں تبادلہ خیال تو کر ہی سکتا ہوں'۔

'جیسی آپ کی مرضی۔ لیکن ایسا کر کے آپ اپنے حق میں اچھا نہیں کریں گے۔ اسے تنظیم کے احکامات کی کھلی خلاف ورزی تصور کیا جائے گا اور آپ کو اس کی سزا دی جا سکتی ہے'۔ عبدالرحمن نے ان کو متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

'دیکھو، تم جو بھی ہو اپنی حد میں رہو اور میرے ظرف کا امتحان لینا بند کرو'۔ اب ہمدان خاں کا اشتعال بے قابو ہونے لگا تھا۔ 'ورنہ میرے ساتھ جو ہوگا وہ تو میں بعد میں دیکھ ہی لوں گا، تمھیں اپنی سزا کے لیے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا، وہ تمھیں یہیں اور ابھی مل سکتی ہے'۔

عبدالرحمن نے دیکھ لیا تھا کہ اس شخص کے ہاتھ میں پستول آ گیا ہے اور اب وہ واقعی ڈر گیا تھا۔ یہ شخص اسے نہایت خطرناک لگنے لگا تھا۔ اسے تنظیم کو تعاون دینے کے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ حرکت البشر کے ساتھ تعاون کرتا ہے تو وقتاً فوقتاً ایسی صورت حال تو آتی ہی رہے گی۔ وہ پچھتا رہا تھا کہ وہ کیوں اس تنظیم کے ساتھ آیا۔ دین کی خدمت کے اور طریقے بھی تو ہو سکتے تھے۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی نئی مصروفیات نے اس کے کاروبار پر بھی برے اثرات مرتب کرنے شروع کر دیے تھے لیکن اب اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود کو اس مشکل سے باہر کیسے نکالے۔ آج جو ہو رہا تھا پہلی بار نہیں تھا۔ ایک بار پہلے بھی وہ ایسے ہی خطرناک آدمی سے مل چکا تھا۔ لیکن یہ شخص تو اس کا بھی باپ معلوم ہو رہا تھا۔ اسے لگا کہ اسے جلد از جلد یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے نہایت ادب سے کہا۔ 'اگر میری باتیں آپ کو ناگوار معلوم ہوئی ہوں تو معاف کر دیجیے اور مجھے جانے کی اجازت دیجیے'۔

'ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ شاید اس وقت یہی مناسب ہوگا'۔ ہمدان خاں نے لہجے کی ترشی کو کچھ دباتے ہوئے کہا۔ 'اور ہاں جس شخص نے تمھیں یہ پیغام دے کر میرے پاس بھیجا ہے، اس سے کہہ دینا

کہ ہمدان خاں پٹھان ہے اور پٹھان ایک بار قدم آگے بڑھا کر پیچھے کھینچنا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ انھوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے مزید کہا' اور یہ بھی کہہ دینا کہ اس کے اس حکم کے باوجود میں وزیر داخلہ سے ملوں گا اور وقتِ مقررہ پر ملوں گا'۔

اب حیران ہونے کی باری عبدالرحمن کی تھی۔ وہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ ایسی منظم جماعت میں کوئی اس طرح ضابطہ شکنی کی ہمت کر سکتا ہے۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس طرح کے لہجے میں بات کرنے والا عام حالات میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ لیکن یہ شخص تو اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے ہمیشہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھے رکھے ہی زندگی گذاری ہو۔ اچانک اس کے اندر اسے ایک شبے نے سر اٹھایا۔ کہیں یہ شخص حرکت البشر کے اکابرین میں سے تو نہیں ہے، جو یہاں اس کی آزمائش کے لیے آیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ گیا۔ اس نے نہایت ادب کے ساتھ سامنے موجود شخص سے کہا' میری باتوں سے اگر آپ کو تکلیف پہنچی ہے تو میں ذاتی طور پر آپ سے دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں۔ میرا مقصد آپ کی توہین کرنا نہیں تھا۔ ویسے بھی آپ میرے بزرگ ہیں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ لیکن میری ناقص رائے میں آپ کو تنظیم کے حق میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا چاہیے'۔ یہ کہتے ہوئے وہ مڑا۔ دروازہ کھولا اور 'اللہ حافظ' کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد اب ہمدان خاں نے اپنے رویے پر غور کیا تو انھیں لگا کہ اس وقت شاید ان کا ردعمل ضرورت سے زیادہ شدید تھا۔ اجنبی شخص کی معذرت خواہی نے بھی ان کے غصے کو مہمیز کیا تھا۔ لیکن وہ شخص تو اب جا ہی چکا تھا۔ اور اگر موجود بھی ہوتا تو ہمدان خاں تو معافی مانگ نہیں سکتے تھے۔ انھیں خیال آیا کہ جانے اب وہ جا کر اپنے آقاؤں سے کیا کہے۔ انھوں نے سن رکھا تھا کہ ایسی خفیہ تنظیمیں اپنے اصولوں کی پابندی کرانے کے معاملے میں بڑی سخت ہوتی ہیں۔ اب وہ قدرے خوف زدہ تھے۔ انھیں پچھتاوا بھی ہو رہا تھا کہ انھوں نے اس اجنبی سے اس طرح کی باتیں کیوں کیں۔ لیکن جب انھوں نے ان تمام مکالمات کو اپنے ذہن میں تازہ کیا تو انھیں سب کچھ جائز معلوم ہونے لگا۔ اس شخص کی باتیں یقیناً اشتعال انگیز تھیں۔ کافی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ آج شام وہ وزیر داخلہ سے ضرور ملیں گے۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوں گی۔ ایک تو سربراہان تنظیم ان کے اس عمل سے ان کی عظمت کے قائل ہو جائیں گے اور آئندہ ان سے رابطہ قائم کرتے وقت اس کا خیال رکھیں گے اور دوسرے ان

لوگوں کو ان کے مزاج کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ اس ملاقات کے لیے کی گئی ان کی تگ و دو بیکار نہیں جائے گی۔ وہ وزیر موصوف سے اپنے علاقے کی بہتری، وہاں تک بجلی، سڑک اور راستے میں پڑنے والی سسر کھدیری ندی پر مستقل پختہ پل بنوانے کے بارے میں تو باتیں کر ہی سکتے تھے۔ جس کے وعدے تو ہر الیکشن میں کیے جاتے رہتے تھے لیکن کوئی ان وعدوں کو ایفا کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہیں رہا۔ انھوں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی دوپہر کے بارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ یعنی ملاقات کے وقت میں ابھی تین گھنٹے سے زاید کا وقت باقی تھا۔

تین بجے وہ پوری طرح تیار تھے۔ انھوں نے وہاں جانے کے لیے خاص طور پر ٹیکسی منگوائی تھی جو ہوٹل کے نیچے کھڑی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ کالی داس مارگ پر، جہاں وزیر موصوف کی رہائش گاہ تھی، وہاں ان کا وہ دوست انوپ مشرا بھی ملنے والا تھا جس کے تعاون سے اس ملاقات کا اہتمام ہوا تھا۔ وزیر سے ملاقات کے دوران وہ بھی ساتھ رہنے والا تھا، جو ہمدان خاں کی ناعاقبت اندیشی کا ایک اور ثبوت تھا۔ وقت مقررہ پر وہ وہاں پہنچ گئے۔ وزیر کے سکیورٹی عملے نے انھیں مین گیٹ پر روک دیا۔ جب انھوں نے اپنا تعارف دیتے ہوئے بتایا کہ یہ ملاقات پہلے سے طے شدہ ہے تو سکیورٹی گارڈ نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ 'اس میں آپ کا اندراج رد کر دیا گیا ہے'۔ ہمدان خاں کے ساتھ موجود شخص نے گارڈ سے درخواست کی کہ وہ اندر جا کر یہ اطلاع کر دے کہ گیٹ پر انوپ مشرا کے ساتھ ان کے دوست ہمدان علی خاں موجود ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ ضرور اندر بلوا لیں گے۔ گارڈ انوپ مشرا سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وزیر موصوف کے پاس یہ اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے گیٹ کو مقفل کیا اور بنگلے کے اندر داخل ہو گیا۔ یہاں جو کچھ پیش آ رہا تھا، اس کی وجہ سے ہمدان خاں بری طرح پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ انھیں لگ رہا تھا کہ وزیر موصوف عزت کے ساتھ ان کا استقبال کریں گے لیکن یہاں تو ان کی توہین ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ایسے وزیر سے نہ ملنا ہی بہتر ہوگا لیکن بات چیت کی کمان اب ان کے ہاتھ میں نہیں انوپ مشرا کے ہاتھ میں تھی اور انوپ کو سکیورٹی گارڈ کے باہر آنے کا انتظار تھا۔ دس منٹ بعد وہ دوبارہ نظر آیا اور دروازہ کھولے بغیر ان سے کہا۔ 'صاحب نہ جانے کس موڈ میں ہیں۔ میں نے جب ان کو آپ کا پیغام پہنچایا تو جواب میں، معاف کیجیے گا، انھوں نے کہا کہ ان بیوقوفوں سے کہہ دو' بلا بول' واپس جاؤ، اور یہ کہتے ہوئے وہ

اپنے بیڈروم میں چلے گئے۔

'اس کا کیا مطلب ہوا؟' انوپ مشرا نے سکیورٹی گارڈ سے پوچھا۔

'اس کا مطلب میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں'۔ جواب ہمدان علی خاں نے دیا تھا۔ ان کا لہجہ بالکل ایسا تھا جیسے اب کی بار وہ کوئی چوک کرنا نہیں چاہتے۔ گارڈ کے منھ سے یہ الفاظ سن کر وہ کچھ گھبرا بھی گئے تھے۔ انھوں نے انوپ مشرا سے کہا۔ 'اب خیریت بس اسی میں ہے کہ یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو سکے، واپس چلے چلو۔ یہ معاملہ بڑا نازک اور الجھا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔ تم اپنے گھر جاؤ اور میں اپنے گھر۔ اور یہاں آنے کی خبر نہ تم کسی کو دینا اور نہ میں'۔ ہمدان خاں کے چہرے پر حیرانی، گھبراہٹ اور خوف کے سائے رینگ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ 'بلا بول' کا یہ سلسلہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاشرے میں حرکت البشر کی جڑیں کافی گہرائی تک پیوست ہیں اور اس بات کو سمجھنے میں ان سے چوک ہوئی تھی۔ ہمدان خاں کے اس طرح گھبرا جانے اور یہاں سے بغیر وزیر سے ملاقات کیے واپسی کے فیصلے کا سبب ان کے دوست کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ان کا یہ اقدام ان کے سابقہ مزاج سے بھی میل نہیں کھا رہا تھا۔ لیکن اسے یہی ٹھیک لگا کہ وہ اس وقت بحث سے گریز کرے اور خاں صاحب کے کہنے کے مطابق یہاں سے فوراً واپس لوٹ جائے۔

پینتیس

ہنومان گنج کے میدان میں ہندو رکشا سمیتی کی جن سبھا ہونے والی تھی۔ بھوپال میں ہندو مسلم فسادات ہونے کے بعد یہ پہلا اجتماع تھا جس میں سمیتی کے بڑے بڑے نیتاؤں کے آنے کی خبر تھی۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد ابھرنے والے ان فسادات میں بڑی تعداد میں انسانی جانوں کا نقصان ہوا تھا۔ خاص طور پر وہ مسلمان اپنی جان نہیں بچا سکے تھے جو دور دراز کی ہندو آبادیوں کے درمیان رہتے تھے۔ ان فسادات سے پہلے بھوپال عرف عام میں امن و امان کا گہوارہ کہلاتا تھا۔ یہ غلط بھی نہیں تھا۔ یہاں کے شہری امن پسند تھے اور آپس میں محبت اور رواداری کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے۔ ان میں ہندو مسلمان کی تفریق کا خیال بھی نہ تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد سے آج تک یہاں کوئی فساد نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں بھی نہیں جب ملک کی تقسیم کے وقت سارے ہندوستان میں آگ

کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ امن وامان کے اس گہوارے پر کافی عرصے سے فرقہ پرستوں کی نظر تھی، انھوں نے یہاں کے امن وامان کو ختم کرنے کی کوششیں بھی کی تھیں، لیکن چند در چند وجوہ کی بنا پر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوے تھے۔ بالآخر پچھلے فسادات کی شکل میں ان کو اپنے دیرینہ خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ اس بار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تھے۔

اس جن سبھا میں جو مقررین آنے والے تھے، وہ اپنی شعلہ بیانیوں کے لیے سارے ہندوستان میں شہرت رکھتے تھے۔ سارا ملک جانتا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان میں ایک بھی مسلمان دیکھنا نہیں چاہتے۔ اسی لیے بالعموم سارے شہر میں اور بالخصوص مسلم اکثریتی علاقوں میں خوف وہراس اور سنسنی کا ماحول پیدا ہوگیا تھا۔ ہر طرف لوگ یہی باتیں کر رہے تھے کہ جانے آج کیا ہونے والا ہے۔ ان حالات سے پولیس بھی بے خبر نہیں تھی۔ انھوں نے سارے شہر کو چھاؤنی میں تبدیل کر دیا تھا تاکہ لوگوں میں تحفظ کا احساس بیدار ہوسکے۔ لیکن ایک تو ایسے حالات میں انتظامیہ نے فرقہ پرستوں کو جن سبھا کرنے کی اجازت دے دی تھی، یہ ان کے گلے سے نیچے نہیں اتر رہا تھا اور دوسرے پچھلے فسادات کے دوران پولیس کے کارنامے کچھ اس طرح کھل کر سامنے آگئے تھے کہ اب ان پر بھروسا کرنا اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے جیسا تھا۔ مسلمانوں کو یقین ہوگیا تھا کہ پولیس ان کی دوست نہیں ہے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اب اس شہر میں فسادات کے دوران اپنے تحفظ کے لیے جو کرنا ہے خود انھیں ہی کرنا ہے۔ کیونکہ فرقہ پرستوں کے ساتھ ساتھ ان کا مقابلہ مسلح پولیس سے بھی ہوسکتا تھا۔ آگ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام مسلمان جو ہندو علاقوں میں رہتے تھے اور زندہ رہ گئے تھے، اونے پونے اپنے مکانات فروخت کرکے مسلم محلوں میں آکر آباد ہونے لگے تھے۔ اس منتقلی کا اثر ان ہندوؤں پر بھی پڑا جو مسلم محلوں میں رہتے تھے۔ چنانچہ یہی عمل انھوں نے بھی دہرایا۔ مسلمانوں میں فسادات کے بعد ایک عام تصور یہ ابھرا تھا کہ انھیں اپنی جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کا معقول انتظام کرکے رکھنا چاہیے۔ اس کے لیے اس دوران مسلم نوجوانوں نے کئی اقدامات کیے تھے۔ ان کی اکثریت نے جائز ناجائز طریقوں سے اسلحہ جات کی خریداری کی تھی۔ ان لوگوں نے قسمیں کھائی تھیں کہ وہ ہر حالت میں اپنا اتحاد بنائے رکھیں گے۔ ان انتظامات اور اپنے ارادوں اور حوصلوں کی پختگی کے ساتھ وہ اب کی بار بے خبر نہیں، پہلے سے تیار تھے۔ اس کا اندازہ پولیس کو بھی تھا اور ان کے توسط سے فرقہ پرست قوتوں کو

بھی۔ اب کی بار مسلمان کسی بھی طرح اپنے آپ کو اس فریب میں رکھنا نہیں چاہتے تھے کہ پولیس ان کو تحفظ فراہم کرے گی۔ چنانچہ ان کی بڑھتی ہوئی تعداد سے وہ قدرے فکرمند ہو گئے تھے۔

بالآخر شہر بھر کو خوف و ہراس کی گرفت میں لینے کے بعد جن سبھا کا دن آ گیا تھا۔ سارے شہر میں صبح ہی سے باہمی چہ می گوئیوں اور افواہوں کا بازار گرم تھا۔ انتظامیہ نے شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کرنے کا اعلان کر دیا تھا اور چاق و چوبند پولیس لوگوں کو ایک جگہ جمع ہونے سے روک رہی تھی۔ لیکن جو لوگ ان سپاہیوں کے واقف کار تھے وہ اس سے مستثنیٰ تھے۔ یہ پولیس والے نہ صرف ان کو جمع ہونے کی اجازت دے رہے تھے بلکہ ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے اور گپ شپ کا آنند بھی لے رہے تھے۔ ہنومان گنج کے میدان کو پولیس نے صبح ہی سے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اس میدان کے چاروں کیلوں پر تو پولیس تعینات تھی ہی، چہار دیواری سے ہٹے ہوئے بھی متعدد جوان کھڑے کیے گئے تھے، تا کہ کوئی دیوار پھاند کر میدان کے اندر داخل نہ ہو سکے۔ یہ انتظامات ان نیتاؤں کی حفاظت کے لیے کیے گئے تھے، جو اس جن سبھا میں شرکت کرنے والے تھے۔ نکڑوں، چائے کی دکانوں، کھانے کے ہوٹلوں، ہیر کٹنگ سیلونوں اور پارکوں میں جمع لوگ آنے والی شام کے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے۔

ایک من چلا نوجوان ہنومان گنج میدان کے پاس سے گذرا تو اس نے ایک پولیس والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کیوں خاں، آج ھو ریائے نا دنگل؟

'چپ بے سالے۔' پولیس والے نے اسے گھڑکتے ہوئے کہا۔

'ای کیا کہے ریائے سالا'۔ نوجوان زیر لب بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

یہ نوجوان اپنے حلیے سے کسی غریب گھر کا فرد معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر معمولی کپڑے اور پیروں میں ہوائی چپل تھے۔ لیکن وسائل کی ان قلتوں نے اس کے کھلنڈرے پن پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ اسے دوسرے کئی نوجوانوں کی طرح یہ شوق تھا کہ وہ کسی طرح جلدی سے امیر بن جائے۔ اس کے پاس لگژری کار ہو، شاندار بنگلہ ہو اور وہ آرام سے زندگی گذارے۔ اپنے ان خوابوں کو تعبیر سے ہم کنار کرنے کے لیے اس کے پاس دو متبادل تھے۔ ایک تو یہ کہ اس کے لیے وہ بمبئی جا کر فلموں میں کام کرنا چاہتا تھا۔ اور دوسرے وہ ایک بڑا غنڈہ بننا چاہتا تھا تا کہ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر، لوٹ مار کر کے رقمیں حاصل کرے اور جلدی سے بڑا آدمی بن جائے۔ لیکن اس کے پاس ان دونوں کاموں کو کرنے کے مناسب وسائل نہیں

تھے۔ نہ تو اس کے پاس اتنے پیسے تھے کہ وہ بمبئی جا کر فلموں میں اپنی قسمت آزما سکے اور نہ ایسا سامان تھا جس کی مدد سے وہ لوگوں کو ذرا دھمکا کر لوٹ مار کر سکے۔ پچھلے ہندو مسلم فسادات اس کے لیے رحمت بن کر آئے تھے۔ چاروں طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا تو وہ بھی اس بازار میں کود پڑا تھا۔ اس لوٹ مار سے اسے اتنا کچھ مل گیا تھا کہ اب وہ اپنے کام کے لیے وسائل مہیا کر سکتا تھا۔ یہ پیسے اس نے روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے بجائے انھیں وسائل کی فراہمی میں خرچ کیے تھے۔ اب اس نے بمبئی جا کر فلموں میں کام کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا، کیونکہ اس میں کام کے ملنے یا نہ ملنے کا خطرہ تھا۔ اس کے مقابلے میں اسے دوسرا کام آسان لگ رہا تھا۔ اور اب رفتہ رفتہ اسے اس کام کا خاصا تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ اور محلے پڑوس کے لوگ اس سے ڈرنے بھی لگے تھے۔

آج وہ یہ سوچ کر گھر سے نکلا تھا کہ آنے والے برے دنوں کے لیے گھر میں راشن پانی کا انتظام کر کے اسے شام تک خالی ہو جانا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ شام میں وہ بھی اطمینان سے اپنے پسندیدہ نیتاؤں کے بھاشن سنے گا۔ اس نے اڑتی اڑتی ایسی خبریں سنی تھیں کہ اس کے بعد لوٹ مار کا سلسلہ بھی شروع ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس نے اس کے لیے پوری تیاری کر رکھی تھی۔ پچھلے فسادات کے دوران اسی لوٹ مار کے طفیل اس کے کئی دوست امیر بن گئے تھے، مگر یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ اس لوٹ مار میں دیر سے شامل ہوا اور کوشش کے باوجود اس کے حصے میں کچھ خاص نہیں آیا تھا۔ اس بار اس نے اپنے آس پاس کے ان امیروں کی ساری تفصیلات جمع کر رکھی تھیں جن جن کے گھروں میں اسے دھاوا بولنا تھا۔ اب اسے معلوم تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جن کے پاس دو نمبر کا پیسہ گھر میں رکھا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ اسے کہاں اور کس طرح محفوظ رکھتے ہیں۔ اس نے اپنے ہم خیال دوستوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی بھی بنا رکھی تھی جو وقت پر اس کی مدد کر سکیں۔ اس نے اپنے اور اپنے دوستوں کے لیے کچھ معمولی ہتھیار بھی خرید لیے تھے۔ لوٹ مار میں ان کے حصے کے بارے میں بھی ساری باتیں طے ہو چکی تھیں۔ وہ مسلمانوں کو اس لائق ہی نہیں سمجھتا تھا کہ مزاحمت کر سکیں۔ پچھلے فسادات کے دوران اسے اس کا خاصا تجربہ ہوا تھا۔ گھر میں گھسے، چاقو یا پستول دکھائی اور سارے گھر کے لوگ غلاموں کی طرح ان کی ساری باتیں ماننے لگتے تھے۔ وہ سب ڈر کے مارے ایک طرف ہو جاتے اور لوٹ مار میں کوئی رکاوٹ نہیں کھڑی کرتے تھے۔ اس نے لوٹ مار کے کام کو اتنا آسان کبھی نہیں سمجھا تھا۔ ویسے اپنے کام میں اسے ہندو مسلمان کا فرق بے معنی لگتا تھا، لیکن ...

تو مسلمان اس کی نظر میں مسلمان بزدل تھے، دوسرے یہ بات اب اسے اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ مسلم گھروں کو لوٹنے میں پولیس بھی کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ یعنی کل ملا کر اب کی بار وہ پوری طرح تیار تھا۔ اس لیے اس کی دلی تمنا تھی کہ آج کی اس سبھا کے بعد اسے اپنی کارگزاری دکھانے کا ایک موقع مل جائے۔ تاکہ اس سے پچھلی بار تجربہ کاری میں جو غلطیاں ہو گئی تھیں، ان کا مداوا کر سکے۔ اس نے طے کیا ہوا تھا کہ اس بار اس سے کوئی چوک نہیں ہوگی۔

چھتیس

جیسا ڈر تھا ویسا کچھ نہیں ہوا۔ خدا کا کرم تھا کہ ہندو رکشا سمیتی کی جن سبھا ہو گئی لیکن فسادات نہیں ہوئے۔ ویسے منتظمین نے بلوہ کرانے کے لیے کوئی کور کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس جن سبھا میں حسب معمول وہ تمام اشتعال انگیز باتیں کی گئی تھیں، جن کے لیے یہ مقررین شہرت رکھتے تھے۔ کہا گیا تھا کہ مسلمان ہمارے مہمان تھے، ہم نے اپنی روایات کی پاس داری کرتے ہوئے انھیں اپنے گھر میں مہمان کی طرح رہنے کی اجازت دی تھی لیکن انھوں نے ہم پر زبردستی کرکے ہمارے گھر پر قبضہ ہی کر لیا ہے، انھیں مشورہ دیا گیا کہ وہ یہاں ہندو بن کر رہیں یا جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہ ملک چھوڑ دیں۔ مسلمانوں کے خلاف کھلے عام نعرے لگائے گئے، انھیں نامرد اور بزدل کہا گیا، انھیں مقابلے کے لیے للکارا گیا لیکن اس جن سبھا میں حرکت البشر کے چند کارکنوں کے سوا مسلمان تھے ہی نہیں جو ان کی ان باتوں سے مشتعل ہوتے اور جوابی کارروائی کے بارے میں سوچتے۔ پولیس ان کے ارادوں سے باخبر تھی، اس لیے خاموش رہی۔ ان کے افسران کا خیال تھا کہ آج ان پر کوئی زیادتی کی گئی تو اتنی بڑی بھیڑ کو سنبھالنا پولیس کے بس کا نہیں رہے گا۔ اس لیے سپاہیوں کو ایسے احکامات دیے گئے تھے کہ وہ یہاں کسی کے ساتھ زور زبردستی سے نہ پیش آئیں ورنہ انھیں فساد کرنے کا بہانہ مل جائے گا۔

مقررین کو بھی شاید یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی اس لیے وہ بھی خوب کھل کھیلے۔ جو کچھ کہہ سکتے تھے، کہا۔ جتنی نفرتیں بانٹ سکتے تھے، بانٹیں۔ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا، وہ سب ہندوستان کے آئین کے خلاف تھا، شہریوں کے دیے گئے بنیادی حقوق کی پامالی اور صریح خلاف ورزی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ ان نام نہاد محبانِ وطن میں سے نہ کسی کو آئین کی پروا تھی اور نہ وہ اس ملک میں امن و آشتی کا ماحول بنائے

رکھنے پر یقین رکھتے تھے۔

وہاں جو بھی ہوا، جو کچھ کہا گیا، دوسرے دن کے اخبارات میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں چھپا تھا۔ اخبار والوں کو اپنی آزادی کی قیمت معلوم تھی۔ وہ چاہتے تو سارا سچ چھاپ دیتے۔ لیکن اس حقیقت بیانی سے امن عامہ کے ساتھ ان کو ملنے والے سرکاری اشتہارات خطرے میں پڑ سکتے تھے۔ اور وہ ایسا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے اخبارات نے تمام خبروں کو معتدل کر کے اس طرح چھاپا تھا کہ اسے پڑھ کر کوئی مشتعل نہ ہو۔ انتظامیہ کو خوشی تھی کہ برا وقت ٹل گیا۔ فسادات نہیں ہوئے۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ مطمئن تھا کہ وہ ایک بڑے خطرے کی زد میں آنے سے محفوظ رہے۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے جب انھوں نے اپنی جانوں کے علاوہ بھی بہت کچھ گنوا دیا تھا اور وہ دوبارہ اس کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر پا رہے تھے۔ لیکن ان کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو اس خاموشی کو مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی، عافیت پسندی اور بزدلی سمجھ رہا تھا۔ انھیں لگ رہا تھا کہ ایسے ہندوؤں کو جو مسلمانوں کے بارے ایسے گندے خیالات رکھتے ہوں، ضرور سبق سکھانا چاہیے تھا۔ لوگوں کے خیالات کچھ بھی رہے ہوں لیکن عام طور پر مسلمانوں کو یہ ڈر بہر حال تھا کہ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی۔ جو زہر بویا جا رہا ہے وہ ایک نہ ایک دن سماج میں کوڑھ بن کر پھوٹے گا اور اس کے پہلے شکار مسلمان ہی ہوں گے۔ صبح کے اخبارات میں مسلمانوں کی خوش خلقی اور خوش کرداری، ان کی حب الوطنی اور مذہبی رواداری، ان کی امن پسندی اور حوصلہ مندی کے ساتھ ساتھ اسلام کا حوالہ دے کر ان کے صبر و ضبط اور قوت برداشت کی بھی خوب تعریف کی گئی تھی۔ کہا گیا تھا کہ اسلام سلامتی کا مذہب ہے اور دنیا میں امن و امان کے قیام میں اپنا مناسب کردار ادا کر رہا ہے۔ اسے پڑھ پڑھ کر عام طور پر مسلمان بھی مسرور و مطمئن نظر آ رہے تھے اور ہندو بھی۔ لیکن جو کچھ دکھائی دے رہا تھا وہ پورا سچ نہیں تھا۔ اندر کا سچ شاید یہ تھا کہ ان دونوں کے اندر ایک آتش فشاں پرورش پا رہا تھا، جو کسی بھی وقت لاوا اگلنے کو تیار تھا۔

کو ں خاں آج کا اخبار پڑھا غفور میاں؟ جہانگیر آباد چوراہے کے شمن ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے معمر بنے خاں نے اپنی ہی عمر کے دوسرے شخص سے پوچھا۔ یہ دیکھو۔ اس نے روزنامہ ندیم کا تازہ شمارہ دکھاتے ہوئے کہا۔ اِس میں اِسلام اَور مُسلمانوں کی کِتنی تعریف کی گئی ہے۔

اَرے کاں کا اَخبار مَخبار۔ غفور میاں جھنجھلا کر بولے۔ تُمی پڑھو اور خوش ہو لو۔ اپنی

تو جان جلتی ہے۔یہ بھینچو مسلمان اب اس ملک میں چوتیا بننے کے لیے ہی تو رہ گئے ہیں۔جھوٹی تعریف سن کر ان کی ایسی پھولتی ہے جیسے سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہو۔یہ نئیں دیکھتے کہ تعریف کرنے والوں کے اندر سنکھیا بھری ہے۔آج اللہ پاک نے بچا لیا تو لگے بکلانے، پر کل انہیں کون بچائے گا ان سالوں سے۔ ہے کسی کے پاس اس کی گارنٹی؟ میرے حساب سے تو اب یہی سب کچھ ہونے والا ہے یہاں روز روز۔ کب تک صبر کریں اور کب تک ان طفل تسلیوں سے خوش ہونے کا ناٹک کریں۔' غفور میاں غصے سے کانپ رہے تھے۔ جیسے اس موضوع پر بات شروع کر کے بنے خاں نے کوئی بہت بڑی غلطی کر دی ہو۔ چائے کا ایک لمبا گھونٹ لیتے ہوئے انھوں نے آگے کہا۔' زادہ سے زادہ مُسلمان اب یہ کریں گے کہ امن کمیٹیاں بنا کر ہندوؤں کے پیچھے پیچھے گھومیں گے، ان سے ہاتھ ملا کر اور گلے مل کر اخبار میں تصویریں چھپوائیں گے اور سب کو یہ یقین دلانے کی کوشش کریں گے کہ یہاں ہندوؤں اور مُسلمانوں کے بیچ میں بہت میل ملاپ ہے۔ ہم نے بھی ایک زمانے میں یہی سب کچھ کیا ہے میاں، پر اب جی بھر گیا ہے ان سب باتوں سے۔ اب یہ ناٹک بازی اپن سے نئیں ہوتی۔اور فرض کر لو اگر ان مسلمانوں کو لگا کہ ان کا غصہ قابو سے باہر ہو رہا ہے تو یہ بزدلے سالے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کھنّی والے میدان میں ایک مشاعرہ کر لیں گے۔ خوب واہ واہ پٹے گی۔ کچھ نیتا آئیں گے اور کورس میں بھائی چارے کے نعرے لگائیں گے، کچھ شاعر ہندو مسلمان ایکے پر شعر پڑیں گے اور یہ بھینچو بھولے مسلمان رات بھر پان کی پچکاریوں میں اپنا دکھ درد بھلا کر دوسرے دن اپنی اوقات پر آجائیں گے۔'

ہوٹل میں قدرے بھیڑ تھی۔ کچھ جلیبی پوہے کا ناشتہ کر رہے تھے، کچھ صرف چائے سے کام چلا رہے تھے اور کچھ محض خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ غفور میاں کے پر آواز بلند غصے کے اظہار نے ان میں سے اکثر کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ لیکن ان میں سے بیشتر ایک نظر اٹھا کر دیکھنے کے بعد پھر اپنے چائے ناشتے کے ساتھ انصاف کرنے میں مشغول ہو گئے تھے۔ ان کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی، کیونکہ ایسا ہی ایک طوفان وہ اپنے اندر بھی محسوس کر رہے تھے، جسے باہر نکلنے کا کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا۔ زیادہ تر لوگوں کے چہروں پر کل کی دہشت کے سائے ابھی تک موجود تھے۔ اسی بھیڑ میں شرعی داڑھی والا ایک نوجوان بھی تھا جو ان دونوں بزرگوں کی گفتگو بڑے دھیان سے سن رہا تھا۔

'ارے خاں بھیا میاں، تم نے تو بھوت لمبی جھاڑ دی۔' بنے خاں نے غفور میاں کو سمجھاتے

ہوئے کہا۔ 'اب اتنی بی اوور مت کرو۔ ہمیشہ غصے میں رہنا اور رونا بسورنا اچھا نہیں لگتا۔ کبھی تو ہم جیسوں سے ہنس بول لیا کرو۔ بہوت بڑا خطرہ ٹل گیا، سمجھو کان کے پاس سے نکل گئی۔ پورا بھوپال سکتے کے عالم میں تھا، کہ جانے کب کیا ہو جائے۔ فکر مند تھے کہ آنے والا وقت اس بار جانے کتنی جانوں کا نذرانہ مانگے۔ نہ اندر کی سانس باہر آتی تھی اور نہ باہر کی اندر جاتی تھی۔ اور تم ہو کہ تمیں کوئی خوشی ہی نہیں ہے، حیرت ہے۔'

'مجھے تو تمہاری حیرت پے حیرت ہو رہی ہے۔ خطرہ ٹلا کہاں ہے؟' غفور میاں نے کہا۔ 'آج نہیں تو کل، یہاں نہیں تو کہیں اور فساد تو ہونا ہی ہے۔ یقین جانو، ان ملکژوں کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ یہ لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ بیس کروڑ مسلمانوں کے لیے نہ تو کوئی ملک اپنے یہاں جگہ نکال سکتا ہے اور نہ یہ سمندر میں کود کر خود کشی کر نے والے ہیں۔ انہیں یہئیں ہندوستان میں جینا مرنا ہے۔ پھر بی ایسی باتیں کرنے کا صرف ایک ہی مقصد ہے۔ مسلمانوں کو چین سے نہ رہنے دیا جائے۔ اگر ان کے سروں پر لگاتار خوف کی تلوار لٹکتی رہے گی تو ایک نہ ایک دن انہیں احساس ہو جائے گا کہ وہ ہندوستان میں دوسرے درجے کے شہری ہیں اور پھر یہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ہندوئوں کے پاؤں کے نیچے رہیں گے۔'

'یہ ان کی خام خیالی ہے بھیامیاں۔' بنے خاں نے کہا۔ 'اگر وہ ایسا سوچتے ہیں تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو سمجھ ہی نہیں پائے، ایک ہزار سال ساتھ رہنے کے بعد بی۔' انھوں نے قدرے اشتعال میں آتے ہوے کہا۔ 'انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ وہی مسلمان ہیں۔ جو پارٹیشن کے وقت بھی میدان چھوڑ کر پاکستان نہیں بھاگے اور لاکھوں خطرے جھیلنے کے بعد بھی ہندوستان میں ہی رہنا پسند کیا۔ انہیں یاد رہنا چاہیے کہ ان مسلمانوں کے اندر اب بھی وہی خون گردش کر رہا ہے، جو غوری، غزنوی اور بابر کے جسم میں دوڑ رہا تھا۔ ان کو گالیاں دیتے رہنے سے ان تاریخی شخصیتوں سے ہمارا رشتہ ٹوٹ نہیں جائے گا۔ حقیقت یہی ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کا بھی ویسا ہی حق ہے جیسا ہندوئوں کا ہے۔ ہندوستان ہمارا بھی ملک ہے اور ہمیں بھی اپنے ملک سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ان کو ہے۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ ان کی دیش بھکتی محض ایک ڈھونگ ہے، وطن سے محبت کا اصلی جذبہ تو ہمارے ہی دلوں میں ہے۔ ہم اقلیت میں ہیں تو کیا فوائتین چار ملکوں کو چھوڑ دیں تو

ساری دنیا میں کسی ملک کی بھی اتنی آبادی نہیں ہے جتنی تعداد میں ہم یہاں ہندوستان میں رہتے ہیں۔ ایک نہ ایک دن یہ بات ان کی سمجھ میں آ ہی جائے گی۔ اور یہ بات جتنی جلدی ان کی سمجھ میں آ جائے اُتا ہی ان کے حق میں بہتر ہوگا، ورنہ کسی دن اسلام کے شیر اگر تیور بدل کر سامنے آ گئے تو یہ ہندوستان ایک عظیم الشان قبرستان میں بدل جائے گا۔

'ستار۔ ایسا سوچنے اور کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ جان کے بی انجان بنے رہتے ہیں۔ سمجھتے سب ہیں لیکن بس چین سے نہیں رہنے دینا چاہتے ماکڑے ہمیں' ۔غفور میاں نے کہا۔ 'یہ تو صاف کہتے ہیں کہ ہندوستان میں رہنا ہے تو ہندو بن کر رہنا پڑے گا۔ اب دیکھو ان کافروں کی یہ ہمت کہ ہم سے ہمارا مذہب چھوڑ دینے کی بات کرتے ہیں۔ جانتے نہیں کہ مسلمان کے لیے اپنا مذہب اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ وہ اپنی جان دے سکتا ہے، مذہب نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن ایسی بکواس کرنے پر کوئی اِنہیں روکنے والا بھی تو نہیں ہے۔ ماکڑی سرکار تو سوتی رہتی ہے۔ کتنی بے شرمی سے کہہ رہے ہیں کہ مسلمان ہمارے ملک میں مہمان بن کر آئے تھے۔ ارے مسلمانوں نے تم سے ہندوستان بھیک میں نہیں مانگا تھا، تلوار کے بل پر چھینا تھا تم بزدلوں سے۔ لیکن اسے فتح کر لینے کے بعد بھی وہ ایسے حاکم کبھی نہیں رہے کہ یہاں کے لوگوں سے نفرت کا سلوک کریں۔ جانے کتنی جاگیریں دی ہیں مندروں اور دوسری عبادت گاہوں کو۔ یقین نہ آئے تو جاکر پوچھ لیں، الہ آباد اور بنارس کے پنڈتوں سے۔ ہندوستان کو جیت لینے کے باوجود اُنہوں نے ہندوستان کو اپنا ملک سمجھا۔ اسے جنت کہا، یہاں جنت۔ اس ملک کی بہتری کے لیے ان سے جو کرتے بنا کیا۔ یہاں تک کہ اپنے اصلی مُلک افغانستان اور ترکستان تک کو بھول گئے۔ اُنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں سب کو اپنے اپنے مذہب کی پیروی کے لیے پوری آزادی دے کر اپنی رواداری کا ثبوت دیا۔ کسی مسلمان نے کسی ہندو کے ساتھ ناانصافی کی تو اسے بھی وہی سزا ملی جو کسی ہندو کو کسی مسلمان کے ساتھ ناانصافی کرنے پر ملتی۔ مذہبی طور پر اگر وہ اتنے روادار نہ ہوتے تو ایک ہزار سال کی حکومت کے بعد یہاں ایک بھی ہندو نہ بچتا، سب مسلمان ہو گئے ہوتے۔'

'کہنے کو تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو بھیا میاں' ۔بنّے خاں نے کہا۔ 'لیکن ہمارے ہاتھ میں آخر ہے ہی کیا۔ ہم دو بوڑھے مل کر بھلا کر بھی کیا سکتے ہیں۔ نہ تو ہم مسلمانوں میں اتحاد ہے نہ مل بیٹھ کر سوچنے بچارنے کی عادت۔ ہمیں تو آپس میں لڑنے کے لیے کوئی نہ کوئی

بہانہ چاہیے، جو کسی نہ کسی طرح ہم تلاش کری لیتے ہیں۔ کبھی ہم شیعہ، سنی بن جاتے ہیں تو کبھی بریلوی، دیوبندی یا تبلیغی۔کبھی پٹھان ، قصائی بن جاتے ہیں تو کبھی بھوپالی، غیر بھوپالی۔اوراس بہانے ہم ایک دوسرے کا سر پھوڑنے پر آمادہ نظر آنے لگتے ہیں۔ ہمارے دشمنوں کی ہمیشہ ہم پر نظر رہتی ہے۔ وہ ہمارے اسی نفاق کا تو فائدہ اٹھاتے ہیں۔وہ تو باقاعدہ طور پر انگریزوں کی اس پالیسی پر چل رہے ہیں کہ 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو'۔یہ ھندو نہ تو اسلام کو جانتے ہیں نہ مسلمانوں کو سمجھتے ہیں۔اور نہ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔بس ان کے نیتاان سے اسلام کے بارے میں الٹا سیدھا جو کچھ کہہ دیتے ہیں اسی پر یقین کرکے مسلمانوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔یہ نفرت دور ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ،غفور میاں ،آخراسلام تو ساری دنیا کو ایک دھاگے میں پرونے والا مذہب ہے نا۔ ویسے بھی بھلا کون سا ایسا مذہب ہو سکتا ہے جو نفرت کی تعلیم دے۔ اگر ہماری سوچ اور ہمارے عقیدے کے بارے میں یہ لوگ جانتے ہوتے تو ان نفرتوں کا وجود ہی ختم ہو گیا ہوتا۔ان کو جاننے ہی نئیں دیا جاتا۔نیتاؤں کی روزی روٹی سے جڑی ہوئی بات ہے یہ۔ اس لیے آگے بھی وہ اس دوری کو بنائے رکھنا چاہئیں گے۔ھندی میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کی مجبوری نے ایک اچھا کام تو یہ کیا ہی ہے کہ مسلمان بھی ھندو مذہب اور کلچر کے بارے میں جان گئے ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ ھندو مذہب برا نئیں ہے۔ لیکن ھندوخود اپنے مذہب کوکہاں مانتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسا کوئی نظام نئیں ہے جس سے ھندو بھی اسلام اور ہمارے بارے میں جان سکیں۔ہمارے پاس ایک مضبوط میڈیا کی کمی ہے۔اپنے میڈیا کی، جو ہمارے مفادات کا تحفظ کر سکے۔جو ہمارے بارے میں پھیلنے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکے۔ دولت مندوں کی کمی نئیں ہے مسلمانوں میں، ایک سے ایک امیر پڑا ہوا ہے ھندوستان میں۔ اپنے بھوپال ہی میں دیکھ لو سینکڑوں ہیں۔لیکن اس طرف کسی کا دھیان نئیں جاتاکہ اپنا ایک قومی اخبار ہو، اپنا ایک ٹی وی چینل ہو۔ سب اپنی اپنی تجوریوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ آزادی کی چھ دھائیاں گذر جانے کے بعد بھی ہمارے پاس ایک اخبار بھی ایسا نئیں ہے جو ہماری آواز بن سکے اور ہماری باتوں کو سارے ملک میں پہنچا سکے۔دیکھو نہ یہ ہے ہمارا میڈیا۔ بنے خاں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے روزنامہ ندیم کو دکھاتے ہوئے کہا۔ دو چار سو کی تعداد میں چھاپ لیتے ہیں پرویز میاں۔ دوسری جگھوں کی بات تو چھوڑیے ،اپنے بھوپال ہی میں کتنے لوگ پڑھتے ہیں اسے۔ سارے ھندوستان میں ہمارے پاس بس ایسے ہی اخبار ہیں۔

ان میں سے بھی نہ جانے کتنے ہندوئوں کے ھاتھ میں ھیں۔اگرھم میں اتحاد ھوتا تو یھی چھوٹے چھوٹے اخبار مالک ان اخباروں کو بند کرکے اسی پونجی سے ایک قومی اخبار نکال سکتے تھے۔یھی وجہ ھے کہ ھم چیختے چلاتے رئیں،توبھی یہ اخبار، میڈیا کے یہ لوگ ھماری طرف متوجہ نئیں ھوتے اور ھمارے دشمن کانا پھوسی بھی کریں تو سارے ھندوستان میں ان کی آواز سنائی پڑ جاتی ھے۔" بنے خاں سانس لینے کے لیے تھوڑی دیر رکے، پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔" ھم مربھی جائیں توان اخباروں میں ھمیں دو سطروں سے زیادہ کا حق نئیں ملتا۔وو بی اگر ان کی مہربانی ھو گئی تو خبر چھاپ دیں گے۔ اور چھاپیں گے بی تو اس طرح جیسے ھم اتنے برے ھیں کہ مرنا تو ھمارا مقدر ھی ھے۔کہیں نہ کہیں ھماری ھی غلطی پکڑ لیں گے اور اسے بار بار دوھراتے رھیں گے۔ اب حیدرآباد کے واقعے کو ھی لے لو۔ سالار مسجد میں کیا ھوا۔جمعہ کا دن تھا، مسجد میں سب مسلمان ھی تھے۔اچانک مسجدکے وضو خانے کے پاس بم پھٹااور انگنت مسلمان اپنی جانوں سے ھاتھ دھو بیٹھے۔اس کے بعد بھی کہتے ھیں اس میں مسلمانوں کا ھاتھ تھا۔ بھلا کوئی سوچ سکتا ھے کہ کوئی مسلمان یہ کام کر سکتا ھے۔لیکن یہ ھمارا میڈیا ھی تو ھے جس نے اس واقعے کے بعد بھی مسلمانوں کے خلاف ایک طوفان برپا کر دیا۔حیرت تو اس بات پر ھے کہ اُنیں شبہ تک نہیں ھوتا کہ کوئی غیر مسلم بھی یہ کام انجام دے سکتا ھے، جیسے وہ سب اتنے بھلے لوگ ھیں کہ ان کی شرافت کی قسمیں کھائی جا سکتی ھیں۔"

وہ نوجوان جو دونوں بزرگوں کی باتیں غور سے سن رہا تھا، اپنی بینچ سے اٹھا اور ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے مداخلت کرتے ہوئے ان سے کہا۔" بڑی دلچسپ اور کارآمد گفتگو کر رہے ہیں آپ لوگ۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ جیسے بزرگوں کے خیالات ہم نوجوانوں کے بڑے کام کے ہیں۔ آپ چاہیں تو ہماری صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں، اور میرا تو خیال یہ ہے کہ اگر نوجوان ارادہ کر لیں تو ہندوستان میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی عزت، آبرو اور ان کا وقار محفوظ رہ سکتا ہے۔"

"رہنے دو خاں، ھمیں معلوم ھے کہ آج کل کے نوجوان کس کلم کے ھیں۔" غفور میاں نے کہا۔

"نئیں غفور میاں، یہ لڑکا ٹھیک کے رہا ھے۔" بنے خاں نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔"ھمارا زمانہ تو لدگیابھائی میاں اور ھم اپنی نااھلی اور نلکارہ پن کی وجہ سے

اس سلسلے میں کچھ نہیں کر پاتی۔اب اگر نئی پیڑھی ایسا سوچتی ہے کہ وہ کچھ کر سکتی ہے تو ہمیں ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔" بنے خاں نے کچھ توقف کیا، پھر بولے۔"واقعی ہمیں ان نوجوانوں کو اہمیت دینی چاہیے۔تازہ دماغ ہے ان کا، پڑھے لکھے ہیں، ہماری تماری طرح ان پڑھ اور جاہل نہیں ہیں یہ ہمارا تجربہ اور ان کا عمل مل کر اس ملک میں انقلاب لا سکتے ہیں۔"

کیا فالتو باتیں کرتے ہو بنے خاں۔" غفور میاں نے بیزاری سے کہا۔"یہ ملگٹے کھلنڈرے نوجوان، جنہیں نہ آگے کا پتا نہ پیچھے کا، ہماری عزت بچا سکتے ہیں۔ رہنے دو خاں۔اس مُلک میں اب کوئی تبدیلی نہیں آنے والی۔ اللہ پاک نے جب تک زندگی ہے جی لو اور جب اور جس طرح موت لکھی ہے اسی طرح مر جاؤ۔" انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔"آہن تو چلے خاں اپنے گھر۔فالتو وَخت نہیں ہے اپنے پاس۔ تُمیں رہنا ہے تو رہو ملگٹے احمقوں کی جنت میں۔ سالی رات بھر نیند نہیں آئی۔ کچھ تو اس بات کا خوف تھا کہ آج کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے اور کچھ مچھروں نے بھی مہربانی کی۔ اب جا کر آرام سے سوئیں گا۔اس بیچ اگر ہندوستان میں انقلاب آ جائے تو مجھے آکر جگا دینا۔ میں بھی دیکھ لوں گا تُمارا نَیا ہندوستان۔" وہ بنے خاں پر طنز کے تیر چلاتے ہوئے اٹھے اور ہوٹل سے باہر نکل گئے۔

"عجیب سنکی اور بے وقوف آدمی ہے یہ بھی، بڈھا ہو کر جیسے واقعی سٹھیا گیا ہے۔" بنے خاں نے جاتے ہوئے غفور میاں پر حقارت سے ایک نظر ڈالی۔انھیں یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی کہ اتنے اہم موضوع پر گفتگو ہو رہی ہو اور سامنے والا گفتگو کو درمیان میں چھوڑ کر اس طرح اٹھ کر چلا جائے۔انھیں سچ مچ توہین کا احساس ہو رہا تھا۔انھیں لگ رہا تھا کہ جیسے غفور میاں نے اس نوجوان کے سامنے انھیں ننگا کر دیا ہو۔آخر وہ نوجوان کی طرف کچھ خفت کے ساتھ دیکھتے ہوئے بولے۔"یہی تو مسئلہ ہے ہم لوگوں کا۔ایسے ہیں آج کل کے بُزرگ۔کبھی کُچھ مثبت انداز میں سوچتے ہی نہیں۔نہ تو خود میں کچھ کرنے کی ہمت اور سکت ہے، نہ کسی کو کچھ کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ ساری زندگی تانگہ گھسیٹتے ہوئے گذار دی۔دو وقت کی روٹی بھی ٹھیک سے نہ کما سکے۔ایک جھونپڑی تک نہیں بنا سکے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے اور باتیں کرتے ہیں مُلک و ملّت کی۔بس شادی کرنے کا شوق رہا زندگی بھر۔ ایک کو چھوڑا تو دوسری کو پکڑ لائے۔"

بنے خاں اپنے دل کی بھڑاس نکال کر کچھ سکون محسوس کر رہے تھے۔انھیں قریب سے جانتے

والے جانتے تھے کہ خود بنے خاں نے شادی کا جھنجھٹ نہیں پالا، اس لیے تمام شادی شدہ لوگوں کو کوسنا ان کے روز مرہ کا حصہ تھا۔ کئی قصے مشہور تھے، ان کے شادی نہ کرنے کے فیصلے کے بارے میں۔ کوئی کہتا تھا کہ جوانی میں کسی کافر حسینہ کو دل دے بیٹھے تھے اور لڑکی کے باپ نے، جو تھانہ پولیس کے کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھا، نہ صرف یہ کہ اپنی لڑکی کی شادی اپنے مذہب کے باہر کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ ان کی اس دیدہ دلیری پر ان کی خوب پٹائی بھی کروائی تھی۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ عورت کے لائق ہی نہیں تھے تو شادی کیا کرتے۔ کوئی انھیں 'بھوپالی شوق' کی علت میں مبتلا سمجھتا تھا اور کوئی ان کی مسلسل بے روزگاری کو شادی سے گریز کا سبب گردانتا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن بنے خاں ان تمام باتوں سے بے نیاز تھے۔ اکثر لوگ انھیں اس موضوع پر چھیڑا بھی کرتے تھے لیکن وہ سب کو بڑی ہی خوش دلی سے جواب دے دیتے تھے۔ معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے، ہمدرد انسان تھے، لوگوں کے دکھ درد میں شامل رہتے تھے، اس لیے محلے والے ان کی عزت کیا کرتے تھے۔ چائے اور چار مینار سگریٹ ان کی عیاشی کے سامان تھے۔ ان کی ساری دنیا جہانگیر آباد تک محدود تھی۔ وہ شہر کے باہر تو کبھی نکلے ہی نہیں تھے، اپنے محلے سے باہر آنے جانے کا بھی کم ہی اتفاق ہوا کرتا تھا۔ صحیح معنوں میں ان کا تجربہ اسی چھوٹے سے محلے تک محدود تھا۔ لیکن مطالعے کے شوقین تھے، اس لیے دنیا بھر کی خبریں انھیں معلوم رہتی تھیں۔ زود حس تھے اس لیے ان کا حلقہ احباب بہت محدود تھا۔ انھیں ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ لوگ ان کا دل دکھا دیں گے۔ اس لیے گھر، مسجد، اپنی مخصوص سگریٹ کی دکان اور شمن ہوٹل کے علاوہ انھیں کہیں اور نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ان کی زندگی اصولوں کی پابند تھی۔ دن میں کتنی بار چائے پینا ہے اور کتنے سگریٹ ایک دن میں خرچ کرنا ہے، یہ طے تھا۔ کسی بھی حالت میں اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی تھی۔ انھیں موسیقی سے بھی دلچسپی تھی، خصوصاً کلاسیکی موسیقی سے۔ استاد بسم اللہ خاں اور پنڈت روی شنکر کا نام بڑی عزت سے لیتے تھے۔ کبھی کبھی مجرا سننے لکشمی ٹاکیز بھی چلے جایا کرتے تھے، لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ جوان تھے۔ اب نہ تو ان کا مجرا سننے کا شوق باقی تھا اور نہ وہ جگہیں باقی تھیں جہاں یہ مجرے ہوا کرتے تھے۔ لوگوں کی دلچسپیاں بدل چکی تھیں۔ آج کی سچائی یہ تھی کہ وہ پابندی سے پانچوں وقت کے نماز آم والی مسجد میں جماعت سے پڑھتے تھے اور ہر ملنے جلنے والے سے عہد لیتے تھے کہ نماز کی پابندی کرے۔ اپنی زندگی صبر و قناعت کے ساتھ گذار رہے تھے۔ والدین نے اتنا کچھ تو چھوڑا ہی تھا کہ وہ تنگی ترشی ہی سے سہی اپنی بسر اوقات کر سکیں۔

نے پوچھا۔ نماز کہاں پڑھتے ہو؟

'ظہر اور عصر کی منڈی ڈیپ میں اور باقی نمازیں نیم والی سڑک پر مکہ مسجد میں'۔ مسعود خاں نے مختصر سا جواب دیا۔

سینتیس

تاریخی اہمیت کے حامل اقبال میدان میں، جس کا پرانا نام کھرنی والا میدان تھا، انجمن ادب اور حلقہ ارباب قلم کے اشتراک سے ایک کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایسے ماحول میں، جب لوگ دہشت، انتشار اور غم وغصہ کی کیفیات سے گذر رہے تھے، کسی کو اچانک مشاعرے کے انعقاد کا خیال آجانا حیرت کی ہی بات تھی۔ منتظمین کے دلوں میں شاید یہ خیال رہا ہوگا کہ اس طرح اہالیان بھوپال کو اپنا غم بھلانے میں مدد ملے گی اور شہر کچھ اور تیزی سے اپنے معمول کی زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔ ان کا ایسا سوچنا غلط بھی نہیں تھا۔ بھوپال کے لوگ شعر وشاعری کے دلدادہ تھے۔ یہاں اکثر مشاعرے ہوتے ہی رہتے تھے اور ان میں شہریوں کی ایک کثیر تعداد شرکت کرتی تھی۔ لیکن اس مشاعرے کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ یہ ایسے وقت میں ہو رہا تھا جب اہل بھوپال ایک بڑے ہندو مسلم فساد کے خوفناک سائے سے باہر نکل کر اپنے بچھڑنے والوں کے غم میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بھوپال شہر غزل کہلاتا تھا، جو اپنے سخن فہم سامعین کے لیے سارے ہندوستان میں شہرت رکھتا تھا۔ شاید یہ اکلوتا شہر ہوگا جہاں مشاعروں میں داد دینے اور ہوٹنگ کرنے والوں کی باقاعدہ انجمنیں تھیں۔ مشاعرے میں شرکت کرنے والے شاعروں میں عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی اپنے معیار کلام کی سند چاہتا ہے تو وہ بھوپال کے شائقین سخن کے سامنے جا کر اپنا کلام سنائے۔ مشاعروں میں شرکت کی غرض سے یہاں آنے والے مہمان شعرا اکثر اس کا اعتراف بھی کرتے رہتے تھے۔

اقبال میدان علامہ اقبال کے قیام بھوپال کی یادگار تھا۔ اسے شیش محل کی اُس عمارت کے سامنے تعمیر کیا گیا تھا جہاں کبھی وہ علاج کی غرض سے اپنے دیرینہ کرم فرما، فرماں روائے بھوپال، نواب حمید اللہ خاں کے مہمان خاص کی حیثیت سے قیام پذیر ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے اپنے اس عزیز دوست اور عظیم مہمان کے آرام وآسائش کا خیال رکھنے کے لیے اپنے مخصوص عملے کے ایک

اس سلسلے میں کچھ نہیں کر پائے۔اب اگر نئی پیڑھی ایسا سوچتی ہے کہ وہ کچھ کر سکتی ہے تو ہمیں ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔' بنے خاں نے کچھ توقف کیا، پھر بولے۔'واقعی ہمیں ان نوجوانوں کو اہمیت دینی چاہیے۔تازہ دماغ ہے ان کا، پڑھے لکھے ہیں، ہماری تماری طرح ان پڑھ اور جاہل نہیں ہیں یہ ہمارا تجربہ اور ان کا عمل مل کر اس ملک میں انقلاب لا سکتے ہیں۔'

کیا فالتو باتیں کرتے ہو بنے خاں۔' غفور میاں نے بیزاری سے کہا۔'یہ ماکڑے کھلنڈرے نوجوان، جنہیں نہ آگے کا پتا نہ پیچھے کا، ہماری عزت بچا سکتے ہیں۔ رہنے دو خاں۔اس مُلک میں اب کوئی تبدیلی نہیں آنے والی۔ اللہ پاک نے جب تک زندگی ہے جی لو اور جب اور جس طرح موت لکھی ہے اسی طرح مر جاؤ۔'انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔'آہن تو چلے خاں اپنے گھر۔فالتو وَخت نہیں ہے اپنے پاس۔ تُمیں رہنا ہے تو رہو ماکڑے احمقوں کی جنت میں۔ سالی رات بھر نیند نہیں آئی۔ کچھ تو اس بات کا خوف تھا کہ آج کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے اور کچھ مچھروں نے بھی مہربانی کی۔ اب جاکر آرام سے سوئوں گا۔اس بیچ اگر ہندوستان میں انقلاب آ جائے تو مجھے آکر جگا دینا۔ میں بھی دیکھ لوں گا تُمارا نیا ہندوستان۔' وہ بنے خاں پر طنز کے تیر چلاتے ہوئے اٹھے اور ہوٹل سے باہر نکل گئے۔

'عجیب سنکی اور بے وقوف آدمی ہے یہ بھی، بڈھا ہو کر جیسے واقعی سٹھیا گیا ہے۔' بنے خاں نے جاتے ہوئے غفور میاں پر حقارت سے ایک نظر ڈالی۔ انھیں یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی کہ اتنے اہم موضوع پر گفتگو ہو رہی ہو اور سامنے والا گفتگو کو درمیان میں چھوڑ کر اس طرح اٹھ کر چلا جائے۔ انھیں بچ بچ توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ انھیں لگ رہا تھا کہ جیسے غفور میاں نے اس نوجوان کے سامنے انھیں ننگا کر دیا ہو۔ آخر وہ نوجوان کی طرف کچھ خفت کے ساتھ دیکھتے ہوئے بولے۔'یہی تو مسئلہ ہے ہم لوگوں کا۔ایسے ہیں آج کل کے بُزرگ۔کبھی کُچھ مثبت انداز میں سوچتے ہی نہیں۔نہ تو خود میں کچھ کرنے کی ہمت اور سکت ہے، نہ کسی کو کچھ کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ ساری زندگی تانگہ گھسیٹتے ہوئے گذار دی۔دو وقت کی روٹی بھی ٹھیک سے نہ کما سکے۔ایک جھونپڑی تک نہیں بنا سکے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے اور باتیں کرتے ہیں مُلک و ملّت کی۔بس شادی کرنے کا شوق رہا زندگی بھر۔ ایک کو چھوڑا تو دوسری کو پکڑ لائے۔'

بنے خاں اپنے دل کی بھڑاس نکال کر کچھ سکون محسوس کر رہے تھے۔ انھیں قریب سے جانے

شہری انتظامیہ اس مشاعرے کو بخیر و عافیت انجام تک پہنچانے کے لیے پوری طرح مستعد تھا۔ ایک تو شہر کا تناؤ اور انتشار بھرا ماحول ان کے لیے فکرمندی کا سبب تھا، دوسرے اسٹیج پر موجود رہنے والے وی وی آئی پی حضرات ان کی ذمے داری میں اضافہ کر رہے تھے۔ وہ فکرمند تھے۔ شہر پچھلے فسادات کے بعد سے ابھی تک معمول پر نہیں آیا تھا۔ ایسے ماحول میں اتنے بڑے مجمع عام کو سنبھالنا، جہاں شعرا کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنما بھی موجود ہوں، آسان کام نہ تھا۔ ان سب کی حفاظت کی ذمے داری ان پر ہی کی تھی۔ ایسے میں اگر کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو ان سے جواب طلب کیا جاسکتا تھا اور بات ان کی ملازمت تک آسکتی تھی۔ اس لیے وہ حفاظتی انتظامات میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ چنانچہ دن ہی سے چاروں طرف جانے والے راستوں پر پولیس کے جوان تعینات کر دیے گئے تھے اور انھیں ہمہ وقت چوکس رہنے کی ہدایات کی گئی تھیں۔

مشاعرہ شروع ہونے سے ایک گھنٹہ قبل احتیاطاً ایک بار پھر اقبال میدان اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی تلاشی لی گئی۔ بموں کی شناخت کرنے والے کتے اور انھیں تحلیل کرنے والا دستہ بھی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ نگرانی کے لیے اطراف کی عمارات کی چھتوں پر پولیس کے جوان تعینات تھے۔ ظاہر ہے ان انتظامات کے بعد دہشت گردی کے کسی امکان کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ مشاعرے کے دوران لوگوں کے تحفظ کے لیے پولیس عملے کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی فکرمند تھے۔ یہ حرکت البشر کے متعین کردہ چار مجاہدین تھے۔ مشاعرہ گاہ میں ان چاروں کے بیٹھنے کی جگہ پہلے سے متعین کی جاچکی تھی۔ مشاعرے کا افتتاح نو بجے ہونے والا تھا اور ان چاروں کو پندرہ منٹ پہلے پہنچ کر اپنی اپنی جگہ لے لینی تھی۔ پونے نو بجے جب حرکت البشر کا یہ مختصر لیکن تربیت یافتہ خفیہ عملہ وہاں پہنچا تو ان کی امید کے خلاف مشاعرہ گاہ میں تل رکھنے کو بھی جگہ نہیں رہ گئی تھی۔ اب وہاں پولیس مزید لوگوں کو داخل ہونے سے روک بھی رہی تھی۔ چنانچہ یہ مجاہدین اب اپنی اپنی متعینہ جگہوں پر کسی بھی حالت میں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ظاہر ہے اس مشاعرے میں شرکت کرنے والے سامعین کی تعداد کا اندازہ لگانے میں ان سے چوک ہوگئی تھی۔ انھوں نے ایک بار اپنی اپنی جگہوں تک پہنچنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن پولیس نے انھیں وہاں جانے ہی نہیں دیا، چنانچہ مجبور ہو کر وہ چاروں سڑک کی دوسری جانب موتی مسجد کی دیوار کے سہارے بچھے فرش پر بیٹھ گئے۔

اسٹیج پر تمام شعرا پہنچ چکے تھے۔ مشاعرہ شروع کرنے کے لیے صاحب صدر اور مہمانان خصوصی

'انھیں چھوڑیے چچا'۔ نوجوان نے ان کی توجہ ایک بار پھر اصل موضوع کی طرف لانے کی غرض سے کہا۔' بزرگ انسان ہیں۔ جانے دیجیے انھیں۔ اس عمر میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے'۔

'تمھاری عمر بھی تو وہی ہے میاں'۔ بنّے خاں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ 'لیکن اللہ پاک نے ہمیں ایسی جہالت سے محفوظ رکھا ہے'۔

'کیا کریں چچا میاں، ہمارے یہاں اکثریت تو غفور میاں جیسے لوگوں کی ہی ہے'۔ اس نوجوان نے کہا۔' ہم میں ایسے لوگوں کی واقعی کمی ہے جو اپنے دلوں میں ملک و ملت کا درد رکھتے ہوں اور جو اپنی خود غرضی کے حصار سے باہر نکل کر دوسروں کے بارے میں سوچتے اور ان کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں۔ لیکن اگر واقعی ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں تو بہتر حالات کا انتظار کیے بغیر فوراً کام شروع کر دینا چاہیے۔ ہم اپنا کام ایسے لوگوں کو چھیڑے بنا بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس سے جھگڑے کا ایک نیا محاذ کھل جاتا ہے اور ہمارا بنیادی کام وہیں کا وہیں دھرا رہ جاتا ہے'۔

'صحیح کہتے ہو نوجوان'۔ بنّے خاں نے نوجوان کے اس بیان میں اپنی تعریف کا پہلو نکال لیا تھا۔ انھوں نے قدرے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ 'تمھارا تعارف نہیں ہوا ابھی تک، میرا نام بدر الدین خاں ہے۔ لیکن سب لوگ مجھے بنّے خاں بھوپالی کے نام سے جانتے ہیں'۔ وہ بولے۔ 'تم پڑھے لکھے اور ذہین معلوم ہوتے ہو یو پی کے لگتے ہو'۔ جیسے وہ آج کی اپنی اس نئی دریافت سے کافی خوش تھے۔

'یہ آپ کی خورد پروری ہے محترم، ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔ ویسے میرا نام مسعود ہے، مسعود خاں۔ فتح پور، یو پی میرا آبائی وطن ہے۔ اس وقت منڈی دیپ کی ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں اور بھوپال میں چرچ کے سامنے والی گلی میں رہتا ہوں'۔

'تم سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ اور یہ میں رسمی طور پر نہیں کہہ رہا ہوں'۔ بنّے خاں نے اپنے لہجے میں شیرینی گھولتے ہوئے کہا۔ وہ اتر پردیش کے رہنے والوں سے مل کر ویسے بھی خوش ہو جاتے تھے، کیونکہ ان کے آبا و اجداد کا تعلق بھی اتر پردیش کے فرخ آباد شہر سے تھا۔ پھر یہ نوجوان تو پڑھا لکھا اور ملک و ملت کا درد رکھنے والا معلوم ہو رہا تھا۔ 'اللہ چاہے گا تو آئندہ بھی تمھاری ملاقات ہوتی رہے گی'۔ انھوں نے کہا اور پھر انھیں جیسے کچھ یاد آ گیا۔ جلدی سے انھوں

روانہ کر دیا گیا۔ ایک سب انسپکٹر مائک سے لوگوں کو صبر وضبط کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کر رہا تھا، لیکن وہاں اس کی آواز سننے کی فرصت کسی کو نہیں تھی۔ جوانوں کی ایک بڑی تعداد بھاگنے والے لوگوں کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن ہجوم پوری طرح بے قابو ہو چکا تھا۔ نفسی نفسی کا وہ عالم تھا کہ لوگوں کے دلوں میں بھوپال گیس المیہ کی یادیں ایک بار پھر تازہ ہو گئی تھیں۔ کسی کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ سب کو صرف اپنی جان بچانے کی فکر لاحق تھی۔ چنانچہ لوگ اس کی پروا نہیں کر رہے تھے کہ ان کے پیروں کے نیچے کون کچل رہا ہے۔ وہ زندہ بھی بچا یا مر گیا۔ بس لوگوں کی کوشش یہ تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے جائے حادثہ سے دور چلے جائیں۔ انھیں لگ رہا تھا کہ جانے ابھی ایسے اور کتنے دھماکے ہو سکتے ہیں۔ موتی مسجد کی دیواروں سے لگے بیٹھے حرکت البشر کے چاروں مجاہدین بھی اپنی جگہ سے دوڑے لیکن ان کا رخ مشاعرہ گاہ کی جانب اس طرف تھا جہاں دھماکا ہوا تھا۔ انھوں نے تھوڑے فاصلے سے دیکھا کہ بم جہاں پھٹا تھا وہاں اب بھی دھواں ہی دھواں بھرا تھا۔ پولیس کے جوانوں نے وہاں مورچہ سنبھال لیا تھا اور وہ لوگوں کو وہاں سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

لوگوں کو دوسرے دن کے اخبارات سے اس حادثے کی تفصیلات کا پتہ چلا۔ بم دراصل مشاعرہ گاہ سے کافی فاصلے پر بڑے دروازے کی پشت پر بنے ہوئے ایک طاق میں رکھا گیا تھا۔ اسے طاق میں رکھنے کے بعد اس پر سیمنٹ کی جالی اس طرح لگا دی گئی تھی کہ وہ دیکھنے والے کو دیوار کا فطری حصہ لگے اور بم پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ یہ ٹائم بم تھا جس میں موبائل رموٹ سے دھماکا کرنے کی سہولت بھی تھی۔ ظاہر ہے پولیس نے تلاشی کے دوران اس طاق کو دیکھا ضرور ہوگا لیکن اس نے اسے دیوار کا فطری حصہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہوگا۔ حالانکہ پھٹنے والا یہ بم زیادہ طاقت ور نہیں تھا، پھر بھی اس کے دھماکے سے تین لوگ موقع واردات پر ہی جاں بحق ہو گئے تھے، جو اقبال میدان میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے یہاں بیٹھ کر مشاعرے کا لطف لے رہے تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی دس بارہ سے کم نہیں تھی، جنھیں اخبار کے مطابق عوام اور پولیس نے مل کر فوراً حمیدیہ اسپتال پہنچا دیا تھا۔ بھگدڑ سے کچلنے والوں میں سب کی جانیں محفوظ تھیں البتہ ان میں سے کچھ بری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ اب وہ حمیدیہ اسپتال میں زیر علاج تھے۔ ان کی تعداد بھی پچاس ساٹھ سے کم نہیں تھی۔ اخبار نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس بم میں آر ڈی ایکس کا استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

فرزند منون حسن خاں کو مامور کیا تھا، جو بعد میں تاحیات حضرت علامہ کی صحبت کا فیض اٹھانے اور ان کی کفش برداری کی خدمت پر نازاں رہے۔ یہ میدان انھی منون حسن خاں کے عشق اقبال کا نتیجہ تھا، جسے وہ سالہا سال کی مسلسل تگ و دو، بے شمار یادداشتوں اور سرکاری تازیرواریوں کے بعد بنوانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ شیش محل کی اس عمارت کے سامنے اس میدان کے علاوہ ایک مینار شاہین بھی تعمیر کیا گیا تھا، جس کے اوپر ایک بڑی چٹان پر اقبال کی شاعری کے مثالی پرندے، شاہین کا مجسمہ نصب کیا گیا تھا، جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ جدید مجسمہ سازی کا شاہکار ہے۔ اقبال میدان کے مغربی سرے پر جو اسٹیج تعمیر کیا گیا تھا اس کے نیچے ایک بڑے ہال میں اقبال لائبریری قایم تھی، جہاں علم و ادب کے شائقین آکر اپنی علمی تشنگی کا ازالہ کیا کرتے تھے۔ یہ لائبریری ایک ایسی مرکزی جگہ پر تھی جہاں شہر کے شعرا و ادبا بہ آسانی پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ یہاں اکثر لوگ اس لیے بھی آجایا کرتے تھے کہ اس طرح ایک ہی مقام پر کئی لوگوں سے ملاقات کی سبیل پیدا ہو جاتی تھی۔ اقبال میدان کے مشرق میں موتی مسجد کی شاندار تاریخی عمارت تھی، جس کے بلند منارے اور گنبد اپنی عظمت کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال میدان کی شان و شوکت میں بھی اضافہ کر رہے تھے۔ میدان کے شمال میں شیش محل اور اقبال میدان کے درمیان وہ سڑک تھی جو حمیدیہ اسپتال کو جاتی تھی۔

رات میں منعقد ہونے والے مشاعرے کے لیے سارا دن تیاریاں کی گئی تھیں۔ میدان کو مناسب طور پر آراستہ کیا گیا تھا، اس کی تشہیر کے لیے شہر میں جگہ جگہ پوسٹر لگائے گئے تھے، جن میں ان تمام مقامی و بیرونی شعرائے کرام کی فہرست تھی جو اس مشاعرے میں شرکت کرنے والے تھے۔ باہر سے آنے والے شعرا کو قریب کے ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا تھا اور مقامی شعرا وقت پر سیدھے مشاعرہ گاہ پہنچنے والے تھے۔ منتظمین کو شاید اندازہ تھا کہ جب شہر کے شائقین شعر و سخن یہاں آنا شروع ہوں گے، تو اقبال میدان اپنی وسعت کے باوجود تنگ پڑ سکتا ہے۔ اس لیے انھوں نے آس پاس کی سڑکوں پر دور تک لاؤڈ اسپیکر لگوا دیے تھے۔ تاکہ جو لوگ میدان تک نہ پہنچ سکیں وہ اپنے محبوب شعرا کا کلام کہیں بھی کھڑے ہو کر سن لیں۔ مشاعرے کی صدارت کی ذمے داری شہر بھوپال کے ایک ہر دل عزیز سیاسی رہنما اور صوبے کے سابق وزیر کے سپرد کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی مہمانان خصوصی کی ایک طویل فہرست تھی جو صدر کی معیت میں اسٹیج پر جلوہ افروز ہونے والے تھے۔

انتظامیہ کو اس بات سے قدرے اطمینان حاصل ہوا تھا کہ ابھی تک شہریوں کی جانب سے کسی طرح کا کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ دوسری طرف جو لوگ اس حادثے کو انجام دینے کے ذمہ دار تھے، وہ بغلیں بجا رہے تھے۔ ان کے حوصلے مزید بلند ہوے تھے۔ پولیس کو ان لوگوں پر شک تک نہیں ہوا تھا۔ ان کی تحقیق و تفتیش کا رخ ہی دوسرا تھا، اس لیے یہ لوگ خود کو پوری طرح محفوظ سمجھ رہے تھے۔ ان کے اس یقین کو مزید تقویت پہنچی تھی کہ پولیس پہلے کی طرح اب بھی ان کے لیے معاون ثابت ہو رہی ہے۔ کیونکہ ابھی تک جن لوگوں کی گرفتاری عمل میں آئی تھی، وہ مقامی مسلم نوجوان تھے، جن پر بین الاقوامی دہشت گردوں سے تعلق رکھنے اور اس حادثے کو انجام دینے کا الزام لگایا گیا تھا۔ یہ غریب مسلم گھروں کے نوجوان تھے جن کے نام چوری چکاری، لوٹ مار اور جیب کاٹنے جیسے جرائم کی وجہ سے پولیس کی رکارڈ میں درج تھے۔ اس سے وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ پولیس کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ پولیس نے ان نوجوانوں کو گرفتار کر کے لوگوں کی توجہ ان کی طرف سے ہٹا دی تھی۔ اب یہ بات بھی اچھی طرح ان کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ بھوپال کے مسلمانوں کے ساتھ خواہ کیسی ہی بدسلوکی کی جاے، یہ بزدل کسی طرح کے ردعمل کا اظہار نہیں کرتے۔ پچھلے فساد کے دوران بھی انھیں اس کا خاطر خواہ تجربہ ہوا تھا۔ اس وقت بھی انھوں نے دیکھا تھا کہ جب جب وہ کسی گھر میں گھس کر لوگوں کی املاک لوٹنے اور انھیں جان سے مارنے کا ارادہ کرتے تھے تو یہ لوگ بس ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم اور زندگی کی بھیک مانگتے تھے۔ سارے شہر میں کوئی ایک بھی مائی کا لال ایسا نہیں نکلا تھا، جس نے ان کا مقابلہ کرنے کی جرات یا کسی طرح کی کوئی مزاحمت کی ہو۔ حالانکہ کبھی کبھی اپنے گھر میں ان کی تعداد حملہ آوروں سے بھی کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ وہ یہ سمجھنا بھی نہیں چاہتے تھے کہ بغیر کسی ہتھیار کے خالی ہاتھ ایسے حالات میں، جب ذرا سی چوک پر جان جانے کا خطرہ ہو، کسی ہتھیار بند دشمن کا مقابلہ کوئی کیسے کر سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے طور پر اس بات کا بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ بھوپال میں بہت کم مسلمانوں کے پاس اسلحے ہیں۔ جن کے پاس ہتھیاروں کے لائسنس تھے بھی، ان سب کی فہرست انھیں ان کے سرپرستوں نے مہیا کر دی تھی اور وہ ان گھروں میں داخل ہونے سے گریز بھی کر رہے تھے۔ تاکہ بلاوجہ کی کوئی دشواری کھڑی نہ ہو۔

ان کی امیدوں کے عین مطابق اس بم حادثے کے بعد بھی لوگ خاموش تھے، ملک و قوم کے یہ دشمن بھلے ہی قانون کی دستبرد سے محفوظ خوشیاں منا رہے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس خاموشی کے باوجود سارا شہر بھوپال بارود کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں غصے اور بے چینی کی آگ سلگ رہی تھی۔ ان کا

کی آمد کا انتظار تھا۔ پولیس ایس پی نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ٹھیک ساڑھے نو بجے وائرلیس پر انھیں اطلاع دی کہ اب وہ یہاں آسکتے ہیں۔ چنانچہ پندرہ بیس منٹ کے اندر سات کاروں کا ایک قافلہ وہاں پہنچا اور اس میں آنے والے مہمانوں کو پولیس کے جوانوں نے اپنے گھیرے میں لے کر اسٹیج تک پہنچا دیا۔

مشاعرے میں مزید تاخیر نہ ہو اس لیے فوراً ہی ناظم مشاعرہ نے مائک سنبھال لیا اور جناب صدر سے رسمی اجازت لے کر مشاعرے کے آغاز کا اعلان کیا۔ سامعین اپنے پسندیدہ شاعروں کا کلام سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اتنے بڑے مجمعے میں مکمل خاموشی تھی، جو بھوپال کی روایتی تہذیب کی عکاسی کر رہی تھی۔ پہلے کچھ مقامی شعرا کو دعوت کلام دی گئی اور انھوں نے ایک ایک کر کے اپنے منتخب کلام سے سامعین کو محظوظ کرنا شروع کیا۔ نوجوان اور مبتدی شاعروں کا دور ختم ہوا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اس کے بعد بیرونی شعرا اور شہر کے اساتذہ شعر و سخن کا نمبر آیا۔ ان شعرا کا سلسلہ کلام جاری تھا۔ قریب کے کسی گھنٹہ گھر سے رات کے بارہ بجنے کا اعلان ہوا۔ اب اسٹیج پر شہر کے معتبر شاعر ظفر صہبائی کو اپنا کلام پیش کرنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ وہ تمکنت کے ساتھ مائک پر تشریف لائے اور خود اعتمادی کے ساتھ مخصوص تحت اللفظ میں اپنی غزل شروع کی۔

اب آزادی سے ڈر لگنے لگا ہے
مجھے زنداں بھی گھر لگنے لگا ہے
فرات جاں لہو کی سرخیوں سے
شہادت کی خبر لگنے لگا ہے
غموں کا اب کوئی موسم نہیں ہے
یہ میلہ سال بھر لگنے لگا ہے

واہ واہ اور مکرر ارشاد کے شور کے درمیان ابھی شاعر اپنا تیسرا شعر دوبارہ پڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میدان کی پشت پر جنوب کی جانب، جہاں عمارت میں بڑے بڑے دروازے تھے ایک زوردار دھماکا ہوا اور ماحول میں بیک وقت ہزاروں چیخیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ مشاعرہ گاہ میں یکایک بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ بری طرح گھبرا گئے تھے۔ جس کے جدھر سینگ سما رہے تھے، بھاگ رہا تھا۔ پولیس نے فوراً اسٹیج پر موجود لوگوں کو اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا اور انھیں جلد از جلد کاروں پر بٹھا کر ان کے گھروں کو

اس کا انھیں اندازہ نہیں تھا۔ جو نام سامنے آئے تھے، ان میں سے اکثر ان کی توقع کے خلاف تھے۔ ان میں شہر کے کچھ معززین کے نام بھی تھے۔ حیران کن بات یہ بھی تھی کہ ان میں سے اکثر اب گھر گھر جا کر لوگوں سے امن برقرار رکھنے کی اپیلیں کر رہے تھے۔ ان خبروں کے ملنے سے حرکت البشر کی ترجیحات میں فرق پیدا ہوا تھا۔ اب وہ نئے حالات کی روشنی میں کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کرنا چاہتے تھے، جس کے دوررس نتائج مرتب ہو سکیں۔ جو ایک مثال بنے اور جس سے صرف بھوپال ہی نہیں، تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو تحفظ کی ضمانت مل سکے۔ اپنے ان منصوبوں میں وہ ان روادار غیر مسلموں کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے جو اس طرح کے پر تشدد کاموں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور جو اس بات میں ان کے ہم خیال تھے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔

اس کے علاوہ وہ اپنے تربیت یافتہ مجاہدین کا ایک دستہ بھی ترتیب دے رہے تھے جو اُن تمام لوگوں کو، جو کسی نہ کسی حیثیت سے اس سازش میں شریک تھے اور جن کے نام ان کے شعبہ تفتیش نے فراہم کیے تھے، قرار واقعی سزا دینے کا انتظام کرے۔ ان کے تنظیمی ضوابط میں ایسے لوگوں کے لیے بس ایک ہی سزا تھی۔ سزائے موت۔ عام حالات میں یہ کام ان کے لیے زیادہ دشوار نہیں ہوتا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ اصولی طور پر ان لوگوں کو نہیں چھیڑنا چاہتے تھے جو ہمہ وقت سرکاری محافظین کے سائے میں رہتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو سزا دینے کے لیے وہ صبر و سکون سے اس وقت کا انتظار کرتے تھے جب ان کے پاس یہ سہولت نہ رہے۔

ان دنوں شہر کے معمر مسلم بزرگوں کی مصروفیات معمول سے کچھ زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وہ کافی مسرور بھی نظر آ رہے تھے۔ ان کا خوابیدہ جوش و ولولہ جیسے ایک بار پھر عود کر آیا تھا۔ جیسے اس عمر میں ملک و قوم کی خدمت کرنے کا یہ خلاف امید موقع انھیں خدا کی نعمت کے طور پر ملا تھا۔ نئی نسل اور سرگرم عمل نوجوان پہلی بار ان کے زندگی بھر کے تجربات کو نہ صرف اہمیت دے رہے تھے بلکہ اس سے استفادے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ وہ خوش تھے کہ وہ مسلمانوں کے لیے کچھ کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ ان لوگوں کے ساتھ جو مسلمانوں کے تحفظ کے لیے کوشاں تھے، صدق دل سے تعاون کر رہے تھے۔ اس وقت پولیس کی ساری توجہ نوجوانوں پر مرکوز تھی۔ وہ تو بس زیادہ سے زیادہ مسلم نوجوانوں کو سلاخوں کے پیچھے پہنچانے میں مصروف تھے۔ ان کی نظر میں معمر لوگ بے ضرر تھے، اس لیے بزرگوں کی ان خفیہ

عین مشاعرے کے دوران ہونے والا یہ بم دھماکا اہل بھوپال کے لیے ایک بڑا چیلنج تھا۔ مشاعرے میں بیشتر مسلمان ہی ہوتے تھے۔ ظاہر ہے یہ کام جس نے بھی انجام دیا تھا، اس کا مقصد محض مسلمانوں کو ہلاک کر کے ان میں دہشت کا ماحول پیدا کرنا تھا اور وہ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ پولیس نے اپنے معمول کے مطابق تحقیقات شروع کی اور کچھ دنوں کے بعد اعلان کیا کہ اس بم دھماکے کے پیچھے غیر ملکی دہشت گردوں کا ہاتھ تھا، جنھیں کچھ مقامی لوگوں کا تعاون بھی حاصل تھا۔ ان کے مطابق واردات کو انجام دینے کا ان کا طریقہ کار جیش محمد سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے بعد بڑے پیمانے پر مسلم نوجوانوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دسیوں نوجوانوں کی گرفتاری عمل میں بھی آئی، جن سے پوچھ تاچھ کا عمل جاری تھا۔ مسلمانوں کی نظر میں پولیس کا یہ رویہ مشکوک ہی نہیں صریح طور پر غلط اور مسلم دشمنی پر مبنی تھا۔ ان کو پولیس کی کسی بات کا یقین نہیں تھا۔ وہ ان کے اس اعلان کو بھی مسلمانوں کو پسپا کرنے کی ایک سازش کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ وہ مشتعل ہو رہے تھے، ان کے اندر غصے کا لاوا بھی ابل رہا تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ غیر معمولی صبر و ضبط کا مظاہرہ بھی کر رہے تھے۔

حالات تو ایسے بنا ہی دیے گئے تھے کہ ایک بار پھر بھوپال میں خاک و خون کی ہولی کھیلی جاتی اور ہندو مسلمان ایک دوسرے کو کاٹ پھینکنے پر آمادہ ہو جاتے لیکن کم از کم اس زاویے سے ان دہشت گردوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ شہر کے لوگوں، خصوصاً مسلمانوں نے خلاف توقع غیر معمولی صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے لیے شہر کے سرکردہ لوگوں نے پہل کی اور بڑے پیمانے پر لوگوں کو صبر و ضبط کی تلقین کرتے ہوئے سمجھانے بجھانے کا کام کیا۔ ان سمجھانے والوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، سکھ بھی تھے اور عیسائی بھی۔ سب نے بہ یک آواز مل کر اس طرح کی دہشت گردانہ حرکتوں کی کھلے الفاظ میں مذمت کی اور عہد کیا کہ وہ آئندہ اپنے اس شہر میں ایسی کوئی حرکت کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ فوری طور پر یہ ڈرے سہمے لوگ خاموش بھی ہو گئے لیکن ان کے اندر کہیں گہرائی میں غصہ موجود تھا، جو ابھی باہر نکلنے کا راستہ تلاش نہیں کر پا رہا تھا۔

اڑتیس

اقبال میدان میں ہونے والے بم دھماکوں کو اب دو ہفتے سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ پولیس

ناشتہ، چائے فراہم کرنے کا سارا انتظام بھی انھوں نے سنبھال رکھا تھا۔ ان تمام ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ ہی وہ مذاکرے میں حصہ بھی لے رہے تھے۔ جب جب ان سے کچھ پوچھا جاتا تھا مناسب جواب بھی دیتے جاتے تھے۔ ان بزرگوں کی سربراہی کی تمام ذمے داری کسی اور نے نہیں خود ضرغام حیدر نے سنبھال رکھی تھی، جو اب حرکت البشر کے آزمودہ کار سربرآوردہ اکابرین میں سے ایک تھا اور جسے مسعود خاں نے خصوصی درخواست کر کے یہاں آنے کی زحمت دی تھی تا کہ وہ یہاں آ کر تذبذب اور کشمکش میں مبتلا مسلمانوں کی مناسب رہنمائی کریں۔

پولیس نے بھلے ہی ان بزرگوں کی سرگرمیوں پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی لیکن ان کے گھر والے ضرور حیران ہو رہے تھے۔ انھیں لگ رہا تھا کہ دن بھر بستر پر پڑے رہنے والے ان بزرگوں کو اچانک کیا ہو گیا ہے کہ اکثر شام میں دو چار گھنٹوں کے لیے گھر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی اپنی مروتوں اور تہذیبوں کے دائرے میں رہ کر خاموش تھے۔ زیادہ تر گھروں میں لوگ یہ کہہ کر خود کو تسلی دے رہے تھے کہ چلو اس بہانے یہ لوگ بھی کچھ تفریح کر رہے ہیں۔ پھر چونکہ یہ انفرادی طور پر ہر گھر کا معاملہ تھا اور انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ کچھ دوسرے بزرگ بھی اسی طرح گھر سے دور رہنے لگے ہیں اس لیے انھیں اس کی زیادہ فکر بھی نہیں ہوئی۔ ورنہ شاید یہ اجتماعی عمل ان کی فکر مندی کا باعث بن جاتا۔ البتہ کچھ گھروں میں یہ ضرور ہو رہا تھا کہ بچوں نے باتوں باتوں میں ان سے یہ جاننا چاہا کہ آخر وہ جاتے کہاں ہیں لیکن انھوں نے اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ بس یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے کہ انھیں کچھ ضروری کام نبٹانے ہیں، اسی میں مصروف ہیں۔ بچے ان کے جواب سے مطمئن تھے۔ کیونکہ اس سے زیادہ انھیں ان بزرگوں کی فکر تھی بھی نہیں۔ رفتہ رفتہ دو چار دنوں میں یہ بات محلے کے لوگوں کو بھی محسوس ہونے لگی اور انھوں نے بھی ان سے کچھ پوچھنا چاہا۔ لیکن ان بزرگوں کا وہی جواب یہاں بھی تھا۔ یا پھر وہ ان کی باتوں کو ہنس کر ٹال جاتے یا کہہ دیتے تھے کہ وقت آنے پر تمھیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ان میں سے کسی کو اتنی فکر نہیں تھی کہ ان کی آمد و رفت پر کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کرتا یا ان کی کھوج خبر میں ان کا تعاقب کرتا۔

بم دھماکوں کی باتیں شہر کے مختلف حصوں میں اب بھی گرما گرم گفتگو کا موضوع تھیں۔ لوگ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جلد ہی اس موضوع پر آ جاتے اور اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنے لگتے تھے۔ کہیں اس گفتگو کا انداز چہ می گوئیوں جیسا ہوتا اور کہیں تبادلہ خیال جیسا اور کہیں جارحانہ۔ لیکن شہر میں

غصہ کب اور کس شکل میں باہر نکلے گا، اس کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔ حالانکہ پولیس کے ہمارادہ شہر کے چپے چپے میں امن و امان قائم کرنے والی مختلف کمیٹیوں کے اراکین بھی سرگرم عمل تھے اور لوگوں کا غصہ کم کرنے اور انھیں تسلی تشفی دینے کی کوششیں کر رہے تھے۔ لوگ ان کی باتیں تو غور سے سن رہے تھے لیکن کسی طرح کے ردعمل کے اظہار سے گریز کرتے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی ماورائی قوت ہے جو انھیں خاموش رکھے ہوئے ہے۔ اور حقیقت میں تھا بھی کچھ ایسا ہی۔ پچھلی دو تین راتوں میں کسی وقت تمام مسلم گھروں کو اپنے قریبی پڑوسی کے ذریعے ایک زبانی خفیہ پیغام موصول ہوا تھا، جس میں انھیں یقین دلایا گیا تھا کہ اللہ رب العزت نے دشمنوں سے مقابلے کا انتظام کر دیا ہے۔ ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ خدا پر بھروسا رکھیں۔ صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور مناسب وقت کا انتظار کریں۔ جلد ہی کچھ ایسی یقینی صورت حال ظہور میں آنے والی ہے جس سے مسلمانوں کے مسائل حل کرنے میں مدد ملے گی۔ انھیں کوئی بھی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جس سے ہمارے منصوبوں کی کامیابی مشکوک ہو جائے۔ انھیں باخبر کیا گیا تھا کہ آئندہ اقدام کا مناسب لائحہ عمل تیاری کے مراحل میں ہے اور جلد ہی مناسب وقت آنے پر انھیں اس کی اطلاع دے دی جائے گی۔ اس خفیہ پیغام میں ان سے یہ خصوصی درخواست بھی کی گئی تھی کہ وہ اس پیغام کے بارے میں کسی غیر کے سامنے زبان نہ کھولیں اور اسے اپنے معتبر مسلم پڑوسی تک بھی پہنچا دیں۔ کیونکہ اسی میں ہمارا تحفظ اور ہمارے منصوبوں کی کامیابی کا انحصار ہے۔

حرکت البشر کے مجاہدین بھی شہر کی نبض ٹٹول رہے تھے۔ انھوں نے دوسرے شہروں سے بھی بڑی تعداد میں اپنے معاونین کو طلب کر لیا تھا، جو شہر کے الگ الگ مقامات پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ کچھ کا قیام ہوٹلوں میں تھا تو کچھ مختلف لوگوں کے گھروں میں قیام پذیر تھے۔ یہ سارا سارا دن شہر بھر میں پھیل کر ضروری معلومات یکجا کر رہے تھے۔ اور انھیں بڑی چونکا دینے والی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ انھیں یہ خبر بھی مل چکی تھی کہ بم دھماکے میں جو لوگ ملوث تھے ان میں ایک سابق وزیر بھی ہے۔ اور اس کام کے لیے جس شخص کا استعمال کیا گیا تھا وہ ایک پیشہ ور جیب کترا ہے، جسے ایک موٹی رقم دے کر یہ کام کرایا گیا تھا۔ انھیں اس بات کی تمام تفصیلات بھی مل گئی تھیں کہ اس سازش کے پیچھے کن کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔ اپنی تفتیش کے ان خلاف توقع نتائج پر وہ حیرت زدہ تھے۔ وہ پولیس کے رویے پر بھی انگشت بدنداں تھے کہ وہ کس طرح واضح طور پر مسلم دشمنی کا ثبوت دے رہی تھی۔ یہ سب کچھ اتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا ہوگا،

آخر مسلمانوں کے ارادے کیا ہیں۔

مخالفین میں مسلمانوں کے اس طرح شہر چھوڑ دینے پر الگ الگ طرح کے ردعمل سامنے آرہے تھے۔ کہیں اس بات پر خوشی منائی جارہی تھی۔ کہیں یہ تبصرے ہو رہے تھے کہ جس طرح آج مسلمان شہر چھوڑ رہے ہیں، اسی طرح ایک دن یہ ہندوستان بھی چھوڑ دیں گے۔ وہ مسلمانوں کے اس عمل کو ان کی بزدلی کا ایک اور نمونہ تسلیم کر رہے تھے۔ فرقہ پرستوں نے وقت ضائع کیے بغیر سماج دشمن عناصر کے ساتھ مل کر مفرور مسلمانوں کے گھروں کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن پولیس اس بار مستعد تھی۔ جو ہو رہا تھا، انتظامیہ کے لیے ناقابل فہم تھا، اس لیے وہ لوٹ مار جیسی وارداتوں کو انجام دینے والوں سے سختی سے نبٹ رہی تھی۔ جب تک صورت حال واضح نہ ہو جائے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی مشکلات میں اضافہ کرنے کو کوئی نیا محاذ کھلے۔ چنانچہ مسلمانوں کے گھروں کی حفاظت کی اضافی ذمے داری بھی پولیس کے سر آگئی تھی۔ ان کے افسران اعلیٰ کا حکم تھا کہ ان گھروں میں سے اگر ایک کیل بھی کم ہوئی تو متعلقہ جوانوں کو معطل کر کے سخت سزائیں دی جائیں گی۔

اس صورت حال کو سمجھنے میں لوگوں کو ایک ہفتے سے زاید کا وقت لگا۔ رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کا جذبہ ایمانی جوش پر تھا۔ ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ فرائض کی ادائیگی میں اپنے گھروں سے دور رہنے کے سبب انھیں کوئی پریشانی ہو رہی ہے۔ اس نو آباد بستی میں، جو بنجر پڑی زمینوں پر بسائی گئی تھی، خاصی چہل پہل تھی۔ شہر سے دور جنگل کے اس ویرانے میں تاحد نظر مسلمان ہی مسلمان نظر آرہے تھے۔ عارضی طور پر یہاں دکانیں بھی کھل گئی تھیں، جہاں ضرورت کا سارا سامان دستیاب تھا۔ یہ سارے دکاندار بھی مسلمان ہی تھے۔ اس دوران شہر میں یکے بعد دیگرے سات قتل ہوئے، جن کے قاتلوں کا سراغ پانے میں پولیس ناکام رہی۔

انتظامیہ کو اب یہ سمجھ میں آگیا تھا کہ مسلمانوں نے احتجاج کا یہ نایاب طریقہ نکالا ہے۔ پہلے تو انھوں نے اپنے مزاج کے عین مطابق اس کا مذاق اڑایا لیکن جلد ہی ان کو صورت حال کی نزاکت اور سنجیدگی کا احساس ہو گیا۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر صرف شہر کے تمام لوگوں تک ہی نہیں بلکہ اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی کی مدد سے سارے ہندوستان میں پھیل گئی تھی۔ یہاں جگہ جگہ مختلف ٹی وی چینلوں کے عارضی مراکز بھی قائم ہو گئے تھے۔ جو یہاں پر لمحہ بہ لمحہ رونما ہونے والے واقعات کو متواتر

سرگرمیوں پر ان کی نظر نہیں گئی اور اس طرح ان کی باہمی ملاقاتوں کے یہ سلسلے بے روک ٹوک جاری تھے۔ان کی نشستیں پابندی سے ہو رہی تھیں۔ ان نشستوں میں شہر کے تقریباً ہر حصے کے بزرگ نمائندے، خواہ اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد کم ہو یا زیادہ، موجود رہتے تھے۔ان میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ شامل تھے۔ ان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ بزرگ بھی تھے اور عام مسلمان بھی۔ان بزرگوں کو منظم کرنے کا کام ایک دن میں نہیں ہوا تھا۔ اس کے لیے حرکت البشر کے مجاہدین یہاں پچھلے کئی برسوں سے کوشاں تھے۔حرکت البشر کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ نوجوانوں کے مقابلے معمر لوگوں کو منظم کرنا زیادہ آسان ہے۔ان کا یہ اندازہ بھی اب برگ و بار لانے لگا تھا کہ یہی بزرگ جب اپنے اپنے طور پر نوجوانوں کو سمجھانے کی کوشش کریں گے تو اس کے اثرات کا دائرہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع ہوگا کہ کوئی تنظیم ان سے براہ راست رابطہ قائم کر کے انھیں بدلنے یا منظم کرنے کی کوشش کرے۔

بزرگوں کے لیے منعقد ہونے والی یہ ساری نشستیں شہر کے مختلف حصوں میں جگہیں بدل بدل کر ہو رہی تھیں۔سب لوگ اپنی اپنی سہولت کے مطابق الگ الگ مقررہ مقام تک پہنچ جاتے تھے۔اس لیے کسی کو کسی خاص بات کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔آمد و رفت کے سارے اخراجات کی ذمے داری حرکت البشر نے اپنے سر لے رکھی تھی، تا کہ محض اس بنیاد پر کہیں کوئی بزرگ ان نشستوں میں شریک ہونے سے رہ نہ جائے۔

ان نشستوں میں ہر شخص سے باری باری تجاویز طلب کی جا رہی تھیں۔سوال ایک ہی ہوتا تھا کہ ان کے خیال میں ایسے حالات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ لوگ اپنی اپنی صلاحیت، اپنے اپنے تجربے اور اپنی اپنی فہم و دانش کی بنیاد پر اس سوال کا جواب دے رہے تھے۔انھیں تاکید کی گئی تھی کہ وہ اپنے ذہن میں آنے والی کوئی بھی بات، خواہ ان کی نظر میں وہ کتنی ہی چھوٹی اور معمولی کیوں نہ ہو، کہنے میں تکلف سے کام نہ لیں۔اس کی سخت ممانعت تھی کہ کوئی کسی شخص کی کسی بھی تجویز کا مذاق اڑائے۔چنانچہ ہر شخص بے خطر اور بے جھجک بول رہا تھا۔اس کے حیرت انگیز نتائج بھی سامنے آ رہے تھے۔جہانگیر آباد کے بدرالدین خاں عرف بنے خاں بھوپالی بھی ان بزرگوں میں شامل تھے۔ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اُن کو اُن کی تمام زندگی کی نیکیوں اور دعاؤں کا صلہ مل گیا تھا۔وہ نشست کے دوران نہایت انہماک سے لوگوں کی ضروریات کی تکمیل میں مصروف رہتے تھے۔ان کے ہاتھ میں مسلسل پانی کا جگ اور گلاس رہتا تھا۔ادھر کسی کو پیاس لگی ادھر بنے خاں لپک کر پہنچے۔اس کار ثواب میں انھیں کسی دوسرے کی شرکت بھی گوارا نہ تھی۔اس کے علاوہ

تسلسل سے ان کی نمائندگی کو یقینی بنایا جائے اور یہ نمائندگی عہدوں کی ہر سطح پر ہو۔سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے کے عمل میں مذہبی تعصب کو ختم کرنے کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں تاکہ متعصب لوگ اپنی من مانی کر کے مسلمانوں کی حق تلفی نہ کر سکیں۔

۶۔مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی کو دور کرنے اور ان میں اعتماد کی بحالی کے لیے ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کیا جائے۔

۷۔مسلم اداروں اور تنظیموں کو محض شک کی بنیاد پر بدنام کرنے کی شعوری روش کو لگام لگائی جائے اور ایسے لوگوں کو مناسب سزا دی جائے۔ان اداروں اور تنظیموں پر شک کی بنیاد پر کوئی ایسی کارروائی نہ کی جائے، جو ان کی نیک نامی، وقار اور خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچائے۔

۸۔آئین میں ترمیم کر کے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ اگر کوئی مذہبی گروہ کسی دوسرے مذہب یا مذہبی گروہ پر کوئی منفی تبصرہ کرتا ہے تو وہ قابل دست اندازی پولیس جرم قرار پائے گا۔

۹۔مذہبی اصلاحات کا حق صرف متعلقہ مذہبی گروہ کو حاصل ہو اور کوئی بیرونی شخص یا ادارہ اس میں دخل اندازی نہ کرے، اس کا مناسب نظم کیا جائے۔

۱۰۔مختلف مذہبی گروہوں کے آئینی حقوق کے تحفظ کے لیے ایک علاحدہ محکمہ قائم کیا جائے، جس میں متعلقہ مذہب کے لوگوں کی مناسب نمائندگی کا اہتمام ہو۔

یہ مطالبات اگرچہ عجیب وغریب اور ناقابل عمل نظر آرہے تھے، کیونکہ اس کے لیے آئین میں کچھ بنیادی ترمیمات کی ضرورت تھی۔لیکن مسلمان اپنے ان مطالبات سے سر مو پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔
یہ سارے مطالبات اس نو آباد بستی میں جگہ جگہ پوسٹروں کی شکل میں آویزاں تھے تا کہ ہر آنے جانے والے کی نظر ان پر پڑ سکے۔جب بھی حکومت کے ذمہ دار افراد یا میڈیا کے لوگ ان کے پاس آتے تو وہ اپنے انھی مطالبات کو دہراتے۔انھیں سن کر کچھ لوگ سنجیدہ ہو جاتے، کچھ مایوسی کے ساتھ

اتنے بڑے حادثے کے پیش نظر یہ عین فطری بھی تھا۔ لوگوں کو کچھ نہ کچھ باتیں تو کرنی ہی تھیں، سو کر رہے تھے۔ عام طور پر یہ دیکھنے میں آ رہا تھا کہ لوگ پولیس کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ فسادات کے بعد پولیس پر ویسے بھی ان کا اعتماد نہیں رہ گیا تھا لیکن اس حادثے کے بعد اب تو انھیں پولیس کے نام ہی سے چڑ ہونے لگی تھی۔ وہ انھیں اپنی گفتگو میں کھلے عام گالیوں سے نواز رہے تھے۔ کسی کو برا یا عجیب اس لیے نہیں لگ رہا تھا کہ یہ گالیاں تو بھوپال کی تہذیب کا ایک ناگزیر حصہ تھیں۔ سارا شہر یقین اور بے یقینی کی ایسی ہی صورت حال سے دو چار تھا۔

بالآخر مسلسل ہونے والی ان نشستوں کے نتائج برآمد ہوئے اور ایک ایسا لائحہ عمل ترتیب دیا گیا جس کو روبہ عمل لانے پر سب کا اتفاق رائے تھا۔ جو طے ہوا تھا وہ بے مثال تھا اور اب سے پہلے بھی کہیں بھی عمل میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے اس سے برآمد ہونے والے نتائج کو بھی یقینی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ البتہ اس لائحہ عمل کے تیار کرنے والوں کو اس کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ مسلسل تین دنوں تک لوگوں کو ان کے گھر جا جا کر زبانی طور پر یہ پیغام پہنچایا گیا کہ وہ مناسب تیاری کر لیں۔ اور ٹھیک ایک ماہ بعد یعنی ۲۷ر شعبان کی صبح تمام مسلمان، خواہ ان کا تعلق شہر کے کسی بھی حصے سے ہو، اپنے ضروری سامان کے ساتھ بہ آواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے رائسین روڈ پر واقع اس مقررہ مقام پر پہنچیں جہاں مسلمانوں کی ایک عارضی بستی بسانا مقصود تھا۔

مقررہ تین دنوں تک روزانہ سارے شہر میں ہنگامے جیسی کیفیت رہی۔ جیسے شہر کی سڑکوں پر انسانوں کا سمندر ابل پڑا ہو۔ بڑی تعداد میں مسلمان اپنے اپنے گھر چھوڑ رہے تھے۔ ان کے غیر مسلم پڑوسی حیران تھے کہ آخر اچانک انھیں ہو کیا گیا ہے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لیکن کوئی بھی ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان سب کی زبان گنگ ہو چکی ہو۔ یہ سب ہر سوال کے جواب میں بس کلمہ طیبہ کا ورد کر رہے تھے۔ شہر کی سڑکوں پر ایک جم غفیر تھا۔ بسوں، ٹرکوں اور کاروں کی مدد سے لوگوں کے قافلے اپنی منزل مقصود کی جانب رواں تھے۔ جن کے پاس وہاں جانے کا کوئی انتظام نہیں تھا وہ دوسروں سے مدد لے رہے تھے۔ اور دوسرے لوگ بخوشی ان کی مدد کو آگے آ رہے تھے۔ یہ سلسلہ تین دن جاری رہا۔ یکم رمضان تک یہاں پہنچنے والے مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ مسلمانوں کے اس خروج سے سارا شہر متفکر تھا۔ انتظامیہ الگ پریشان تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

اسلام آباد:(ھمارے نج سمواد داتادوارا) سیما پار سے پراپت سوچناؤں کے انوسار ھمارے پڑوسی دیش پاکستان کے مہانگر کراچی میں کل شام پانچ سے سوا پانچ بجے کے مدھیہ ایک کے بعد ایک پانچ بم دھماکے ھوے۔یہ سارے دھماکے ایک سپر بازار کے پاس ٹھیک اُس سمے ھوے جب یہاں لوگوں کی ایک بڑی سنکھیا روزانہ کی خریداری میں ویست تھی۔ دھماکے اتنے شکتی شالی تھے کہ نہ کیول آس پاس کی دکانوں اور وھاں اُپستھت ویکتیوں کے پرخچے اڑ گئے تھے، ورن سپر بازار کا تین تلے کا بھون بھی پوری طرح نشٹ ہو گیا۔ پراپت سماچاروں میں مرنے والوں کی سنکھیا دو سو سے بھی ادھک بتائی جا رھی ھے۔ابھی تک جن مرتکوں کی پہچان کی جاچکی ھے ان میں استھانیہ ناگرکوں کے اتی رکت امریکہ کے گیارہ، انگلینڈ کے پانچ، فرانس اور جرمنی کے دو دو اور سعودی عرب کا ایک پرینٹک بھی ھیں۔ دو بھارتیہ ناگر ک بھی اس درگھٹنا کا شکار ھوے ھیں، جو اپنے سگے سمبندھیوں سے ملنے کے لیے پاکستان گئے ھوے تھے۔ یہ بھی سوچنا ملی ھے کہ گھایلوں کی سنکھیا چار سو کے آس پاس ھے، جنھیں پاس کے سرکاری اسپتالوں میں بھرتی کرا دیا گیا ھے۔ گمبھیر روپ سے گھایل کچھ لوگوں کی حالت ابھی بھی چنتا جنک بنی ھوئی ھے، اس لیے مرنے والوں کی سنکھیا میں ابھی اور بھی بڑھوتری ھو سکتی ھے۔

بھارت کے پردھان منتری نے آتنک واد کی نندا کرتے ھوے پاکستان میں ھونے والی اس دربھاگیہ پورن گھٹنا کو آتنک وادیوں کی ھتاشا کا پرینام اوران کی کایرتا کاایک اور اُداھرن بتایا ھے۔انھوں نے پاکستان کے راشٹر پتی اور پردھان منتری سے فون پر سمویدنا ویکت کرتے ھوے انھیں اس گھٹنا پر اپنی اور سمست بھارت واسیوں کی چنتا اور دکھ سے اوگت کرادیاھے، اور اس دربھاگیہ پورن اور بھیاوہ سمے میں پاکستان کو بھارت کے پورن

ٹیلی کاسٹ کر رہے تھے۔ پولیس افسران نے پہلے تو مسلمانوں کو اپنے طور پر منانے پھسلانے کی کارروائی شروع کی، لیکن جب اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو مقامی سطح پر بااختیار رہنماؤں اور وزیروں کو ان مسلمانوں کی سدھ آئی۔ ایک کے بعد ایک وہ آ رہے تھے، مسلمانوں کے نمائندوں اور ذمے داروں سے مل رہے تھے۔ ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ان سے طرح طرح کے وعدے کر رہے تھے۔ لیکن مسلمان اب ان وعدوں سے بہلنے والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہ سارے لوگ ان سے درخواست کر رہے تھے کہ وہ واپس اپنے گھروں کو لوٹ جائیں، وہ وعدہ کرتے ہیں کہ ان کے مطالبات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔ لیکن مسلمان مصر تھے کہ جب تک ان کی تمام شرطیں رو بہ عمل نہ آئیں گی وہ اسی طرح یہاں رہیں گے۔

مسلمانوں کے مطالبات بھی عجیب وغریب تھے۔

۱۔ سارے ملک میں فرقہ پرست تنظیموں پر دائمی طور پر پابندی عاید کی جائے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سے سخت سزائیں دی جائیں۔

۲۔ چونکہ آئین کی رو سے مسلمان مساوی طور پر ہندوستان کے شہری ہیں،اس لیے ان سے تفریق کا سلوک کرنے والوں اوراس تفریق کو ہوا دینے والوں کو دہشت گرد قرار دیا جائے۔

۳۔ مسلمانوں کو ہندوستان کا شہری تسلیم نہ کرنے والوں، ان کے آئینی حقوق سلب کرنے کی کوشش کرنے والوں اورانھیں غدار وطن کہنے والوں کو ملک کا غدار سمجھا جائے، اور اسی اعتبار سے انھیں سزا دی جائے۔

۴۔ دہشت گردی، فرقہ پرستی اور انتہاپسندی کی مناسب تعریف وضع کی جائے، جس سے ان کے باہمی فرق کو سمجھنے میں کسی کو کوئی مغالطہ نہ ہو اور اسے آئین میں درج کرنے کا اہتمام کیا جائے۔تاکہ مجاہدین اسلام اور وفاداران ملک و ملت کو شبہ کی نظر سے نہ دیکھا جا سکے۔

۵۔ پولیس فورس اور مسلح افواج اور انتظامیہ میں مسلمانوں کو آبادی کے

شہر کے مختلف حصوں میں بھی چسپاں کرایا تھا۔

کُل ہِتی کے اس فیصلے سے کچھ اساتذہ خوش نہیں تھے۔ وہ اس فیصلے کو ان کی ناتجربہ کاری کی دلیل سمجھ رہے تھے۔ چونکہ وہ اس سلسلے میں کچھ کر نہیں سکتے تھے، اس لیے خاموش رہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نے تو الیکشن کے دوران باقاعدہ چھٹی لے کر باہر چلے جانا مناسب سمجھا تھا۔ شہر میں بھی سنسنی کا ماحول بن گیا تھا۔ لوگوں کو وہ دن اب بھی یاد تھے جب گیارہ برس پہلے یہاں ہونے والے الیکشن کے موقعے پر فسادات بھڑک اٹھے تھے، جس میں دس بارہ لوگوں کی جانیں چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد دو مہینوں تک شہر میں کرفیو کا راج رہا تھا، جس سے عام لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ وہ ڈر رہے تھے کہ کہیں پھر ویسا ہی ماحول نہ بن جائے جو ان کی معمول کی زندگی اور کاروبار دونوں کے لیے مصیبت ثابت ہو۔

اسٹوڈنٹس یونین کے صدر کے عہدے کے لیے یوں تو چار امیدوار میدان میں تھے لیکن اصل مقابلہ اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد کے آنند مہتا اور نیشنل اسٹوڈنٹس یونین آف انڈیا کے اقبال خاں پٹھان کے درمیان تھا۔ دونوں ہی گریجویشن کے آخری سال میں تھے۔ اقبال پٹھان اس الیکشن میں واحد مسلم امیدوار تھا۔ حالانکہ کچھ تجربہ کار سینئر طالب علموں نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ الیکشن میں حصہ نہ لے لیکن اس نے یہ بزدلانہ مشورہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ صدر کے علاوہ نائب صدر اور سکریٹری کے لیے بھی مجموعی طور پر آٹھ امیدوار تھے، جو اس الیکشن میں اپنی اپنی قسمت آزما رہے تھے۔ ودیاپیٹھ کے کُل ہِتی نے پانچ سینئر اساتذہ کی ایک بااختیار کمیٹی تشکیل دی تھی جو الیکشن کی جملہ سرگرمیوں پر نظر رکھنے اور طالب علموں کی شکایات رفع کرنے اور چھوٹے بڑے تنازعات کو سلجھانے کی مجاز تھی۔ ان کی ذمے داریوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ انتخابات امن و آشتی کے ماحول میں غیر جانب داری اور ایمان داری کے ساتھ پورے ہوں۔ اس تعلق سے ودیاپیٹھ کے اندر جو سرگرمیاں جاری تھیں وہ گذشتہ انتخابات سے مختلف نہیں تھیں۔ سارے کیمپس کو پوسٹروں سے پاٹ دیا گیا تھا۔ دن بھر لاؤڈ اسپیکر سے فلمی گانے اور امیدواروں کی تعریف میں تقریریں نشر کی جا رہی تھیں۔ طالب علموں کے پاس خود امیدوار پہنچ رہے تھے اور ان سے اپنے حق میں ووٹ دینے کی درخواست کر رہے تھے۔ ہلکی پھلکی جھڑپیں بھی ہو رہی تھیں، ایک دوسرے کو دھمکیاں دینے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ لیکن جو پہلے نہیں ہوتا تھا

واپس لوٹتے اور کچھ لوگ ان کو ناقابل عمل قرار دے کر ان کا کھلے عام مذاق اڑاتے۔ سرکاری نمائندگان اور مسلمان لیڈروں کے درمیان کئی دور کی گفتگو ہوئی لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ ان سب کا یہ کہنا تھا کہ ان میں سے بیشتر مطالبات ان کے حد اختیار سے باہر ہیں، اس لیے وہ انھیں پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس طرح یہ معاملہ کئی دنوں تک یوں ہی جھولتا رہا۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ تمام دشواریوں کو جھیلتے ہوئے اس بستی کے تمام لوگ اطمینان سے روزے رکھ رہے تھے، جماعت سے نمازیں پڑھ رہے تھے۔ عارضی دکانوں میں افطار و سحری کا سارا سامان دستیاب تھا۔ تراویح کا بھی اہتمام کیا گیا تھا، جس میں یہاں آباد مسلمانوں کی کثیر تعداد شرکت کرتی تھی۔ دوسری طرف انتظامیہ کی نیندیں حرام تھیں۔ مسلمانوں کی خاموشی اور ان کے احتجاج کا یہ نادر انداز انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دے رہا تھا۔ انھیں لگ رہا تھا کہ اس معاملے میں تاخیر سے خطرات اور بھی بڑھتے جارہے ہیں۔ کوئی انہونی نہ ہو اس کے لیے وہ مناسب طور پر تیار تھے، لیکن ان لوگوں کا اگلا اقدام کیا ہوسکتا ہے اس کے بارے میں وہ کوئی بھی اندازہ لگانے سے قاصر تھے۔

بالآخر نوبت یہاں تک آپہنچی کہ اس حساس معاملے میں مرکز کو بھی مداخلت کرنی پڑی۔ مرکزی وزیر داخلہ بھوپال آئے اور مسلم رہنماؤں سے ملاقات کی۔ ان کی اس مداخلت کے بعد مسلمانوں کے بیشتر مطالبات من وعن تسلیم کر لیے گئے۔ فرقہ پرست تنظیموں پر دائمی پابندی عائد کرنے کے لیے فوری طور پر آرڈیننس جاری کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ دیگر مطالبات، جن کا تعلق آئین کی ترمیم سے تھا، پارلیمنٹ کے اگلے اجلاس میں پیش کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی۔ معاہدے کا مسودہ تیار کیا گیا اور اس میں متعلقہ لوگوں کے دستخط ہوئے۔ مقامی لیڈروں نے ان وعدوں کے ایفا کی ضمانتیں دیں تو مسلمانوں نے اپنا یہ عدیم المثال احتجاج واپس لے لیا اور جلد ہی اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹنے کا وعدہ کیا۔

اس احتجاج کے دوران مسلمانوں کو پریس اور میڈیا کا بھرپور تعاون ملا۔ یہ احتجاج ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا احتجاج تھا جس میں اتنے بڑے پیمانے پر لوگوں نے شرکت کی تھی اور جسے خاطر خواہ کامیابی بھی ملی۔

اٹھتالیس

آگر معزز مقرر کی منشا یہ ھے کہ تمام مسلمانوں کو
ھندو ھو جانا چاھیے تو یہ ان کی ناتجربہ کاری اور خام خیالی ھے۔
ان کا یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ھو پائے گاکیونکہ تمام
مسلمان اپنے مذھب اور عقائدپر پختگی کے ساتھ ایمان رکھتے ھیں
اور اس کے تحفظ کے لیے وہ اپنی جان کی بازی لگا دیں گے۔ اوربد
قسمتی سے اگر ایسا ھواتو ھندوستان ایک طویل خانہ جنگی میں
مبتلا ھو جائے گا۔

بس یہیں سے جلسے کا رنگ بدلنا شروع ہوگیا تھا۔ ابھی اس شخص نے اتنا ہی کہا تھا کہ' پکڑو، پکڑو..... مارو سالے کو..... پکڑ کر مارو.....' جیسی صدائیں بلند ہونے لگی تھیں۔ لیکن محلّہ چونکہ مسلمانوں کا تھا، اس لیے آگے بڑھ کر اس شخص کو پکڑنے کی ہمت کسی میں نہیں ہوئی اور وہ نہایت اطمینان اور خاموشی سے اسٹیج سے نیچے اترا اور جلسہ گاہ سے باہر نکل گیا۔

اس شخص کے چلے جانے کے بعد مقرر کو اور بھی جوش آ گیا۔ اس نے نیشنل اسٹوڈنٹس یونین آف انڈیا کے امیدوار اقبال پٹھان کو مشورہ دیا کہ اسے اپنی امیدواری سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ جب اس سے اس کی تسلی نہیں ہوئی تو اس نے تمام طالب علموں کو تنبیہ کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا کہ جو طالب علم مسلمان امیدوار کو ووٹ دے گا، اسے پاکستان کا حامی سمجھا جائے گا اور اسے کسی بھی طرح ودیا پیٹھ میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔

اس جلسے میں اقبال پٹھان کے حامی بھی موجود تھے۔ جیسے ہی انھوں نے یہ سنا، آنند مہتا کے خلاف مردہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بس تھوڑی ہی دیر میں زبردست قسم کا فساد ہونے والا ہے۔ غنیمت ہوا کہ پولیس نے مداخلت کی، لاٹھی چارج ہوا، لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے اور جلسہ درہم برہم ہوگیا، اور اس طرح شہر میں ایک بڑا حادثہ ہوتے ہوتے ٹل گیا۔

دوسرے دن اقبال پٹھان نے ودیا پیٹھ کی انتخابی کمیٹی کے سامنے حاضر ہو کر اپنی امیدواری واپس لینے کی درخواست پیش کی۔ جب اس سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو اس نے انھیں انتخابات کی صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ کیسیٹ بھی مہیا کر دیا جس میں آنند مہتا کی پوری تقریر محفوظ تھی۔ کمیٹی نے اسے سنا۔ امیدوار کی تقریر قابل اعتراض قرار دی گئی۔ کمیٹی نے اعتراف کیا

سہیوگ کا آشواسن دیاھے۔

اُدھر پاکستان کے وبھن سماچار پتروں نے سرکاری جانچ ایجنسیوں کے حوالے سے بتایا ھے کہ ان کے پاس اس بات کے نشچت پرمانڑ اپلبدھ ھیں کہ اس درگھٹنا کے پیچھے بھارتیہ آتنک وادیوں کا ھاتھ ھے۔یہ بھی سماچار ھے کہ پاکستان کے ودیش منتری نے بھارتیہ ھائی کمشنر سے مل کر اس گھٹنا پر اپنا ورودھ درج کرایا ھے اور بھارت سرکار سے مانگ کی ھے کہ وہ ان آتنک وادیوں کو سہایتا دینا بند کرے۔ انہوں نے کہا ھے کہ یدی بھوشیہ میں ایسی گھٹنائیں ھوتی رھیں تو یہ دونوں دیشوں کے پارسپرک سمبندھوں پر وپریت پربھاو ڈال سکتی ھیں۔

چالیس

ودیا پیٹھ میں الیکشن کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔

طالب علم انتخابات کرائے جانے کے اپنے مطالبات کے مان لیے جانے سے بے حد خوش تھے اور نہایت جوش وخروش سے اس الیکشن میں حصہ لینے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ نوبت کئی برسوں کے بعد آئی تھی۔ احمد آباد شہر میں فرقہ وارانہ صورت حال کے تشویش ناک ہو جانے اور بدامنی پھیلنے کے اندیشے سے یہاں پچھلے کئی برسوں سے ان انتخابات کو ٹال دیا جاتا تھا۔ طالب علم بھی ہر سیشن کی ابتدا میں کُل پتی سے اس کا مطالبہ کرتے کرتے اب تھک کر خاموش ہو گئے تھے۔ وقتاً فوقتاً کُل پتی بدلتے رہتے، لیکن طالب علموں کو ان کا یہ حق دینے کے لیے کوئی بھی آمادہ نہ ہوتا۔ گذشتہ برس جب یہاں نئے کُل پتی کا تقرر ہوا تو انھوں نے ودیا پیٹھ میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالتے وقت اپنی ترجیحات بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ وہ طالب علموں کے حقوق کو پامال نہیں ہونے دیں گے۔ اس مثبت اشارے سے طالب علم بے حد خوش ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے اس وعدے کو ایفا کرتے ہوئے اگلے ہی سیشن میں الیکشن کی اجازت دے دی تھی۔ ودیا پیٹھ کا ایک ایک گوشہ مظہر تھا کہ طالب علم اس اجازت سے کتنے خوش ہوئے تھے۔ انھوں نے کُل پتی کی تعریف وتوصیف میں پوسٹر چھپوائے تھے اور انھیں کیمپس کے علاوہ

اور اس طرح کی مسلم مخالف مہم چلائے جانے کی ایک طویل تاریخ رکھتے تھے۔

دہشت گردی اب ہندوستان کے لیے ایک تلخ حقیقت اور ایک بڑا اور حساس مسئلہ بن چکی تھی۔ اس کا کوئی ایسا حل ارباب حل وعقد کی سمجھ میں نہیں آ تا تھا، جس کی مدد سے اسے ہمیشہ کے لیے ختم کیا جا سکے۔ دراصل ان کے سوچنے کا زاویہ ہی درست نہیں تھا۔ وہ ان تمام دہشت گردوں کو صرف ایک مجرم کی حیثیت سے دیکھتے تھے اور ان کے گرفتار ہونے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دے کر سمجھتے تھے کہ انھوں نے دہشت گردی کا قلع قمع کر دیا ہے۔ جب کہ اس طریق کار سے اس بیماری کے کم ہونے کے بجائے بڑھنے کا امکان زیادہ رہتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ تمام جرائم کی طرح دہشت گردی کو بھی جبر اور سختی سے کچلا جا سکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ دہشت گردی سے بچنے کے لیے وہی راستے اختیار کیے جا سکتے ہیں، جو عام جرائم سے بچنے کے ہوتے ہیں۔ یہ انداز فکر درست نہیں تھا۔ اتنے بڑے ملک میں کب اور کہاں کون کیا کر رہا ہے، اس کا علم حاصل کرنے کا کوئی صد فی صد کامیاب طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ حفاظت کہیں کی کرتے ہیں، واقعہ کہیں اور ہو جاتا ہے۔

دراصل دہشت گردی اور اس سے نبرد آزمائی کا یہ مہمل طریق کار مغرب کا اختراع کیا ہوا ایک حسین مغالطہ تھا، ہماری اپنی فکر کا نتیجہ نہیں تھا۔ ہمارے لیے اس نکتے پر نئے سرے سے غور کرنا ضروری تھا کہ تمام دہشت گرد ایسے کام کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ ان کا مقصد غلط ہو یا صحیح، لیکن وہ اپنے طور پر اسے اتنا عظیم سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے خوشی سے اپنی جانوں کا زیاں بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ جان انسان کی سب سے قیمتی نعمت ہے۔ اگر کوئی خوشی سے اپنی جان دے رہا ہے تو ہمیں لازمی طور پر اس کے مقاصد کو سمجھنے اور ان کی اہمیت کا اندازہ کرنے کی جانب توجہ کرنی چاہیے۔ دنیا کی کوئی بھی چیز نہ تو انسانی جان کا متبادل بن سکتی ہے اور نہ اس سے زیادہ قیمتی ہو سکتی ہے۔ ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ حب الوطنی اور دہشت گردی میں بڑا باریک فرق ہے۔ ہمارے کئی قومی مجاہدین بھی، جن کے سامنے آج ہم احترام سے اپنا سر خم کرتے ہیں، ہمارے دشمنوں کی نظر میں بھی دہشت گرد رہ چکے ہیں۔ ممکن ہے دہشت گردوں کے مقاصد کی تکمیل اور ان کے مطالبات کو من وعن تسلیم کر لینا ملکی مفادات کے خلاف ہو، لیکن اس کا دائمی حل سخت کارروائیوں کے بجائے نرمی اور محبت ہی میں پوشیدہ ہے، خواہ نتائج برآمد ہونے میں وقت کتنا ہی صرف ہو۔ اس کے لیے متعلقہ لوگوں سے

وہ یہ تھا کہ ان کی سرگرمیوں کا دائرہ کیمپس کی حدود سے باہر نکل کر سارے شہر تک وسیع ہو گیا تھا۔ احمد آباد شہر کے مختلف علاقوں میں بھی جلسے اور جلوسوں کا بازار گرم تھا۔ ان جلسوں میں طالب علموں کی حمایت میں پختہ کار سیاست داں بھی شرکت کر رہے تھے۔ ان لیڈروں کی شمولیت سے ان جلسوں کے سامعین میں طالب علموں کے ساتھ ساتھ عام لوگ بھی اچھی خاصی تعداد میں شامل رہتے تھے۔ ان سرگرمیوں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اس الیکشن کا تعلق کسی مخصوص تعلیمی ادارے سے نہ ہو کر اسمبلی کے انتخابات سے ہے۔ جیسے جیسے الیکشن کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی، یہ تمام سرگرمیاں بھی اسی تناسب سے تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

شہر کے خان پور محلے میں، جہاں مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد تھی، اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد کا جلسہ ہو رہا تھا۔ ودیا پیٹھ کے بیشتر مسلم طالب علم اسی محلے کے رہنے والے تھے۔ صدارتی امیدوار آنند مہتا کی تقریر ہو رہی تھی، جس میں ایسے موضوعات بھی آ رہے تھے، جن کا تعلق طالب علموں کی سیاسیات سے بالکل نہیں تھا۔ وہ ہندوستان کی بگڑتی ہوئی فرقہ وارانہ صورت حال پر بول رہا تھا اور اس کا ذمے دار مسلمانوں کو قرار دے رہا تھا۔ یہ موضوع اس لیے نکل آیا تھا کہ ودیا پیٹھ میں الیکشن نہ ہونے کے اسباب بیان کرنے کے دوران اس کا ذکر آ گیا تھا۔ اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لیے وہ اپنا سارا زور بیان صرف کیے دے رہا تھا۔ حاضرین میں طالب علموں کی کثیر تعداد کے علاوہ آس پاس کے لوگ بھی تھے۔ مقرر کے ایک ایک جملے پر بھیڑ کے ایک مخصوص گوشے سے تو تالیوں کی گڑگڑاہٹ کی آوازیں اٹھ رہی تھی لیکن دوسرا حصہ بالکل خاموش تھا۔ مقرر کو یہ بات شاید اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ شاید اسی لیے اُس نے خاص طور پر اُس مخصوص حصے کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ دیا۔

> 'اب بھارت کے مسلمانوں کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ان کو یہاں کس طرح رہنا ہے. ہندو دھرم نرپیکش ہوتے ہیں، وہ کبھی کسی سے جھگڑا کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ ان کے آتتھیہ میں بھی کوئی کوتاہی نہیں برتیں گے. لیکن اس کے لیے مسلمانوں کو بھی کچھ کرنا ہوگا. بھائی چارا بنانے کے لیے انہیں ہندو سنسکرتی اپنانا ہوگی. انہیں اپنا رہن سہن ہندوؤں جیسا بنانا ہوگا'۔

یہ سنتے ہی جلسہ گاہ کے خاموش حصے سے ایک شخص کھڑا ہوا اور چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگا، لیکن اس کی آواز اسٹیج تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ چنانچہ وہ کودتا پھاندتا اسٹیج پر چڑھ گیا اور مائک پر آ کر بولنے لگا۔

بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ ہندوستان ان باتوں کو سمجھتا نہیں تھا۔ لیکن اپنی سیاسی مجبوریوں اور دوسری چند در چند وجوہ کی بنا پر اس کا بہ بانگ دہل اعلان نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ یہ بھی اس کی مجبوری تھی کہ جہاں تک ممکن ہو، وہ ملک دشمن سرگرمیوں کے سلسلے میں امریکہ کا نام نہ آنے دے۔ شاید اسے لگتا تھا کہ امریکہ کی یہ مصنوعی دوستی بھی، عارضی طور پر ہی سہی، بین الاقوامی سطح پر ملک کے مفاد میں ہے، اور وہ اسے دوستی کے مغالطے میں رکھ کر اپنے ان مفادات کی تکمیل کرسکتا تھا۔

امریکہ میں ان دنوں صیہونیت کے غلبے کا دور دورہ تھا۔ یہودی وہاں کے سیاسی کاروبار میں اس حد تک دخیل ہو چکے تھے کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بھی فیصلہ لینا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ خود امریکی بھی ان کی چیرہ دستیوں سے پریشان تھے۔ مسلم دشمنی یہودیوں کے خمیر میں شامل تھی۔ ہندوستان میں ایسی کئی سیاسی پارٹیاں تھیں جو مسلم دشمنی کے معاملے میں یہودیوں سے مکمل اتفاق رکھتی تھیں۔ ان کے دل امریکہ اور اس کے حلیف ممالک کی محبت سے سرشار تھے۔ چنانچہ کسی طرح کے دہشت گردانہ واقعے پر یہ جماعتیں امریکہ کے مفادات کے خلاف کوئی بیان دینے سے گریز کرتی تھیں۔ اور بہ فرض محال اگر کسی دوسرے نے اس کا نام لیا تو اسے بھی اپنے دشمنوں کی فہرست میں رکھ کر اسے سزا دینے کی تدابیر کرنے لگتی تھیں۔ ان کی زبان پر صرف ان ممالک کے نام آتے تھے، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

اکثر دہشت گرد بیرونی ممالک کی دریادلی سے فیض یاب ہو کر اور وہاں کے تربیتی مراکز سے فراغت کے بعد غیر قانونی طور پر ہندوستان میں داخل ہوتے رہتے تھے۔ اس دراندازی کے لیے کشمیر کے ہمالیائی سرحدی خطّے ان کے پسندیدہ راستے تھے۔، جہاں موسم کے شدائد کے سبب ہندوستان کے لیے اتنی مکمل نگرانی ممکن نہیں تھی کہ یہاں سے ہونے والی دراندازی کو صد فی صد روکا جا سکے۔ پھر چونکہ کشمیر خود ہندوستان کے لیے ایک بڑا مسئلہ بنا ہوا تھا اور یہاں کے باشندوں کی ایک کثیر تعداد نہ اپنے آپ کو ہندوستانی کہلانا پسند کرتی تھی اور نہ ہندوستان کو اچھی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ عام طور پر وہ خود کو گذشتہ کئی صدیوں سے غلام سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ پہلے چار پانچ سو سال مغلوں کے غلام رہے، پھر انگریزوں کے غلام ہوے اور اب ہندوستان کے غلام ہیں۔ ان

کہ اس تقریر سے شہر کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ انھوں نے فوراً کل ہند کو اس نئی صورت حال کی اطلاع دی اور سفارش کی کہ الیکشن ملتوی کر دیے جائیں۔ کل ہند کی صدارت میں ایک ہنگامی نشست ہوئی۔ اس کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس سال کے انتخابات ملتوی کر دیے گئے ہیں۔ اس فیصلے کے خلاف کچھ طالب علموں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا تو کچھ نے چین کی سانس لی۔ طالب علموں کی ہنگامہ آرائی جب قابو سے باہر ہونے لگی تو کیمپس میں پولیس بلالی گئی اور ودیا پیٹھ کو غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دیا گیا۔

اکتالیس

ادھر گذشتہ بیس پچیس برسوں کے دوران ہندوستان میں دہشت گردی کے واقعات میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ ان کی تعداد میں جیسے جیسے یہ اضافہ ہوا، مسلمانوں کو دہشت گرد اور اسلام کو تشدد پسند مذہب کی حیثیت سے دیکھنے کا رواج بھی اسی تناسب سے عام ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسلام کی رائج مثبت اصطلاحات کو بھی کم علمی، بے خبری یا بغض وعناد کے سبب اپنی ضرورت کے مطابق منفی معانی دے دیے گئے۔ اسلام کی ایسی متعدد اصطلاحیں تھیں جو اب عام طور پر اپنے اصل معانی سے دور چلی گئی تھیں۔ مثال کے طور پر فتویٰ، جو مستند علمائے دین کی طرف سے کسی خاص مسئلے سے متعلق شرعی احکام کی وضاحت کرنے والی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا اطلاق کسی بھی مسلم تنظیم یا مسلمان سیاست داں کے جاری کردہ بیان پر کیا جانے لگا۔ بلکہ عوام میں اسے کچھ اس طرح رائج کیا گیا جیسے اس کا مطلب غیر قانونی سزائے موت ہو۔ اسی طرح جہاد کا لفظ بھی بدنام ہوا۔ جہاد، جو اصلاً خدا کی خوشنودی کے لیے حق کی حمایت اور ناحق کی مخالفت میں جدوجہد کرنے اور وقت ضرورت اپنی جان تک قربان کر دینے کے قابل ستائش جذبے کا نام ہے، اب اسے دہشت گردی کا متبادل سمجھا جانے لگا۔ یہ معنوی تبدیلیاں فطری طور پر رونما نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے پس پشت ایک منظم سازش کارفرما تھی۔ سازش کرنے والے یہ لوگ ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی نت نئی منصوبہ سازی میں مصروف رہتے تھے۔ وہ یہ کام کرنا ضروری سمجھتے تھے، بھلے ہی اس کے لیے انھیں بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنی پڑے۔ ضرورت پڑنے پر وہ ان بیرونی ممالک کا تعاون لینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، جن کی اسلام دشمنی اظہر من الشمس تھی اور جو اپنے اپنے دائرہ اقتدار و اختیار میں مسلم کشی

دولوگوں کی ہلاکت کا سبب بھلے ہی بن گئے تھے لیکن یہاں کے ہندو مسلم اتحاد کو نقصان پہنچانا ان کے بس میں نہیں تھا۔ اب یہاں کے عوام ویسے رہے بھی نہیں تھے جیسے بیس پچیس سال پہلے ہوا کرتے تھے۔ اب انھیں وہشت گردوں کی منشا بھی اچھی طرح سمجھ میں آ چکی تھی اور اب وہ کسی بھی صورت میں ان کے منصوبوں کی کامیابی کے لیے حماقت کا ثبوت دینا نہیں چاہتے تھے۔ برسوں پہلے یہاں ایسی ہی واردات کرنے کی ایک کوشش وہ اور بھی کر چکے تھے، جو نامعلوم وجوہ کی بنا پر ناکام ہو گئی تھی۔ لیکن اب کی بار انھوں نے اپنے منصوبوں کی بھنک کسی کو نہیں لگنے دی تھی۔ اس بار سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ لوگ یکا یک بوکھلا گئے تھے۔ لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے جذبات پر قابو پالیا تھا۔

عبدالرحمن، جو اب باقاعدہ طور پر حرکت البشر کا رضا کار تھا، معمول کے مطابق اپنی گدی پر آرام سے بیٹھا اپنے کاروبار میں مصروف تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ دھڑا دھڑ سارا بازار بند ہو رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے اپنے پڑوسی پرویز حسن سے پوچھا۔ 'ای کا ماجرا ھے بھئی'۔

گدی بن کرو عبدالرحمن'۔ پرویز حسن نے جواب دیا۔ 'کا جانے کا ھووے والا ھے ای سھر میں'۔

'ھاں، تو ٹھیک کھے تو۔ ای بم دھماکہ اِتنا باری جرور کوئی گل کھلئیہے'۔ عبدالرحمن نے کہا۔ 'ای دھشت گرد لوگ آندھیر ھی مَچا رکھن ھیں۔ کوئی ان کا ھاتھ پکڑے والا نھی رہ گوا۔ جب سَھر میں ایسی واردات ھووے والی ھوتی تو نہ جانے سَارا حفاظتی بندوبست کھاں چلا جاتے'۔

'ای سب چھوڑو، ھمیں ھواں چل کے لوگ کی مدد کرنا چھیے۔ ای آتنک وادی لوگ یھی تَرے مناسب جواب دیا جا سکے تے کہ ھم ان کی مرجی کے مطابق رد عمل ظاھر نہ کریں'۔ پرویز حسن نے کہا۔

'تو چلو، ھم گھر سے ھوکے تھوڑی دیر میں ھویں پھنچیے تے'۔ عبدالرحمن نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

اس نے گھر جا کر کپڑے بدلے۔ کرتا لنگی اتار کر پینٹ شرٹ پہنی اور پیدل ہی موقع واردات کی جانب روانہ ہو گیا۔ کالی مندر کا فاصلہ وہاں سے زیادہ نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ وہاں

مذاکرات کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ تاکہ ان کے مقاصد کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے اور ان کی غلط ترجیحات اور نا قابل عمل عزائم نیز اور اپنی قومی و سیاسی مجبوریوں اور حدود سے انھیں روشناس کرانا ممکن ہو سکے۔ اگر افہام و تفہیم کا یہ سلسلہ جاری رہے تو اس کا امکان بہر حال رہتا ہے کہ لیکن نہ ایک روز اس کا کوئی ایسا حل ضرور نکل آئے گا جو دونوں فریقوں کے لیے قابل قبول ہوگا۔

ہندوستان میں سرگرم دہشت گردوں کو مختلف وجوہ کی بنا پر پاکستان، چین، لنکا، بنگلہ دیش، نیپال اور امریکہ جیسے کچھ ملکوں سے مالی اور دیگر وسائل کی امداد ملتی تھی۔ یہ وہ ممالک تھے جن کے نقطۂ نظر سے ایک متحد، مستحکم اور پر امن ہندوستان ان کے مفاد میں نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی کوشش رہتی تھی کہ یہاں ہمیشہ بد امنی، انتشار اور عدم استحکام کی فضا قائم رہے۔

ان ممالک میں امریکہ ایسا واحد ملک تھا جس کی حکمتِ عملی ہی یہ تھی کہ ساری دنیا میں مختلف طریقوں سے جنگ کا ماحول بنا رہے تاکہ اس کی اکلوتی صنعت، اسلحہ سازی کے لیے بازاروں میں کوئی کمی نہ آئے۔ چونکہ ہندوستان کا شمار دنیا کے بڑے بازاروں میں تھا اور دنیا بھر کے ترقی پذیر ملکوں میں اس کے معاشی ارتقا اور استحکام کی رفتار سب سے تیز تھی، اس لیے اس ملک پر اس کی مہربانیوں کا دائرہ بھی کافی وسیع ہو چلا تھا۔ مختلف اوقات میں اس کی مہربانی کے یہ مظاہرے ویت نام، پاکستان، لیبیا، سری لنکا، انڈونیشیا، کوریا، ایران، سوویت یونین، کویت، سعودی عرب، عراق اور افغانستان جیسے ممالک میں پہلے بھی دیکھے جا چکے تھے۔ اور وہ آج تک اس کی ان مہربانیوں کا خمیازہ بھگت رہے تھے۔ ایک وقت تھا جب وہ پاکستان کو صرف اس لیے فوجی امداد فراہم کرتا تھا کہ وہ ہندوستان کو چین سے نہ بیٹھنے دے۔ لیکن ادھر کچھ عرصے سے پاکستان اس کی نظروں سے گر گیا تھا۔ شاید اب پاکستان اس کے مفادات کا تحفظ اتنے بہتر طور پر نہیں کر سکتا تھا، جتنا کہ خود ہندوستان کر سکتا تھا۔ چنانچہ اب اس کی ساری توجہ ہندوستان کو اپنے شیشے میں اتارنے کی جانب تھی۔ پاکستان کی طرح ہندوستان بھی اس کے اسلحوں کا امکانی خریدار تو تھا ہی۔ اب اسے یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ ہندوستانی بازار اس کی اور اس کے حلیف ممالک کی دیگر مصنوعات کی کھپت کے لیے بھی کارآمد ہے۔ چنانچہ اس نے اب اس طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ لیکن یہ دوستی اس کے لیے محض اپنی تجارت کے فروغ کا ایک ذریعہ تھی۔ اس لیے ایک طرف وہ کئی معاملات میں ہندوستان کو تعاون دینے کا ڈھونگ کرتا تھا اور دوسری طرف اسے داخلی طور پر کمزور

مشکوک شخص کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔

اس واقعے کی خبر سننے کے بعد بنارس کے دال منڈی علاقے میں بھی تابڑ توڑ ساری دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ لوگ سڑکوں پر کھڑے ہو کر اس واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کپڑوں کے تاجر مولوی اظہار حسین اپنے پڑوسی، بساط خانے کے دکان دار سید سبط حسن سے کہہ رہے تھے۔ 'آخر مسلمانوں کی قربانیاں رنگ لانے لگیں۔ کافروں کو اللہ رب العزت قرار واقعی سزا دے رہا ہے'۔

'کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو مولانا۔ سوچ سمجھ کر بات کرو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ابھی دھر لیے جاؤ گے'۔ سبط حسن نے ادھر ادھر دیکھ کر گھبراتے ہوئے کہا۔ 'یہ وقت اس طرح کی باتیں کرنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ پھر انسانوں کی جانوں سے اس طرح کھلواڑ کرنے کی اجازت اسلام نہیں دیتا بھائی۔ یہ جہاد نہیں ہے، فساد ہے'۔

'آج کل کچھ زیادہ ہی حب الوطنی سوار ہو گئی ہے تمھارے اوپر سبط حسن۔ اس ملک نے خوف و دہشت کے سائے میں زندگی گذارنے کے علاوہ ہم مسلمانوں کو دیا ہی کیا ہے، جو اس طرح کی باتیں کرتے ہو۔ یہ کافر جب اور جہاں چاہتے ہیں ہمیں کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ہندوستان چھوڑ دو۔ کیوں چھوڑ دیں ہم ہندوستان۔ اور ایودھیا کی بابری مسجد کی شہادت کو اتنی جلدی بھول گئے کیا؟ دیکھا نہیں کس بے دردی سے ہماری اتنی قدیم عبادت گاہ کی بے حرمتی کی گئی وہاں۔ اس کے بعد سارے ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں جانے کتنے مسلمان شہید ہوئے تھے۔ اور گجرات کا واقعہ تو بالکل تازہ ہے'۔ اظہار حسین نے جرح کرتے ہوئے کہا۔ 'ہم تم بھول سکتے ہیں ان واقعات کو، لیکن اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ گناہ گاروں کو اسی دنیا میں سزا دیتا ہے'۔

'بھائی ہم اس طرح نہیں سوچتے۔ اپنے وطن سے محبت کیوں نہیں ہوگی ہمیں۔ ہندوستان ہمارا ملک ہے۔ اس میں بہت سی برائیاں ہو سکتی ہیں لیکن ان برائیوں کو دور کرنے کی ذمے داری ہماری ہی ہے۔ کوئی باہر سے نہیں آئے گا ٹھیک کرنے، اور دیر سویر ہم اسے ٹھیک بھی کر لیں گے'۔ سبط حسن نے کچھ خفا ہوتے ہوئے کہا۔ 'ہمارا جینا مرنا تو اب اسی ملک میں ہے۔ یہ ہمارا اپنا ملک ہے۔ جائیں گے کہاں یہاں سے'۔

نظریات۔ کے حامل کشمیری ایسے لوگوں کو یہ سمجھ کر پناہ دیتے تھے کہ شاید وہ کشمیر کو ایک خود مختار ریاست کی حیثیت دلانے میں مدد کریں گے۔ حالانکہ اسے بس ان کی معصومیت ہی کہا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ان دہشت گردوں کو ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد رہنے بسنے کے لیے مقامی امداد آسانی سے مل جایا کرتی تھی۔ یہاں کچھ دن آرام کرنے کے بعد وہ سارے ہندوستان میں پھیل جاتے تھے۔ ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے وہ کبھی کبھی کشمیر کے علاوہ نیپال کا راستہ بھی استعمال کرتے تھے، جہاں ہندوستان سے لگی اس کی سرحد پر حفاظت کا خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ یہاں کی کمزور اور غیر مستحکم حکومت ان پر دست اندازی کی ہمت نہیں کر پاتی تھی اور ہندوستان میں داخل ہونا ان کے لیے آسان ہو جاتا تھا۔

دیگر ممالک کے دہشت گرد عام طور پر ہندوستان کی سیاحت یا تعلیم حاصل کرنے کے بہانے آتے تھے اور کبھی بذات خود کوئی غلط کام انجام نہیں دیتے تھے۔ اس کے لیے وہ مقامی لوگوں کو استعمال کرتے تھے۔ غریب مقامی لوگ موٹی موٹی رقموں کی لالچ میں ان کے ہاتھوں کا کھلونا بن جاتے تھے اور ان کی مدد سے وہ اپنے خطرناک منصوبوں کو انجام دینے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ جب کبھی پولیس کی سراغ رسی اور تفتیش کے بعد پکڑ دھکڑ ہوتی تھی تو اصل لوگ گرفت میں آنے سے صاف بچ جاتے تھے۔ پولیس زیادہ سے زیادہ اس شخص کی گرفتاری کو اپنے فرائض کی تکمیل سمجھ لیتی تھی، جو اپنے ہاتھ سے اس کام کو انجام دینے میں ملوث ہوتا تھا۔ اسے عام طور پر اس دست غیر کی تلاش بے سود معلوم ہوتی تھی، جن کی سازش کے فریب میں وہ غریب پھنس گیا تھا۔ مقامی طور پر شمال میں کشمیر، مشرق میں آسام اور ملحقہ خطوں اور جنوب کے کچھ اضلاع کو دہشت گردی کے مراکز سمجھا جانے لگا تھا۔

بیالیس

آخر کار تمام احتیاطوں کے باوجود اس بار یہ دہشت گرد بنارس کے کالی مندر میں بم دھماکا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہاں کے امن پسند شہریوں نے ہندو مسلم اتحاد کا جو ماحول برسوں سے تیار کر رکھا ہے، وہ اسے چند منٹوں میں برباد کر دیں گے۔ لیکن یہ ان کی کوتاہ بینی تھی۔ بنارس میں کم از کم اس زاویے سے ان کی قسمت نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ یہاں وہ بم کا دھماکا کر کے

شہید نہ ہوتا بھئیل ہو۔ سنجو ل، سیدھے سے آپنے رستہ ناپ۔ ٹائم آئی ت ہنتھوں حساب کتاب برابر کرے جانی لا۔ دھن راج نے غصے میں کھولتے ہوئے کہا۔

سارے شہر میں کچھ اسی طرح کی متضاد باتیں ہو رہی تھیں لیکن یہ صرف باتیں ہی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا لوگوں کا غصہ سرد ہوتا گیا۔ دہشت گردوں نے جو کچھ سوچا تھا ویسا کچھ نہیں ہوا۔ سارے شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر امن و امان برقرار رکھنے کے لیے تحریک چلائی جو حیرت انگیز طور پر کامیاب رہی۔ سارے ہندوستان کے پریس نے بنارس کے لوگوں کے صبر و تحمل کو کھلے دل سے سراہا۔ انھوں نے اس عمل کو ملک کے دوسرے حصوں کے لیے بھی قابلِ تقلید قرار دیا۔

دوسری طرف پولیس پریشان تھی۔ اس واردات کے بارے میں اسے ابھی تک کوئی ایسا سراغ نہیں ملا تھا جو مجرموں تک رہنمائی کر سکتا۔ حراست میں لیا گیا بھکاری جتنا جانتا تھا بتا چکا تھا۔ اسے دہشت گردوں نے کچھ رقم دے کر یہاں بیٹھے بیٹھے حالات پر نظر رکھنے کو کہا تھا اور دوسرے دن آ کر وہ اسے اتنی ہی رقم اور دینے والے تھے۔ پولیس نے اس بھکاری کو دوسرے دن وہاں بٹھا کر ان کا انتظار بھی کیا جو بے سود رہا۔ عوام کے روز افزوں مطالبات اور اعلیٰ حکام کے اصرار الگ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی فہرست سے کچھ مسلمانوں کے نام منتخب کیے اور ان کی گرفتاری کر کے لوگوں کو خاموش کرنے کی تدبیر کرنے لگے۔ انھوں نے راتوں میں کئی مقامات پر چھاپے مارے اور آٹھ لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ اخبارات میں خبریں چھپیں کہ پولیس نے اپنی تفتیش مکمل کر لی ہے اور اس واردات کو انجام دینے والے آتنک وادی اب پولیس کی حراست میں ہیں۔ اس خبر سے عوام اور اعلیٰ حکام نے چین کی سانس لی اور رفتہ رفتہ کچھ دنوں میں لوگ اس واقعے کو بھول کر اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

تینتالیس

پرم پوجیہ آدرنیہ پتا جی، سادر چرن اسپرش۔

آپ کے آشیرواد سے ہم دونوں یہاں سوستھ اور سکشل ہیں۔ یہاں آنے میں ہمیں ٹرین میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ یہاں الہ آباد کا موسم بھی بہت سہانا ہے۔ دن بھر ہلکی ہلکی

پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اتنی دیر میں وہاں لوگوں کا ایک جم غفیر جمع ہو چکا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ان میں مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ مفتی شہر بھی وہاں موجود تھے اور بہ نفس نفیس زخمیوں کو اسپتال پہنچانے میں مدد کر رہے تھے۔ وہ بھی ان لوگوں کا ہاتھ بٹانے لگا۔ یہاں اسے پتہ چلا کہ اس دھماکے میں دو معصوم جانیں گئی ہیں اور دس بارہ لوگ زخمی ہوئے ہیں۔

اچانک اس کی نظر سڑک کی دوسری طرف ایک کونے میں بیٹھے ہوئے ایک بھکاری پر پڑی۔ اس کے بدن پر پھٹے پرانے اور گندے کپڑے ضرور تھے لیکن دیکھنے میں اچھا خاصا ہٹا کٹا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ داڑھی تھی جو اس کے کپڑوں اور جسم کے مقابلے زیادہ صاف ستھری تھی۔ عبدالرحمن کو اس بھکاری میں کچھ کھٹک رہا تھا، لیکن کیا؟ اسے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگوں کی مدد میں مصروف تھا لیکن اس کی نظریں بار بار اس بھکاری کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اسے لگا کہ اتنا بڑا حادثہ ہونے کے بعد بھی یہ اپنی جگہ سے ہلا کیوں نہیں۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہاں اس کے علاوہ کوئی دوسرا بھکاری نہیں ہے۔ اسے لگا کہ ہو نہ ہو اس شخص کا تعلق اس واقعے کو انجام دینے والوں سے ضرور ہے۔ وہ یوں ہی اس کی طرف بڑھا کہ اس سے کچھ بات کر کے دیکھے۔ لیکن اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ بھکاری اپنا سامان سمیٹ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ عبدالرحمن کا شک اور مضبوط ہوا۔ اس نے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔ اتنے میں پولیس اور کچھ دوسرے لوگ بھی وہاں آ گئے۔ عبدالرحمن کے کہنے پر پولیس نے اسے حراست میں لے لیا۔ تلاشی لینے پر اس کے پاس سے سو سو کے نئے نوٹوں کی ایک گڈی برآمد ہوئی۔ اب پولیس کو بھی شک ہوا کہ اس کا تعلق دہشت گردوں سے ضرور ہونا چاہیے۔ وہ اسے لے کر تھانے چلے گئے۔

زخمیوں کو اسپتال پہنچانے کے بعد متعلقہ مندر کے پجاری اور مفتی شہر نے مل بیٹھ کر بات چیت کی۔ دونوں نے مل کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک اپیل جاری کرنے کا فیصلہ کیا، جس میں کہا گیا تھا کہ ہمیں کسی بھی حالت میں اپنا اتحاد بنائے رکھنا ہے۔ ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا ہے جس سے دہشت گردوں کی سازش کامیاب ہو جائے۔ لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف کافی غم و غصہ تھا لیکن ان دو بزرگوں کی اپیل کا اپنا اثر تھا۔ چنانچہ اس واقعے کی بنیاد پر شہر میں کسی طرح کا تناؤ اور دہشت نہیں پھیلنے پائی۔

عبدالرحمن فکر مند تھا کہ اسے اپنے تنظیم کے مخصوص ذرائع سے اگر اس واردات کی پیشگی اطلاع مل سکی ہوتی تو اسے روکا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ مطمئن تھا کہ کم از کم اس کی بروقت ذہانت سے ایک

میں "ہم ایک ہیں" لکھا ہوا ہے، جسے یہاں آنے والے یاتری آشچریہ اورکوتوہل سے دیکھ رہے ہیں۔یہاں دن بھر "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا کیسٹ بجتا رہتا ہے، جو ہرتیک من میں دیش بھکتی کا سنچار کرتا ہے۔یہاں آنے والے یاتریوں کی بڑی سنکھیا ان سے سہیوگ لے رہی ہے اور انہیں ان سے سہایتا لینے میں کسی پرکار کا کوئی سنکوچ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔تیرتھ یاتریوں کے ساتھ ساتھ سادھو، سنت بھی ان کاریہ کرتاؤں کے سیوا بھاو کو دیکھ کرپرسنّ ہیں اور ان کی پرشنسا کر رہے ہیں اور یہ کاریہ کرتا بھی آگے بڑھ بڑھ کر ان سنتو ں کا آشیرواد پراپت کر رہے ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ جہاں ایک اور نگر کی کچھ مسلم سنستھاؤں نے "خدام ملک و ملت" کے اس کاریہ کرم کوکھلے دل سے سراہا ہے، وہیں کچھ مسلم نیتاؤں نے اس کاگھور ورودھ بھی کیا ہے۔ ان ورودھیوں کا کہنا ہے کہ "خدام ملک و ملت" کا یہ کاریہ کرم کیول ایکتا کادکھاوا ماتر ہے اوراس سے دیش کا کوئی بھلا ہونے والا نہیں ہے۔اس کے اتی رکت ان ورودھیوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس پرکار کے کام مسلم ہتوں کے ورتدھ ہیں۔ سماچار پتروں سے گیات ہوا کہ انہوں نے نگر میں لاگو" دھارا ۱۴۴" کا الّنگھن کرکے ورودھ پردرشن کرنے اور جلوس نکالنے کی کوشش بھی کی تھی پرنتو اس مہاکنبھ میں امڑتی لکھوں کی بھیڑ کو دیکھتے ہوے پولیس نے انھیں اس کی انومتی نہیں دی اور ایسا کرنے کا پریاس کرنے والوں کو گرفتار کر لیا۔ ان ورودھیوں نے راجیہ سرکار سے بھی انورودھ کیا ہے کہ اس پرکار کے ادوردرشتا پورن کاریہ کرموں سے نگر کی پرستھتی خراب ہوجانے کا خطرہ ہے اس لیے تتکال پربھاو سے نہ کیول "خدام ملک و ملت" کے شور کو یہاں سے ہٹانے کا پربندھ کیا جائے ورن ان کی گتی ودھیوں پر پرتی بندھ بھی لگایا جاے۔

مجھے گیات ہے کہ آپ کو یہ جان کر اچھا نہیں لگے گا،

چیت گنج کے بھتوا مارکیٹ میں بھی دکانیں بند ہوگئی تھیں۔ یہاں بھی چہ می گوئیوں کا بازار گرم تھا۔ لوگ چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر اسی موضوع پر گفتگو میں مصروف تھے۔ سریش یادو، جو کارپوریشن کے پچھلے انتخاب میں کھڑا ہوا تھا اور ہار گیا تھا، اپنے دوست وجن راج سنگھ سے کہہ رہا تھا۔ اب ت ھتے کر دھلے انھ نے رے، ایھی مُسلمنوَن. تنّی موھبّت کا جتولَن ھندو بھائی کہ لگلن سارے کپارے پ موتے. اَب جروری ھو کہ انھے سبک سکھاوَل جاے. اُآر سینا والھن کے کاھے سانپ سُنگھلے ھو. چُپّ کاھے ھون. اب لے ت دس بیس مسلمانن کے گھاٹ اُتار دیوے کا چاھت رَھَل۔'

'اَرے کا اَنذ کَ بنذبول ۃ اَو راجا۔جے ای کُل کر لے ھو او بنارس کَ ت نَھیے ھو سَکَل، نہ ھِندو نہ مُسلمان۔' وجن راج نے کہا۔ 'ای کا آگی لگاوے کَ بات سوچت ھوّا گرو. بڑے مسکل سے ای کاسی مے امن چین آال ھوآر تو چاھے لا کہ کل چوپٹ ہو جاے. باہ راجا باہ. کیسن کاروباری ۃ آ بھیا.دھندھوا نہ چوپٹ ھوئی دنگا سے؟ مھنَن کَ بَوال جھیلے ھائی اُتہر سے، یھی ت چھلن اُنَ ھنے سب آتنک وَدِن. تھُوں لگب اون ھی کا بولی بولے. ت کا پھڑک رھی ھم لوگن میں اُآر او اتنک وَدیَن میں.جانی لا گرو، ھار گئِل اِلکسن نا؟ جیت جِتّو ت کُرت گُز گوبر، ای کاسی کے ت مرگھٹے بنا دیت۔'

'باہ رَجا باہ.بڑا ھمدری ھو مُسلمنوَن سے بھائی۔' سریش نے کہا 'ھوئی بہت نُکسان توھار ایک دن، بتا دیت ھئی۔ای مت کھے کہ بتو لَن ناھیں۔'

'ت ھمرو بات سُن لَ سردار.جون بات تو سوچت ھوّ نا، اوسے ھے جادا نکسان سمجھ میں آوت ھو۔' وجن راج نے جواب میں کہا۔ 'دیکھ بھائی، ھم ھئی اَسل بنارسی، ھتے ت ایھی سھی لَگت ھو کہ بنارس کے ھندو آآر مسلمانن کے مل جل کے پریم پوروک رھے کے چاھی۔' اس نے مجبوری سے کھڑی بولی میں آتے ہوئے کہا۔ 'ارے بھائی دیکھیے، ھمارا کاروبار ایک دوسرے پر نربھر ھے، اس جھگڑے سے صرف ھمارا نقصان ھی ھونے والا ھے.کوئی فائدہ نھیں۔'

'سُنَت ھئی، سَمجھتو ھئی، لگت ھے توھرے گولوک واس کرے کَ ٹائم آ گئِل ھو۔' سریش نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔

'ای دھوکا میں مت رھے سردار.تو جانو ھوّا ت ھتھوں ٹھاکر ھئی. ھمرو کھون

کی اچھا بھی یہی ہوگی، اور اگر میرا یہ انومان صحیح ہے تو یہ پرستھتی ہم جیسے لوگوں کے لیے کافی سنتوش جنک ہے۔ پولیس نے یہ اوشیہ کیا ہے کہ ان کے اس ورودھ کو دیکھتے ہوے ان کاریہ کرتاوں کی سرکشا کا کچھ اتی رکت پربندھ بھی کر دیا ہے، جس سے کوئی ان کو ھانی پہنچا کر میلے کا واتاورن بگاڑنے کا پریاس نہ کر سکے۔

پتا جی ،مجھے جو کچھ دکھائی دے رہا ہے وہ یہ ہے کہ' خدام ملک و ملت' کے کاریہ کرتا پورے من سے شردھالوئوں کی سیوا میں سنلگن ہیں۔ایک طرف ہندوئوں اور مسلمانوں کا ورودھ پردرشن چل رہا ہے اور دوسری اور جنتا جناردن کا ان کے پرتی پریم ویوھار بھی جاری ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے ہماری ہی طرح بھارت کی سمست جنتا کے دلوں میں بھی اس طرح کی اچھا برسوں سے پل رہی تھی کہ ہندوئوں اور مسلمانوں کے بیچ گھرنا کی کھائی کو پاٹنے کا کام کیا جلے اور آنے والے دنوں میں دونوں اسی دیش میں آپس میں مل جل کر رہیں۔ آج جیسے ہمارے ساتھ ساتھ انھیں بھی اپنا یہ سوپن ساکار ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان ہندوئوں کی تن من سے سیوا سہایتا کر رہے ہیں۔اور ہندو ان کی سہایتا کا کھلے دل سے سواگت بھی کر رہے ہیں۔پتا جی ،مجھے تو اس چھوٹے سے شور اور ان کاریہ کرتاوں میں سمست مسلمان جاتی کا پریم اور سہیوگ اور بھوشیہ کا سؤرنم بھارت دکھائی دے رہا ہے۔مجھے لگ رہا ہے کہ شاید اب وہ دن ادھک دور نہیں ہے جب اس دیش میں ہندو اور مسلمان مل جل کر آپس میں سکھ شانتی کے ساتھ رہ سکیں گے۔اور ایسا ہوا تو کنبھ کا یہ پرو ایتہاسک بن جائے گا۔ مجھے ھاردک پرسنّتا ہے کہ میں اس اتہاس کا پرتیکش سلکشی ہوں۔

آپ ہمارے لیے چنتا نہ کریں۔ہمیں تھوڑی سی بھاگ دوڑ

دھوپ کھلی رہتی ہے۔نہ ادھک گرمی ہے نہ سردی۔پراتہ سوریودے
سے پورو ہم دونوں آج سنگم تٹ پرگئے اور گنگا میااور یمنا جی کے
پرتھم درشن کا پنیہ ارجت کیااور اشنان دھیان سے نیورت ہونے کے
بعداپنے ہوٹل میں واپس آکر چائے پی۔ اپنی ہاردک اچھا کی پورتی
کی اس پاون بیلا میں نہ جانے کیسے کیسے وچار میرے من مستشک
میں آتے جاتے رہے۔یہاں میں نے اپنے پریوار کے بارے میں بھی
سوچااور دیش کے بارے میں بھی۔ ان سب سے میں کتنا پرسن ہوں ،
بتا نہیں سکتا۔میں یہ مانتا ہوں کہ یہ سب بھگوان کی دیااور آپ کے
آشیرواد کا پرتی پھل ہے ۔

یہ سماچار شاید آپ کو سُکھد آشچریہ اور ہاردک
پرسنتا دے گا کہ اس بارمہا کنبھ کے اس پاون اوسر پر ایک مسلم
سنستھا 'خدام ملک و ملت' نے بھی سنگم کی ریت پر اپناسیوا شِوِر
استھاپت کیا ہے، جہاں اس کے لگ بھگ سو کاریہ کرتا رات دن
سادھوسنتوں اور کنبھ میں آنے والے تیرتھ یاتریوں کی سیوا کر رہے
ہیں۔اس شِوِر میں ڈاکٹروں اور آوشیک دوائیوں کا بھی سموچت
پربندھ کیا گیا ہے، جو اسوستھ تیرتھ یاتریوں کو نہ شُلک چکتسا
سُودھا اُپلبدھ کرا رہے ہیں۔ اس سنستھا کے کاریہ کرتاوں نے
یاتریوں کے پوتر پوجا کاریوں میں ویودھان ڈالے بنالوگوں
کواشنان کے لیے پوری سُودھا کے ساتھ گھاٹ تک لانے لے جانے،بھولے
بھٹکے ہوئے یاتریوں کو ان کے نشچت استھانوں تک پہنچانے، انہیں
شدھ جل اُپلبدھ کرانے جیسے سنمست کاریہ اپنے کندھوں پر لے رکھے
ہیں۔ یدی آپ بھی یہاں ہمارے ساتھ آگئے ہوتے تو یہ اتی پاون
درشیہ آپ اپنے ہی نیتروں سے دیکھ پاتے۔سوتنتر بھارت کے اِتہاس
میں کُداچت ایسا پرتھم بار ہورہا ہے کہ ہندوؤں کے ایسے پاون
پرو پر مسلمان اپنا سہیوگ دے رہے ہیں ۔ اس شِوِر کے باہر ہندی
اور انگریزی کے اتی رکت اردو بھاشامیں بھی مارگ درشک
سدھانتوں کا وورن لکھا گیاہے۔ اس کے شیرش پر موٹے اکشروں

انھیں جس طرح مسعود خاں کے یہاں سے جانے کا ذمے دار ٹھہرایا تھا اس کے بعد سے وہ کچھ زیادہ ہی بے چین رہنے لگے تھے۔ انھیں لگتا تھا کہ قصبے کا اتنا ہونہار نوجوان شاید صرف ان کی تلخ کلامی ہی کی وجہ سے گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس خبر کو پڑھ کر وہ اس لیے بھی پریشان تھے کہ جانے ہندوستان کے مسلمانوں کو رفتہ رفتہ کیا ہوتا جا رہا ہے۔ بھلا وہ ان کافروں پر کیسے بھروسا کر رہے ہیں جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ قرآن میں بھی صریح الفاظ میں ہدایت ہے کہ کافروں سے دوستی نہ رکھو، یہ کبھی تمھارے دوست نہیں ہو سکتے۔ پھر ان کی خدمت، چہ معنی دارد۔

وہ بے چین تھے اور بیٹھے بیٹھے سوچ رہے تھے کہ ہمدان علی خاں کے سو کر اٹھنے کا وقت ہو جائے تو ان کے پاس جا کر اس خبر پر تبادلہ خیال کریں۔ ممکن ہے ان سے گفتگو کر کے ان کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ ادھر ہمدان علی خاں سے ان کی ملاقاتیں کچھ زیادہ ہی ہونے لگی تھیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا جب وہ ہمدان علی خاں سے ملنا تو دور کی بات ہے، سرِ راہ ان کے سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ انھیں ایک بے دین، لچا لفنگا انسان سمجھتے تھے، جسے نہ مذہب سے کچھ غرض تھی، نہ اخلاقیات سے کچھ لینا دینا۔ ان کے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اسے اناپ شناپ دولت دے کر اس کے گناہوں کی رسی دراز کر رکھی تھی۔ انھیں یہ تو نہیں معلوم تھا کہ یہ ساری دولت ان کے پاس کہاں سے آتی ہے لیکن انھیں اتنا اندازہ ضرور تھا کہ ان کی آمدنی کا کوئی جائز وسیلہ نہیں ہوگا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ گاؤں کے بزرگوں نے انھیں اکثر سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کی تھی لیکن انھیں اس میں کبھی کامیابی نہیں ملی۔ لیکن اب معاملہ قدرے مختلف ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ قصبے کے سارے بزرگ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور ان کے لیے وقت گذاری ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ وہ اپنی تنہائی سے بری طرح عاجز آ چکے تھے۔ انھیں بات چیت کرنے کے لیے کوئی اپنی ہی عمر کا انسان چاہیے تھا۔ مجبور ہو کر بالآخر انھوں نے ہمدان علی خاں کو معاف کر کے ان سے دوستانہ روابط استوار کر لیے تھے۔ ان کے قریب آنے کے بعد انھیں ان کی کچھ اچھائیوں کا بھی علم ہوا۔ پتہ چلا کہ انھوں نے اب اپنے تمام سابقہ گناہوں سے توبہ کر لی ہے۔ اب وہ پابندی سے جمعے کی نماز بھی پڑھنے لگے تھے، رمضان کے روزے بھی قضا نہیں کرتے تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود چاہنے والی کسی تنظیم کی رکنیت بھی اختیار کر لی ہے۔ یہ سب جاننے کے بعد ان سے ملنے پر ان کا دل ملامت نہیں کرتا تھا۔ وہ خوش بھی تھے کہ ایک گمراہ شخص راہِ راست

کنتو ہم نے یہاں کے سماچار پتروں میں یہ بھی پڑھا ہے کہ کچھ تیرتھ یاتریوں اور ہندو سنستھائوں نے بھی اس پر اپنا تیور ورودھ جتایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسے پاون پرو پر ان کی تپو بھومی، کو اپوتر کرنے کا ایسا دُس ساھس ادوتیہ ہے۔ ان کی مانگ ہے کہ مہاکنبھ کے اس اوسر پر استھاپت کیے گئے اس ہندو ورودھی شور کو ترنت پربھاو سے ہٹایا جائے اور کسی اپوترملیچھ کو سنگم تٹ تک آنے کی انومتی نہ دی جاے۔وہ یہ مانگ بھی کر رہے ہیں کہ ان مسلمانوں کو جس سرکاری تنتر نے یہاں شور لگانے کی انومتی دی ہے اس کے وِرُدھ کٹھور کاریہ واھی کی جائے، جس سے بھوشیہ میں کوئی اس پرکار کا ساھس نہ کر سکے۔وہ اس بات کے بھی ڈنکے پیٹ رہے ہیں کہ ان اپوتر ملیچھوں کی اُپستھتی کے کارن اس پنیہ پرو میں ویودھان اتپنن ہو گیا ہے، جس سے یاتریوں کو اس تیرتھ یاترا کا اچھت اور اُپیکشت پرینام نہیں مل پائے گااور اس پر کھرچ کیا گیا ان کا سارا دھن ویرتھ چلا جائے گا۔ مجھے سویَم بھی سماچار پتر وں میں یہ سب پڑھ کر اچھا نہیں لگا۔ پرنتو ہم کیول بھگوان سے پرارتھنا ھی کر سکتے ہیں کہ وہ ان کو سد بدھی دے۔انھوں نے سادھو سنتوں سے بھی پرارتھنا کی ہے کہ وہ اس شور کا وِرودھ کریں اور ان سے کسی پرکار کی کوئی سہایتا نہ لیں۔سماچار پتروں کے انوسار انھوں نے یہ بھی کہا کہ سنتوں کی سہایتا کے لیے کئی ہندو سنستھائوں نے بھی شور لگائے ہیں، جو ان کے کاریوں کو سرل اور سُودھا جنک بنانے کا بھرسک پریتن کررہے ہیں۔ لیکن ان کے ان پریاسوں کا کوئی پرینام کم سے کم مجھے تو دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

کچھ ہندوئوں اور مسلمانوں کے اس ورودھ پردرشن کے باوجود میرے درشٹی کونڑسے سرکاری تنتر کی بھی یہی اچھا پرگٹ ہو رہی ہے کہ وہ اس شور کو اسی پرکار چلنے دیں۔اگر وہ ایسا سوچ رہے ہیں توبھلی بھانتی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ سرکار

ہو گئے۔ان کے پیچھے پیچھے وہ بھی بیٹھک میں پہنچے اور ان کے پاس بیٹھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔"گھر مَاں سَب ٹھیک ٹھاک تو ھے نَا حَافِج جی؟"

"اللہ کا احسان ہے ہمدان خاں۔یوں ہی آج طبیعت کچھ زیادہ بے چین تھی۔سوچا چل کر تمھارے پاس بیٹھوں،شاید کچھ قرار آئے۔"حافظ عبدالصمد نے کہا۔

"یَا تو اَچھی کریو تم۔"ہمدان خاں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔"مَیں تَنِی کے چلے کا کہِ دُوں تو پھر اِطمینان سے بَیٹھ کے بَات کری، صُبح سے اَبے تَک مِسْرِی چَائے نصیب نہیں بھی۔ این گوروؤں کے چکّر ماں"۔یہ کہتے ہوئے وہ گھر کے اندر زنان خانے میں چلے گئے۔

اب کی بار ہمدان خاں آئے تو ان کے ساتھ ملازم چائے اور اس کے لوازم ساتھ لیے آیا تھا۔اس نے ساری چیزیں بیٹھک کی میز پر رکھیں اور فوراً چلا گیا۔جیسے وہ دو دوستوں کے درمیان زیادہ دیر مخل رہنا نہیں چاہتا تھا۔اس کے جاتے ہی حافظ عبدالصمد خاں نے ہاتھ میں مڑا ہوا اخبار ہمدان خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔"یہ خبر دیکھو ہمدان خاں۔لکھا ہے کہ الہ آباد کے کنبھ میں اب کی بار مسلمانوں نے ہندو سادھو سنتوں کی بہت خدمت کی۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان مسلمانوں کو ہو کیا گیا ہے۔خدمت کرنے کے لیے کیا سارے مسلمان علمائے کرام اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں جو اب ان کو کافروں کی سیوا کرنے کی ضرورت آن پڑی۔خون سفید ہو گیا ہے ان سب کا۔قرب قیامت کی نشانیاں ہیں یہ سب۔اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ نے فرمایا تھا کہ جب مسلمان اپنے فرائض فراموش کر کے کافروں کی طرح زندگی گذارنے لگیں تو سمجھ لینا کہ قیامت میں اب زیادہ دیر نہیں رہ گئی ہے۔مانو یا نہ مانو ہمدان خاں،یہ دنیا اب جلدی ہی ختم ہونے والی لگتی ہے۔ہماری تمھاری زندگی ہی میں۔"عبدالصمد خاں بغیر سانس روکے لگاتار بولے جا رہے تھے۔

ہمدان علی خاں نے عبدالصمد خاں کو اس کیفیت میں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔وہ سمجھ گئے کہ مولانا کی پریشانی کسی اور وجہ سے ہے اور آڑ لے رہے ہیں اخبار کی اس خبر کی۔پھر بھی انھوں نے ان کے ہاتھ سے اخبار لے کر اس سرخی پر ایک نظر ڈالی۔اور جیسے وہ سب ان کی سمجھ میں آ گیا، جو عبدالصمد خاں کی تشویش کا باعث تھا۔ان کی اس وقت کی پریشانی کا سبب اس خبر میں مسعود خاں کا ذکر تھا۔اس خبر نے ان کے ذہن میں وہ تمام باتیں تازہ کر دی تھیں جو ان کو وقتاً فوقتاً پریشان کرتی رہتی تھیں۔انھوں نے

کے بعدیہاں تاشقند مارگ پر استھت 'ہوٹل الہ آباد ریجینسی' میں جگہ مل گئی تھی۔یہاں کافی اچھی سُودھائیں ہیں اور ہمیں کسی پرکار کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔کیول بار بار یہ جی اوشیہ چاھتا ہے کہ آپ اور ماتا جی بھی ہمارے ساتھ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ماتا جی کو میرا سادر چرن اسپرش کہہ دیں۔

آپ کا پتر

راجیش پانڈے

چوالیس

حافظ عبدالصمد خاں اپنی خواب گاہ میں فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد دو دن پرانا اخبار 'سیاست جدید' پڑھ رہے تھے جو کل شام کی ڈاک سے ان کے پاس آیا تھا۔سامنے چھوٹی میز پر چائے کا کٹورا اور باسی روٹی رکھی ہوئی تھی جو ان کی بیگم ابھی ابھی رکھ کر گئی تھیں۔یہ ان کا مرغوب ناشتہ تھا۔ وہ اخبار کی سرخیاں دیکھتے جا رہے تھے اور وقفے وقفے سے روٹی کا لقمہ منھ میں ڈال کر چائے کی چسکیاں بھی لے رہے تھے۔اچانک اندرونی صفحے کی ایک سرخی پر ان کی نظر ٹھہر گئی: 'کنبھ کے دوران ایک مسلم نوجوان کا کارنامہ'۔انھوں جلدی جلدی اس خبر کو پڑھا۔یہ خبر کسی مسعود خاں کے بارے میں تھی۔اس میں لکھا تھا کہ مسعود خاں نام کے ایک نوجوان نے، جو خدمت خلق میں مصروف ایک تنظیم 'خدام ملک وملت' کا سربراہ ہے،کنبھ کے موقعے پر ہندو زائرین کی خدمات انجام دے کر ایک قابل تقلید مثال قائم کی ہے۔اس خبر کو پڑھ کر وہ چونکے کہ کہیں یہ اپنا ہی مسعود خاں تو نہیں ہے، جو اٹھارہ سال پہلے یہاں سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا اور اس کے بعد آج تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔لیکن پھر انھوں نے خود کو سمجھایا کہ جانے اس دنیا میں اس نام کے کتنے لوگ ہوں گے۔محض نام کی مماثلت سے اسے اپنا مسعود سمجھ لینا حماقت ہے۔پھر اپنا مسعود خاں تو ہندوؤں کے نام ہی سے چڑھتا تھا،وہ بھلا ان کی خدمت کیسے کر سکتا ہے۔لیکن یہ خبر انھیں بے چین ضرور کر گئی تھی۔ایک تو اس لیے کہ اسے پڑھ کر انھیں مسعود خاں کی یاد آ گئی تھی، جو اب ہمہ وقت ان کے دل میں پھانس کی طرح چبھتی رہتی تھی۔دوسرے مسعود کی خالہ رفیع النسا نے اپنے انتقال کے وقت

'اب کا بتائی ہم مولانا'۔ ہمدان خاں نے جیسے اظہار تاسف کرتے ہوے کہا۔ 'ای سب بے کار کے لوگن کے کام ہیں۔ ہمرے جیسے کام کاجی آدمن کا نہیں۔ ہمری سمجھ ماں نہیں آوا تو ہم چھوڑ دیہن یا سب۔ اب کونوں تنجیم ونجیم نہیں نا ہمار، نہ اب ہمار اوہی سے کونوں رستہ ہے۔ بتاوا رہے ناتم کا کہ لکھنو ما کا بھا رہے'۔

'مگر تم نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ تم نے اس تنظیم سے رشتہ ہی منقطع کرلیا ہے'۔ جیسے اس خبر کو سن کر حافظ عبدالصمد خاں کو کچھ اچھا نہیں لگا۔ 'اس طرح تم مسلمانوں کی کچھ خدمت تو کر ہی رہے تھے'۔

'ارے بھائی، جی تو ہمارو چاہت رہا، جبہن تو ہم ای ماں شامل بھئے رہن۔ پر اُن کا کام کاج کرے کا تریکا اپنے جیسے جاہلن کی سمجھ ماں نہیں آوت۔ اور سچ بتائی تو ای کچھو ٹھیک آدمی بھی نہیں لاگت ہم کا'۔ ہمدان خاں نے کچھ اور کھلتے ہوے اپنے دل کا درد بیان کیا۔

'کچھ بھی ہو اچھا نہیں کیا تم نے یہ ہمدان خاں'۔ یہ سن کر عبدالصمد خاں مزید مغموم ہو گئے تھے۔ 'پتہ نہیں اس خبر کو پڑھ کر مجھے کیوں لگا کہ یہ مسعود خاں اپنا ہی مسعود ہوگا'۔ وہ پھر اپنی اسی بات پر واپس لوٹ آئے۔

'ایسے تو مولانا یا سب تو تمہرے دماگ کی کھرافات ہے۔ اور بالفرج اگر یا کام اپن مسود خاں کرس ہوئی تو یا برا کام کبھوں نہیں ہوئی سکت۔ ہمرے تمہرے سمجھ ماں بھلے نہ آوے پر یا کام ہے گجب کا۔ اپنے گاؤں کا آدمی اگر سوہرت پاوت ہے تو ہم سب کا کھس ہوے کا چاہی، برا بھلا بالکلے نہ کہے کا چاہی'۔ ہمدان خاں نے اپنی راے دیتے ہوے کہا۔ 'پھر ہواں بڑے بڑے دماگ والے لوگ ہوات ہیں۔ ہوئی کونوں مصلحت ان تڑا کے کامن کا کرے ماں'۔

لیکن حافظ عبدالصمد یہ بات نہیں مان سکتے تھے کہ خدا کی اس دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو ان کی، حافظ عبدالصمد خاں کی فہم سے بالاتر ہو۔ ہمدان علی خاں کی اس بات کو مان لینا ان کی توہین تھی۔ اور وہ اس بات کو ماننے کے لیے کسی بھی طرح تیار نہیں تھے کہ الہ آباد میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا ہے وہ کسی بھی زاویے سے صحیح بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن اب وہ اس وقت اس موضوع پر ان سے مزید بحث کرنا نہیں چاہتے تھے۔

پر آ گیا۔ اللہ کی قدرت پر ان کا یقین پہلے سے کچھ اور بھی زیادہ مضبوط ہو گیا۔ انھیں لگا کہ اس کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ انھیں ہمدان خاں کے مزاج میں آنے والی تبدیلی سے یہ بھی خوشی تھی کہ اب ان سے ملنے پر کوئی ان کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکے گا۔

صبح کے نو بج چکے تھے۔ عبدالصمد خاں اپنے گھر کے سامنے بڑی بے چینی سے ٹہلتے ہوئے دس بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کیونکہ ہمدان علی خاں کے سو کر اٹھنے کا یہی وقت تھا۔ اچانک انھیں محسوس ہوا کہ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ دس بجے ہی سو کر اٹھیں۔ گرمی کا زمانہ ہے، دن جلدی نکل آتا ہے۔ ممکن ہے وہ اٹھ ہی چکے ہوں۔ یہ خیال آتے ہی انھوں نے دھیرے دھیرے اپنے قدم ان کے گھر کی جانب بڑھانے شروع کر دیے۔ دراصل وہ اپنے طور پر اپنی بے چینی کا کوئی علاج نہیں ڈھونڈھ پا رہے تھے۔ شاید ان کی بڑھتی عمر اس اختلاج کے لیے ذمے دار رہی ہو، لیکن اب ان کے ساتھ ایسا اکثر ہونے لگا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ پریشان ہو جاتے تھے۔ معمولی معمولی باتوں پر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ اور جب جب ایسا ہوتا تھا، وہ ہمدان علی خاں کے پاس چلے جاتے تھے جہاں ان کا پرلطف اور بے تکلف انداز گفتگو اور بلند بانگ قہقہے ان کی تمام الجھنوں اور پریشانیوں کا مداوا بن جایا کرتے تھے۔ پھر آج تو ان کی بے چینی کچھ حد سے تجاوز کر رہی تھی۔ نہ جانے کتنی بار انھوں نے آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر اپنے سینے پر دم کی تھی۔ خمیرہ مروارید کی ایک خوراک بھی لی تھی لیکن دل کی بے قراری تھی کہ قابو ہی میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

اپنی اسی ادھیڑبن میں الجھے وہ ہمدان خاں کے گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ باہر جانوروں کے باڑے کے پاس کھڑے مزدوروں کو کچھ ہدایات دے رہے ہیں۔ انھیں بیدار دیکھ کر انھیں بے حد خوشی اور اطمینان کا احساس ہوا۔ اپنے اوپر تھوڑا غصہ بھی آیا کہ وہ ناحق گھر میں بیٹھے بیٹھے دس بجنے کا انتظار کرتے رہے۔ اتنے میں ہمدان خاں کی نظر ان پر پڑی تو انھوں نے وہیں سے ہانک لگائی۔ ارے خافح جی، آج اتی صُبح صُبح کیسے اِنگھے ٹپک پڑیو۔ نیند نہیں آئی کا رات بھر؟

عبدالصمد خاں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں تھے، اس لیے کوئی جواب دیے بنا ہی وہ ان کی بیٹھک کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گئے اور وہاں اطمینان سے بیٹھ کر ہمدان خاں کا انتظار کرنے لگے۔ ہمدان خاں کو محسوس ہوا کہ آج شاید مولانا کچھ پریشان ہیں، اس لیے وہ بھی کچھ سنجیدہ

اس لیے خاموش رہے۔ پھر انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا' اب چلتا ہوں، شام میں موقع ملا تو پھر آؤں گا۔
ہمدان خاں کو لگا کہ مولانا عبدالصمد خاں جس درد کا درماں لینے ان کے پاس آئے تھے وہ انھیں نہیں مل سکا۔ اس لیے انھوں نے تھوڑا اصرار کرتے ہوئے کہا۔ 'اب اتی کا جلدی ہے، رُکو ناتنی دیر۔'
'ارے بھائی تمھاری بھابی کو فاروقی دواخانہ لے جا کر کلو حکیم کو دکھانا ہے، رات بھر کھانستی رہیں۔ انھیں شاید کوئی اور بہانہ نہیں سوجھا وہاں سے جانے کا۔' دیر ہوگئی تو وہ اٹھ جائیں گے۔
'جون تُمھار مرجی۔'

پینتالیس

کچھ مخالفتوں کے باوجود حرکت البشر کا الہ آباد مشن نہایت کامیاب رہا۔ مسعود خاں کی سربراہی میں ان کی ذیلی تنظیم 'خدام ملک وملت' کے کیمپ نے قابل تحسین خدمات انجام دی تھیں۔ یہاں ان کے کارکنوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے کنبھ کے زائرین کے دلوں کو جیتا تھا۔ اپنے اس مشن کے دوران انھیں عوام، پولیس انتظامیہ اور میڈیا کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ سب نے مسلمانوں کے اس اقدام کو بڑے پیمانے پر سراہا تھا۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن، سب نے ان کی ایک ایک کارکردگی کو مناسب طور پر عوام تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ایک طرف جہاں ان کے خیر سگالی کے اس جذبے کو میڈیا نے سراہا تھا وہیں دوسری جانب لاکھوں زائرین اور ہزاروں سادھو سنتوں کو بھی مسلمانوں کا یہ اقدام مناسب اور خوش آیند لگا تھا۔ شاید پہلی بار انھیں اس بات کا احساس ہوا تھا کہ سارے مسلمان برے اور قابل نفرت نہیں ہوتے۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں کی طرح ان میں بھی اچھے اور برے دونوں طرح کے انسان پائے جاتے ہیں۔ جن میں سے اچھے لوگ اچھا کام کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے اور برے لوگ اپنی عادت کے مطابق برے کاموں کو انجام دیتے رہتے ہیں۔ انھیں اب اس بات کا بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ ناحق ابھی تک اپنے دلوں میں مسلمانوں کے بارے میں اس طرح کی غلط فہمیاں پالے ہوئے تھے۔
کنبھ کا یہ موقع مسعود خاں کے لیے بھی کم مبارک ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس بات کی اہمیت کو بخوبی سمجھا کہ اتنی بڑی تعداد میں وہ ہندوؤں اور ان کے مذہبی اکابرین سے اور کہیں نہیں مل سکتا

تھا۔ چنانچہ اس سنہرے موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے فوری طور پر ان سے ملاقاتیں کرنے کا ایک منظم منصوبہ بنالیا تھا اور ہندوستان کے گوشے گوشے سے یہاں آئی ہوئی اہم سماجی شخصیات اور سادھوسنتوں کے خیموں میں جا جا کر ان سے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور ان کے درمیان اتحاد قائم کرنے کے مختلف طریقوں پر تفصیلی بات چیت کی تھی۔ اس نے ان کی تمام باتوں کو دھیان سے سنا تھا اور یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ ان کی نظر میں ان مسائل کا حل کیا ہے۔ اس کے لیے یہ خوشی اور اطمینان کی بات تھی کہ حرکت البشر کے اندازے کے عین مطابق ان کی غالب اکثریت بھی وہی چاہتی تھی جو خود حرکت البشر کا مشن تھا۔ حالانکہ ان ملاقاتوں کے دوران ابھرنے والے اختلافی امور کی فہرست بھی خاصی طویل تھی لیکن کئی نکات ایسے بھی تھے جن پر دونوں کے درمیان اتفاق رائے تھا۔ وہ اس بات پر پورے طور سے متفق تھے کہ یہ ملک ہندوؤں کی طرح ہی مسلمانوں کا بھی ہے۔ انھیں بھی یہاں رہ کر امن وامان کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض انجام دینے کی پوری آزادی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو لوگ اس حقیقت کے معترف نہیں ہیں وہ نہ صرف احمق ہیں بلکہ کسی نہ کسی طرح ملک کے دشمن بھی ہیں۔

ان سے گفتگو کرنے کے بعد مسعود خاں کو محسوس ہوا کہ عام طور پر ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے بارے میں ایسی بہت سی بدگمانیاں بھی ہیں جن کی حقیقی بنیاد کچھ بھی نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ سب اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں شعوری طور پر پیدا کی جانے والی بدگمانیوں کا اثر تھا۔ اس نے حتی الامکان اپنے تجربے، مطالعے اور فہم وفراست کی روشنی میں ان کے دلوں میں موجود خدشات کا ازالہ کرنے کی کوشش کی اور ان کو بتایا کہ عام طور پر مسلمان اپنے ملک سے اسی طرح محبت کرتے ہیں جیسی کسی بھی محب وطن سے توقع کی جاسکتی ہے۔ اس نے انھیں باور کرانے کی کوشش کی کہ دراصل حب الوطنی اختیاری جذبہ ہوتا ہی نہیں ہے کہ اپنی مرضی سے جب چاہیں اسے اختیار کرلیں اور جب چاہیں اس سے کنارہ کشی اختیار کرلیں۔ اپنے وطن سے محبت کا یہ جذبہ تو فطری طور پر ہر انسان کے خون میں شامل ہوتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہن سے محبت کرتا ہے۔ جو آدمی جہاں رہتا ہے اسے اس سرزمین سے، اس سے متعلق تمام چیزوں سے اور وہاں کے لوگوں سے محبت ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ ساری دنیا میں رشتوں کا سلسلہ ہی اسی بنیاد پر قائم ہے۔ تنازعہ وہاں ابھرتا ہے جہاں ہم دوسروں کے جذبات کی قدر اور ان کے حقوق کا احترام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

اس نے ان سے یہ بھی کہا کہ کسی بھی مذہبی گروہ کو، جیسے کہ اس وقت یہاں مسلمان ہیں، متواتر شک کے دائرے میں رکھنا نامناسب ہی نہیں، نقصان دہ بھی ہے۔ اس سے ان کے اندر عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور نتیجتاً وہ خود کو تنہا اور ساری دنیا کو اپنا بدخواہ اور دشمن تصور کرنے لگتے ہیں۔ یہ احساس انھیں ایسے کاموں کی طرف لے جاتا ہے جو کسی بھی معاشرے کے لیے مضر ہوتے ہیں۔ اس نے انھیں بتایا کہ مسلمان کبھی بھی ہندوؤں کے مذہبی اور نجی معاملات میں کوئی مداخلت کرنا نہیں چاہتے۔ وہ اسلام کے پیرو ہیں اس لیے دوسرے مذاہب کا احترام کرنا بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ اسلام منافرت کا نہیں، محبت کا پیغام لے کر اس دنیا میں آیا تھا اور اس کا یہ پیغام آج بھی اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ شرط بس اسے محبت، ہمدردی اور یقین کے ساتھ سننے اور سمجھنے کی ہے۔ اس نے کہا کہ عام طور پر ہم میں ایک بری عادت یہ ہوتی ہے کہ ہم جب اپنے عقائد سے متعلق باتوں کا علم حاصل کرتے ہیں تو ہمارا رویہ ہمدردانہ ہوتا ہے اور جب کسی دوسرے کے مذہب کا مطالعہ کرنے بیٹھتے ہیں تو یہی رویہ منفی اور معاندانہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس مطالعے سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو پاتے۔ دوران گفتگو ایسی بھی کئی باتیں درمیان میں آئیں جن میں نفرت اور حقارت کے جذبات موجزن تھے لیکن مسعود خاں نے توجہ سے ان کی باتیں سنیں اور نہایت خوش اسلوبی سے ان کے تمام سوالوں کا جواب دے کر ان کے خدشات کو دور کرنے کی سعی کی۔ میلے کے خاتمے سے کچھ پہلے اس نے ان سنتوں سے گزارش کی کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان محبت، رواداری اور یگانگت کی فضا قائم کرنے کے اُس کے مشن کو تعاون دیں، جسے انھوں نے پوری خوش دلی، وسیع النظری اور ہمدردی سے اپنی منظوری سے سرفراز کیا۔

حرکت البشر کے اس اقدام کے بعد اب مسعود خاں کی دو شخصیتیں ہو گئی تھیں۔ وہ بہ یک وقت دو کشتیوں پر سوار ہو گیا تھا۔ اور یہ سواری کبھی نہ کبھی اس کے اور اس کے مشن کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ ایک طرف تو وہ خفیہ طور سے حرکت البشر کی سرگرمیوں سے متعلق تھا، جو کبھی کبھی غیر قانونی کاموں کو انجام دینے سے گریز نہیں کرتے تھے اور دوسری جانب وہ کھلے طور پر 'خدام ملک و ملت' کا سربراہ تھا۔ دونوں ذمے داریاں اہم تھیں لیکن کسی ایک شخص پر بہ یک وقت یہ دونوں ذمے داریاں کئی طرح کے مسائل کا سبب بن سکتی تھیں۔ اس لیے حرکت البشر کے اکابرین نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ نوتشکیل تنظیم 'خدام ملک و ملت' اپنے کاموں کو حرکت البشر سے علاحدہ رہ کر آزادانہ طور پر انجام دے گی۔ اس کا

واحد مقصد اپنے مختلف کاموں کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق اور خلوص و یگانگت کی فضا قائم کرنا تھا۔ جب کہ حرکت البشر کے مقاصد کا دائرہ کہیں زیادہ وسیع تھا۔ انھیں مسعود خاں کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا۔ انھیں یقین تھا کہ یہ نوجوان ان کے اس مشن کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کی پوری اہلیت رکھتا ہے۔ چنانچہ تنظیم کی مجلس عاملہ کی میٹنگ طلب کر کے اس میں مسعود کو حرکت البشر کی جملہ ذمے داریوں سے سبک دوش کر دیا گیا۔ لیکن مسعود خاں کی درخواست پر یہ بات مان لی گئی کہ 'خدام ملک وملت' کو باہر سے ہمیشہ حرکت البشر کا تعاون ملتا رہے گا۔

یہ مسعود خاں کی بہترین تنظیمی صلاحیتوں کا کرشمہ ہی تھا کہ نہایت کم وقت میں 'خدام ملک و ملت' ہندوستان کی ایک نیک نام تنظیم بن کر ابھری تھی۔ اس کی سربراہی کی نئی ذمے داری قبول کرنے کے فوراً بعد اس نے سب سے پہلے اس تنظیم کی تشکیل جدید کا منصوبہ بنایا۔ اس نے ان تمام سنتوں اور مسلم علما کو اس کا سرپرست بننے کی دعوت دی، جن سے اس سلسلے میں اس نے مختلف اوقات میں تبادلہ خیال کیا تھا۔ ان میں سے بیشتر نے اس کی اس دعوت کو قبول کر لیا۔ اس نے تنظیم کی مجلس عاملہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی تعداد رکھی۔ سارے ملک میں اس کی رکنیت سازی کی مہم چلائی گئی، جس میں ٹی وی چینلوں اور میڈیا کے دوسرے لوگوں نے اس کا پورا ساتھ دیا۔ انٹرنیٹ، بینک اور پوسٹ آفسوں کے ذریعے انھیں کافی رقوم وصول ہونے لگیں تو اس نے ان کے تحفظ اور اخراجات پر نگرانی کا محکمہ قائم کر کے ایمان دار ہندوؤں کے سپرد کر دیا۔ اس تنظیم کے دروازے اب مساوی طور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ اراکین کی روز افزوں تعداد سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہندوستان کے بیشتر لوگ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور نہ جانے کب سے وہ اس طرح کی کسی تنظیم کے منتظر تھے۔ رفتہ رفتہ اس تنظیم پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو بھی اعتماد بحال ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تنظیم کی نئی شکل سابقہ شکل کے مقابلے میں زیادہ مفید اور کارآمد ہو گئی۔ اب یہ سب مل جل کر سارے ملک میں محبت اور خلوص کا پیغام پہنچانے میں لگ گئے، جس کا خاطر خواہ اثر بھی دیکھنے میں آنے لگا۔

کچھ ہی دنوں میں 'خدام ملک وملت' کے اراکین کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ لوگ جوق در جوق اس نئی تنظیم کی رکنیت اختیار کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کے کئی شہروں میں اس کی شاخیں قائم

ہوئیں۔ ان شاخوں کے پاس اچھے کارکن تھے، جن کو باقاعدہ ایک معقول مشاہرہ دیا جاتا تھا، تاکہ ان کے افراد خاندان کی مناسب کفالت ہو سکے اور وہ پوری یکسوئی سے تنظیم کے کاموں کو انجام دیں۔ اس کے اپنے باقاعدہ دفاتر تھے، جہاں کسی بھی طرح کی خدمت کے لیے لوگ ہمہ وقت موجود رہتے تھے، اپنے مالی وسائل تھے، جن سے تنظیمی کاموں کو چلانے میں کسی طرح کا رخنہ پڑنے کی امید نہیں تھی۔ اپنی گاڑیاں تھیں، جنھیں انھوں نے اراکین کے مالی تعاون سے حاصل کیا تھا اور اب بڑے پیمانے پر اپنے کاموں کو انجام دینے کے لیے ان کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔

ابتدائی طور پر انھوں نے ان تمام متنازعہ امور سے گریز کیا تھا جن کی بنیاد پر کسی وقت سارے ملک میں نفرتوں کا لاوا پکنے لگا تھا۔ ابھی وہ صرف مشترکہ مفادات کے کاموں کی طرف ہی توجہ دے رہے تھے، جس میں انھیں بڑے پیمانے پر لوگوں کا تعاون مل رہا تھا۔ مسعود خاں اب بے حد مصروف شخص تھا۔ اس کے پاس اب لوگوں سے ملنے کا وقت کم رہتا تھا۔ اس نے متواتر ہندوستان کے کئی شہروں کے دورے کیے۔ وہ کسی ایک شہر میں دو تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرتا تھا۔ اس نے ہر جگہ اپنی اس بات کو دہرایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ویدوں میں اور قرآن میں بیشتر مقامات پر اشتراک ہے۔ پرانوں میں بیان کردہ کہانیاں اکثر ہماری روایات سے مماثل ہیں۔ منوسمرتی کا مطالعہ کریں تو لگے گا کہ آپ توریت پڑھ رہے ہیں۔ اسی طرح اس نے ہندوؤں کو مشورہ دینا شروع کیا کہ وہ ادھر ادھر سے سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے اسلام کے بارے میں فیصلہ کرنا چھوڑ دیں۔ خود اپنے طور پر آگے بڑھ کر مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کریں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اس میں ایسا کچھ نہیں ہے جس کی تشہیر عام طور پر اسلام دشمن لوگ کیا کرتے ہیں۔ لوگ اس کی باتوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ اس کا باہم مطالعے کا یہ مشورہ لوگوں کو قابل عمل بھی نظر آ رہا تھا۔ لوگ اس سے مل کر وعدہ کر رہے تھے کہ وہ اس اتحاد کے لیے جو بھی ممکن ہوگا ضرور کریں گے۔ وہ وعدہ کر رہے تھے کہ اس طرح کے مطالعے کے لیے اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت ضرور نکالیں گے۔ دراصل یہ سب اس اعتماد کی کارفرمائی تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان رفتہ رفتہ بحال ہو رہا تھا۔ اس اعتماد نے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے شروع کر دیے تھے۔ انھوں نے اب ایک

دوسرے کو دشمن کی حیثیت سے دیکھنا ترک کر کے عام انسان کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔
لیکن اس ملک میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو 'خدام ملک وملت' کے ان کاموں کو ہندو مفادات کے خلاف سمجھتے تھے اور جلد از جلد اس کا قلع قمع کرنے کے لیے مناسب منصوبہ سازی کر رہے تھے۔

چھیالیس

'ہندوؤں کے من میں مسلمانوں کی اور سے وشیش شکائیں ہیں'۔ سوامی سرودانند نے امیر البشر احمد عبداللہ الہندی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ 'چرچا آرمبھ کرنے کے پہلے کچھ ان کے سمادھان پر چرچا ہو جاتی تو گرو تر ہوتا'۔

'ضرور'۔ امیر البشر نے نہایت خوش دلی کے ساتھ کہا۔ حالانکہ انھیں لگ رہا تھا کہ اس مذاکرے کی ابتدا شکایات سے نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ انھوں نے کہا 'اگر آج ہم روبرو بیٹھ کر گفتگو پر آمادہ ہوئے ہیں تو ہمارے دلوں میں جو بھی ملال ہے، اسے صاف ہو جانا چاہیے، ورنہ اس گفتگو کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا'۔

بالآخر ہندو سادھو سنتوں کے ایک وفد کی حرکت البشر کے امیر احمد عبداللہ الہندی سے ملاقات کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ اس ملاقات میں کئی دشواریاں تھیں۔ اول تو دونوں جانب شکایات کا اتنا زبردست دفتر جمع تھا کہ اس طرح کی کسی ملاقات کا امکان صدیوں پر ٹل سکتا تھا۔ یہ مسعود خاں کا کرشمہ ہی تھا کہ اس نے دونوں فریقوں کے درمیان اس طرح کا ماحول بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی اور آج کی یہ ملاقات ممکن ہو سکی تھی۔ چونکہ یہ ملاقات مسعود خاں ہی کی متواتر کوششوں کا نتیجہ تھی، اس لیے فطری طور اس سے برامد ہونے والے نتائج کی جانب سے بھی وہی سب سے زیادہ فکر مند تھا۔ لیکن اسے یہ امید ضرور تھی کہ آج کی اس ملاقات سے نکلنے والے نتائج دور رس اور تاریخی اہمیت کے حامل ہوں گے اور دونوں فریقوں کے درمیان وقت کے ساتھ ساتھ در آئی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔ وہ اس لمحے کی خوشی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا، جب کنبھ کے دوران ایک سنت نے اس سے ملاقات کر کے کہا تھا کہ ہمارے سات سادھو سنتوں اور وششٹ ہندو جنوں کا ایک وفد حرکت البشر کے امیر سے ملنا چاہتا ہے تو اس نے یہ سوچے بغیر کہ اس راستے میں کس کس طرح کی دشواریاں آسکتی ہیں،

فوراً حامی بھر لی تھی۔ لیکن جب اس نے اس کا ذکر ایجوں کے درمیان کیا تو مختلف زاویوں سے اس تجویز کی مخالفت کی گئی۔ اراکین مجلس عاملہ کا کہنا تھا کہ ایسی کوئی ملاقات مستقبل میں امیر البشر کے تحفظ کے لیے خطرہ بن سکتی ہے اور اس سے ہمارے بہت سے رازہائے سربستہ طشت از بام ہوجانے کا اندیشہ بھی ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہندوؤں کی جانب سے اس طرح کی پیشکش غیر فطری معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس کے پس پشت ان کی کوئی سازش کارفرما ہو۔ اس لیے ہمیں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہیے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ ہم اپنے بنیادی مقصد سے دور ہٹتے جارہے ہیں۔ ہمیں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا ہے نہ کہ ہندوؤں کی دلجوئی۔ غرض جتنے منھ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔ مسعود خاں جانتا تھا کہ اراکین کے اندیشے فطری ہیں لیکن وہ ہندوؤں کی اس پیش قدمی کو سازش ماننے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ اسے ان کے دل کی آواز کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان کی یہ تجویز ہندو مسلم اتحاد کی جانب ایک مثبت قدم ہے، اس لیے اسے شک کی نظر سے نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ لیکن اب چونکہ حرکت البشر سے اس کا راست تعلق نہیں رہ گیا تھا، اس لیے اب نہ تو اس کے پاس اپنے طور پر فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار تھا، اور نہ وہ تنظیم پر کوئی دباؤ ڈال سکتا تھا۔ بس وہ اتنا ہی کرسکتا تھا کہ 'خدام ملک وملت' کی جانب سے حرکت البشر کے ارباب حل وعقد سے اس ملاقات کو منظوری دینے کی درخواست کرے، تاکہ ہندوؤں کے اس وفد کی امیر البشر سے ملاقات ممکن ہوسکے۔

اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ہونے والی نشست میں مسعود خاں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ لوگوں میں اس تجویز پر اتفاق رائے نہیں تھا۔ اب اسے اتفاق کہیے یا مسعود کی خوش نصیبی کہ اسی وقت اس کے موبائل پر خود امیر البشر سے بات کرنے کا سگنل دکھائی دیا۔ اس نے ان سے بات کی اور انھیں میٹنگ کی پیش رفت کی صحیح صورت حال سے آگاہ کردیا۔ امیر البشر نے بہ نفس نفیس اس کی اس تجویز کو فوراً منظور کرتے ہوئے اسے ملاقات کی تاریخ طے کرنے کی ہدایت دی اور اس طرح مسعود اور اراکین مجلس عاملہ کا یہ مسئلہ بخیر وخوبی حل ہوگیا۔ اور آج وہ دن آگیا تھا جب سادھوسنتوں کا یہ وفد اور امیر البشر اور ان کے ساتھ کچھ علمائے دین ایک محفوظ مقام پر آمنے سامنے تھے۔ حرکت البشر کے مجاہدین نے اس عمارت کے باہر حفاظت کے سخت ترین بندوبست کیے ہوئے تھے۔

'ایک اور بات کہہ دینا ہم آوشیک سمجھتے ہیں کہ ہم سدبھاونا کے ساتھ اس بھینٹ کے اچھک

ہیں اور من سے چاہتے ہیں کہ اس دیش میں ہندو اور مسلمان اس طرح مل جل کر رہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے نہ کوئی بھے نہ رہے اور نہ دونوں کے نجی اور دھارمک کاریہ کلاپوں میں دوسرا کوئی بادھا تپن کرنے۔ سوامی آشیش پرانی نے کہا۔

'ہمارے مذاکرات کے درمیان انشاء اللہ یہ سارے مسائل آئیں گے۔ امیر البشر نے اپنا نرم لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔' اور مجھے امید ہے کہ ہماری یہ ملاقات نتیجہ خیز ثابت ہوگی'۔ انھوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے اراکین وفد سے کہا۔' میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے جو شکایات ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق ناواقفیت سے ہے۔ مثلاً ہندوستانی مسلمان عام طور پر یہاں رہنے والے ہندوؤں کو کافر سمجھتے ہیں، جو غلط ہے۔ کفر خدا سے انکار ہے اور یہاں کے ہندو بہر حال خدا کے منکر نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے دلوں میں یہ خوف جاگزیں ہو گیا ہے کہ یہاں کی اکثریت انھیں ہندوستان میں رہنے دینا نہیں چاہتی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی باتیں کرنے والے ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں اتنی کم ہے کہ انھیں حوالے کے طور پر استعمال کرنا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ان کے مقابلے میں یہاں ان ہندوؤں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اب مسلمان ہندوستان کی حقیقت ہیں اور اس ملک پر ان کا بھی حق ہے۔ ظاہر ہے اگر ہم اس ابر آلود مطلعے کو صاف کر دیں تو منظر بہت واضح ہو جائے گا اور بہت سی غلط فہمیاں اپنے آپ دم توڑ دیں گی'۔

'آپ کا یہ آکلن کچھ سیما تک ہی ٹھیک ہی مہاشے'۔ پنڈت آلوک ناتھ ترپاٹھی بولے۔' ہندوؤں کے من میں مسلمانوں کو لے کر جو شنکائیں ہیں، وہ سب کی سب نرادھار نہیں ہیں، کچھ تتھیہ بھی ہیں ان میں'۔

'ہم انھیں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں'۔ امیر کی جانب سے اب کی بار مولانا عظمت اللہ ندوی نے جواب دیا۔' بہتر ہوگا کہ آج کی گفتگو کا آغاز آپ ہی کریں اور ان تمام مسائل کو سامنے لے آئیں جو آپ کے نقطۂ نظر سے ہندوؤں کی فکر مندی کا سبب بن رہے ہیں'۔

پنڈت آلوک ناتھ ترپاٹھی سنبھل کر بیٹھے اور اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔' مترو، ایک بات صاف کر دوں کہ ہم جو باتیں یہاں کریں گے ان میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو ہمارے

دلوں کو دکھا جائیں لیکن سمت بھارت کو شانتی کی بھینٹ دینے کے لیے ہمیں آج اپنے اندر وہ ساہس جٹانا ہی ہوگا کہ ان تھیوں کو سن سکیں اور ان کا مناسب اُتر دے سکیں۔' اس کے بعد وہ اصل موضوع پر آتے ہوئے بولے۔ 'پہلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنے کو الگ قوم سمجھتے رہے ہیں اس لیے وہ راشٹر کی مکھیہ دھارا میں نہیں آئے۔'

'قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں'۔ مولانا عظمت اللہ ندوی نے سلسلہ کلام کو درمیان میں روکتے ہوئے کہا۔ 'بہتر ہو کہ ہم سوالوں کو طویل نہ کریں۔ اور ہر ہر سوال کے فوراً بعد اس کا جواب سن لیں۔ اس طرح ہمارا وقت بھی بچے گا اور ہم کسی طرح کی تلخ کلامی سے بھی بچ سکیں گے۔'

'اچھا بچھاؤ ہے'۔ سوامی سرودانند نے اس تجویز کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ 'اچھا ہو کہ مولانا پہلے اسی کے بارے میں کچھ کہیں۔'

مولانا نے کہنا شروع کیا۔ 'وہ لوگ جو ایسا سوچتے ہیں وہ دراصل 'قوم' اور 'ملت' دونوں الفاظ کو آپس میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔ قوم سے مراد ایک ہی جغرافیائی خطے میں رہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ مسلمان دوسرے لوگوں کی طرح ہندوؤں کے ساتھ ایک ہی جغرافیائی خطے میں رہتے ہیں اس لیے الگ قوم نہیں ہیں، نہ ان کا ایسا کوئی دعویٰ ہے۔ ہاں وہ خود کو ایک ملت ضرور تصور کرتے ہیں۔ اور ملت سے مراد ایک ہی عقیدے کی پیروی کرنے والے لوگ ہوتا ہے۔ خود ہندوؤں میں ایسی کئی ملتیں ہیں جو آپس میں مل جل کر رہتی ہیں۔ اگر ہندو چاہیں تو مسلمانوں کو ایک علاحدہ ملت تسلیم کر لینے کے باوجود ان کے ساتھ مل جل کر رہنے کا طریقہ تلاش کر سکتے ہیں۔'

'قرآن میں ہنسا کو پروتساہن دیا گیا ہے، اس بات سے ہندو سدیو بھے بھیت رہتے ہیں کہ جانے کب کون مسلمان پنیہ کمانے کے چکر میں ان کا ودھ کر دے۔ اس کے وروودھ میں آپ کیا کہیں گے۔' اس بار منشی شونارائن نے سوال اٹھایا۔

'اسے تشدد کی حوصلہ افزائی نہیں کہا جا سکتا منشی جی۔' اس بار خود امیر البشر نے جواب دینے کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ انھوں نے کہا۔ 'دنیا کے تمام مذاہب نیکیوں کے فروغ اور برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے تلوار اٹھانے کی بات کرتے ہیں۔ ہندو دھرم میں بھی ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔ اب اگر راون کے خلاف رام کی جنگ کو یا کوروؤں کے مقابل پانڈوؤں کے دفاع کو تشدد کی حوصلہ افزائی کہا

جائے گا تو پھر اس دنیا سے باطل کو مٹانے کا آخر راستہ ہی کون سا بچتا ہے۔ تمام مذاہب کی طرح اسلام بھی باطل کے خلاف حق کو نبرد آزما ہونے کا حکم دیتا ہے۔ اور یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ دراصل یہ غلط فہمی ہماری موجودہ سیاست کی دین ہے۔ ہم یوں تو گاندھی جی کے عدم تشدد کے پیغام پر یقین رکھتے ہیں لیکن عملاً خود اکثر میدانوں میں اس پر کاربند نہیں رہ پاتے۔ آخر گاندھی جی کے ملک میں فوج کی ضرورت کیوں پڑتی ہے۔ اسی لیے تاکہ ہماری سرحدوں پر بری نظر رکھنے والے عدم تشدد پر یقین نہیں رکھتے، اس لیے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے عدم تشدد کو خیر باد کہنا ہماری بھی مجبوری بن جاتی ہے۔ قرآن اور اسلام کا پیغام بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ بس اسے مخالفانہ جذبے کے بجائے ہمدردی سے دیکھے جانے کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت سے بھلا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ جب تک دنیا میں باطل ہے عدم تشدد کامیاب نہیں ہو سکتا'۔

'اور یہ جو قرآن میں ہندوؤں کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے'۔ منشی شو نارائن نے ایک اور بات سامنے رکھی۔ 'قرآن میں یہ حکم ایک جگہ نہیں کئی جگہ آیا ہے'۔

'کہاں آیا ہے میرے بھائی'۔ مولانا عظمت اللہ نے فوراً جواب دیا۔ انھوں نے قرآن کے ہندی ترجمے کی ایک نقل ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا۔ 'اس کا مطالعہ کر لیجیے گا تو باتیں خود بہ خود سمجھ میں آ جائیں گی۔ اس میں کہیں بھی اس طرح کی بات نہیں کہی گئی ہے، یہ محض ایک افواہ ہے جو ہمارے بدخواہوں نے اڑا رکھی ہے'۔

'لیکن ہم نے تو اپنے یہاں لکھی گئی پستکوں میں یہی پڑھا ہے'۔ منشی جی نے کہا۔ 'کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ کے لوگ ان آیتوں کو توڑ مروڑ کر اپنے کام کا ارتھ نکال لیتے ہوں اور ہمارے لوگ اپنے کام کا'۔

'ہاں اکثر ایسا ہو رہا ہے'۔ مولانا نے کہا۔ 'لیکن قرآن کا اصل متن ساری دنیا میں ایک ہے۔ خواہ آپ اب سے چندرہ سو سال پہلے کا قرآن دیکھیں یا ابھی چھپا ہوا، دونوں میں ایک حرف کا بھی فرق نہیں ملے گا آپ کو۔ اس لیے اگر ترجمے میں کوئی شخص کچھ بے ایمانی کر رہا ہے تو ہم اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے تھوڑا وقت تو دینا ہی ہوگا'۔

یہ نشست چار گھنٹے تک چلی۔ ایسا لگا کہ ایک ہی دن میں ساری شکایات کا ازالہ ممکن نہیں

ہے۔ اس لیے باقی باتوں کو آئندہ کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ پھر بھی باتیں بہت سی ہوئیں۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کی جانب سے جو شکایتیں ہیں وہ بھی نہایت تفصیل سے سامنے آئیں اور مسلمان ہندوؤں سے کس طرح کا خطرہ محسوس کرتے ہیں وہ بھی بیان کیا گیا۔ دونوں فریقوں نے نہایت سنجیدگی سے ایک دوسرے کے سوالوں کے مناسب جواب دینے کی کوشش کی۔ مسعود گفتگو کے دوران برابر وہاں موجود رہا۔ لیکن گفتگو میں مداخلت کرنا اس کے حد اختیار سے باہر تھا، اس لیے وہ خاموشی سے بیٹھ کر اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے خوشی تھی کہ بات چیت بڑی حد تک کامیاب رہی تھی۔ وہ مسرور تھا کہ اس کی کوشش رائگاں نہیں گئی۔ یہ بات بھی امید افزا تھی کہ دونوں فریقوں نے اس طرح کی بات چیت کو آئندہ بھی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

سینتالیس

ضرغام حیدر دلی میں تھا۔ مظفر علی کے فرضی نام سے اس نے کناٹ پلیس کے ہوٹل جن پتھ کی ساتویں منزل پر ایک کمرہ کرایے پر لے رکھا تھا۔ آج شام پانچ بجے اسے وگیان بھون میں حکومت ہند کی جانب سے منعقد کی جانے والی اُس نشست میں شرکت کرنی تھی، جس کا موضوع 'عالمی امن عامہ کی بحالی' تھا اور جس میں کئی ممالک کے مندوبین شرکت کرنے والے تھے۔ اس کے لیے داخلہ پاس مہیا کرا دیا گیا تھا۔ حرکت البشر کو اطلاع ملی تھی کہ اس نشست میں جن مسائل پر غور و خوض ہونا تھا، ان کے نتائج ہندوستانی مسلمانوں پر بھی اثر انداز ہوں گے۔ چنانچہ اس کے شعبہ فکر کے ارکان عاملہ نے فیصلہ کیا تھا کہ ضرغام حیدر خود اس نشست میں شرکت کرے اور وہاں ہونے والی تمام باتوں کو غور سے سن کر امیر البشر کو اپنی رپورٹ دے۔

حرکت البشر نے ضرغام حیدر کی صلاحیتوں کو بخوبی پہچان لیا تھا۔ جب سے اس نے اس تحریک میں باقاعدہ رکنیت اختیار کی تھی تقریباً ہر سال اس کا عہدہ بدلتا رہا۔ اور ہر بار اسے پہلے سے بہتر عہدہ اور پہلے سے اہم ذمے داری سونپی جاتی رہی۔ لیکن کبھی ایسا نہ ہوا کہ اس کے کسی عمل سے، اس کے کسی منصوبے سے حرکت البشر کو کوئی نقصان اٹھانا پڑا ہو۔ چنانچہ اب ضرغام حیدر حرکت البشر کا ایک ایسا آزمودہ سپاہی تھا جسے جب اور جہاں چاہیں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اتنی اہم نشست

میں شرکت کے لیے قرعہ فال اس کے نام نکلنا تنظیم میں کسی کے لیے بھی حیرت کا سبب نہیں تھا۔ ویسے بھی اب وہ امیر البشر احمد عبداللہ الہندی کا ذاتی مشیر تھا اور یہ عہدہ امیر البشر کے عہدے کے بعد سب سے اہم تصور کیا جاتا تھا۔

ضرغام کو آج کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس کے پاس فی الحال کوئی دوسرا کام بھی نہیں تھا۔ حسب معمول صبح اٹھ کر اس نے فجر کی نماز ادا کی تھی اور اب وہ اپنے بستر پر دراز قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' کا مطالعہ کر رہا تھا۔ علم و ادب سے اس کی دلچسپی اب بھی برقرار تھی۔ مطالعہ اب بھی اس کے روزمرہ کا معمول تھا۔ ہاں اس کے مطالعے کی اب کوئی متعین جہت نہیں تھی۔ اس جیسا انسان شاید کسی ایک موضوع سے بندھ کر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور ویسے بھی اسے کون ناقد اور محقق بننا تھا، جو اسے اس کی فکر ہوتی۔ چنانچہ وہ مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ دنیا کے مختلف مذاہب کے بارے میں جاننے سے اسے خصوصی دلچسپی تھی۔ شعر و سخن سے اسے اب بھی لگاؤ تھا۔ وہ اب بھی شعر کہتا تھا، بھلے ہی اب اس کا موقع نہ مل رہا ہو کہ وہ اپنے اشعار کسی کو سنائے اور داد حاصل کرے۔ البتہ اس نے اپنی تشفی کے لیے یہ ضرور کیا تھا کہ 'ظفر فروشی' کے فرضی نام سے اپنی تخلیقات مختلف رسائل میں اشاعت کے لیے بھیجتا رہتا تھا۔ اردو شعر و ادب کی دنیا میں اب یہ نام اچھا خاصا جانا پہچانا تھا۔

اس نے کافی کا آرڈر دے رکھا تھا اس لیے بیرونی دروازہ ابھی کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں بیرا آیا اور نہایت سلیقے سے کافی کا پاٹ سائڈ ٹیبل پر سجا کر چلا گیا۔ اب اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ اسے کچھ ضروری فون کرنے تھے۔ اس کے لیے اس نے متعینہ احتیاطی انتظامات کیے اور باری باری سے دو تین جگہ فون پر بات چیت کی۔ اس کی آخری بات چیت خاصی طویل رہی۔ ابھی اس نے فون بند کر کے کافی کی جانب توجہ کی ہی تھی کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ حیران ہوا کہ اس وقت بھلا اسے کون فون کر سکتا ہے۔ جب تک کوئی بہت ضروری کام نہ ہو تنظیم کے کارکنوں سے، جب وہ کسی خاص مہم میں سرگرم ہوں، رابطہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر نمبر دیکھا۔ نمبر نیا تھا۔ اب اس کی حیرانی اور بھی بڑھ گئی۔ ابھی وہ اس سلسلے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے بات کرنی چاہیے یا نہیں کہ موبائل کی گھنٹی بجنی بند ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک موبائل کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر اسے اٹھا کر اس نمبر کو غور سے دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ فون حرکت البشر کی لکھنؤ شاخ

سے آیا تھا۔ اب اسے تشویش ہوئی۔ لکھنو میں اس کا گھر تھا۔ جب سے اس نے لکھنو چھوڑا تھا آج تک ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ عام طور پر وہ ان کاموں سے بھی گریز کرتا تھا جن کا تعلق لکھنو سے ہو۔ پھر اب وہاں سے یہ فون اس کے پاس کیوں آیا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ موبائل کی گھنٹی پھر بجی۔ اس بار اس نے بات شروع کی۔ اسے دوسری طرف سے ایک گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا' کیا مجھے مشیر البشر سے گفتگو کا شرف حاصل ہو رہا ہے'۔ فون کرنے والا شخص اتنی گھبراہٹ میں بھی حرکت البشر کے آداب کو فراموش نہیں کر رہا تھا۔

'ہاں'۔ ضرغام حیدر نے مختصر سا جواب دیا۔

'مجھے آپ تک یہ اندوہ ناک اطلاع پہنچانے کی ذمے داری سونپی گئی ہے کہ ابھی ابھی صبح پانچ بجے آپ کے والد محترم کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون'۔

'انا للہ و انا الیہ راجعون'۔ ضرغام کے منھ سے بے ساختہ نکلا اور اس کے ساتھ ہی اس نے فوراً فون کاٹ دیا۔

کم از کم فون رکھتے وقت تک اسے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ والد کے انتقال کی یہ خبر اس کے لیے اذیت ناک بھی ہو سکتی ہے۔ اسے اس موضوع پر سوچنے کی اب عادت بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن چند لمحوں میں ہی اس کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ وہ تو سمجھنے لگا تھا کہ اب ان نازک احساسات کی اس کی زندگی میں کوئی جگہ ہی نہیں رہ گئی ہے۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط تھا۔ اب وہ اپنے والد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن اس وقت اسے اپنے والد کی ایک بھی ایسی بات یاد نہیں آ رہی تھی جس نے اس کی زندگی دو بھر کر رکھی تھی۔ اسے یاد آ رہا تھا تو صرف گھر سے وداع ہونے کا وہ لمحہ جب اس کے والد نے زندگی میں پہلی بار اس سے نرمی اور محبت سے بات کی تھی۔ انھوں نے پہلی بار اسے بیٹے کی طرح مخاطب کیا تھا۔ گھر چھوڑنے کے بعد اس نے کبھی اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ سوچتا کہ والد کے مزاج میں آنے والی اس تبدیلی کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ اب اتنی مدت بعد آج یہ بات اسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ اس مسئلے پر اب غور کر رہا تھا کہ والد کا مزاج اچانک کیوں بدل گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ آیا ہو یا نہ آیا ہو لیکن اب اسے والد کے نام سے چڑھ بہر حال نہیں ہو رہی تھی۔ اچانک اس نے کچھ فیصلہ کیا۔ اس نے موبائل

اٹھایا اور امیر البشر کا نمبر ڈائل کر کے ان سے مخاطب ہوا۔' ضرغام۔

'اللہ جلیل۔۔۔۔کیا تمھیں احساس ہے کہ تم احکامات حرکت البشر کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔' امیر البشر کی غراتی ہوئی آواز آئی۔

'اگر امیر البشر اجازت دیں تو میں ہنگامی طور پر کچھ ذاتی نوعیت کی باتیں کرنا چاہتا ہوں'۔ ضرغام کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

'بولو'۔

'ابھی ابھی مجھے لکھنو شاخ سے اطلاع ملی ہے کہ وہاں میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے'۔ یہ کہتے کہتے ضرغام کی آواز بھرا گئی تھی۔' میں چاہتا ہوں کہ ان کی تدفین میں شرکت کروں'۔

جواب میں دوسری جانب کچھ دیر خاموشی رہی۔ ضرغام کی گھبراہٹ لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے پیش نظر جو کام تھا وہ غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ خدا جانے اسے لکھنو جانے کی اجازت ملے بھی یا نہیں۔ جواب میں تاخیر اس کے دل کی دھڑکن کو بڑھا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسے اب کسی بھی حالت میں والد کے انتقال پر اپنے گھر جانا ہے۔ بالآخر چند ثانیوں کے بعد اس نے موبائل پر دوبارہ امیر البشر کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہے تھے۔' ٹھیک ہے، تم تیاری کرو اور لکھنو کی فلائٹ سے روانہ ہو جاو۔ آدھے گھنٹے کے اندر کوئی دوسرا رکن آکر تم سے تمھاری ذمے داریوں کا چارج لے لے گا۔ اسے تمام ہدایات سے واقف کرانا تمھاری ذمے داری ہے'۔ امیر البشر کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔' اور ہاں ضرغام حیدر مجھے بھی اپنے غم میں برابر کا شریک سمجھو'۔ اس کے ساتھ ہی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

اڑتالیس

ایر پورٹ سے پری پیڈ ٹیکسی لے کر وہ سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے اپنا حلیہ اس حد تک تبدیل کر لیا تھا کہ کوئی اسے آسانی سے پہچان نہیں سکتا تھا۔ پھر وہ اتنی مدت کے بعد لکھنو پہنچا تھا کہ اس کا پہچانا جانا ویسے بھی مشکل تھا۔ اب اسے اس کی بد قسمتی ہی کہا جائے گا کہ اتنی زحمتیں اٹھانے کے باوجود گھر پہنچنے سے پہلے ہی اس کے والد کی تدفین عمل میں آچکی تھی۔ گھر

والوں کو بھلا اس کی امید بھی کہاں تھی کہ وہ یہاں آ سکتا ہے۔ یہاں پہنچتے ہی یہ دیکھ کر وہ حیران ہوا کہ اب اس کا گھر ایک شاندار حویلی کی شکل اختیار کر چکا تھا، جس سے اسے یک گونہ طمانیت کا احساس ہوا۔ اس نے تنہائی میں اپنے گھر والوں سے ملاقات کی اور ان سے اپنی شناخت بتائی۔ سب کو تسلی تشفی دی اور اشاروں میں انھیں ہدایت کی کہ وہ اس کے بارے میں کسی سے کوئی بات چیت نہ کریں اور نہ کسی سے یہ بتائیں کہ میں کون ہوں۔ اس کے احسانات سے دبے اور اس کے تحفظ کے لیے فکرمند گھر والے اس کی ہر بات کو اس طرح مان رہے تھے جیسے وہ اس کے رشتہ دار نہ ہو کر غلام ہوں۔ ضرغام حیدر کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن ان رسمیات کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ مجبور بھی تھا۔ اپنی شناخت واضح کرنے کا مطلب تھا کہ وہ کچھ نئی مشکلات میں مبتلا ہو جائے۔ ویسے اس کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ حرکت البشر کی لکھنو شاخ کا حفاظتی عملہ ایرپورٹ ہی سے اس کے تعاقب میں تھا اور اس کی حفاظت کی ساری ذمے داری نبھا رہا تھا۔ انھیں خود امیر البشر کی جانب سے ہدایات ملی تھیں کہ ضرغام کے تحفظ کا بندوبست اس طرح کیا جائے کہ خود اسے بھی اس کا احساس نہ ہونے پائے۔

اس کی مجبوریوں کا ذکر سننے کے باوجود گھر کے لوگ مصر تھے کہ اب وہ مرحوم کی مجلس میں شرکت کرنے کے بعد ہی لکھنو سے جائے۔ لیکن ضرغام اس کے لیے تیار نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ کئی ضروری کاموں کو چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ دو دن بعد اسے تریویندرم جانا تھا جہاں مسلم نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت حرکت البشر کی رکنیت اختیار کرنے والی تھی۔ اگلے ہفتے حیدرآباد میں اسے ایک اہم کانفرنس میں شرکت کرنی تھی۔ اور اس کے تین دن بعد کلکتہ کے مسلمانوں سے اس کی ملاقات طے تھی، جس میں ان کے مقامی مسائل پر تبادلہ خیال کر کے حل تک پہنچنے کی کوشش کی جانی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے حالات میں وہ کیا کرے۔ ایک طرف اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ رک جائے دوسری طرف اس کی اپنی ذمے داریاں تھیں جو اسے ایسا کرنے میں مانع تھیں۔ چونکہ وہ تدفین میں شرکت نہیں کر پایا ہے اس لیے کم از کم مجلس میں شرکت کرنا اسے ضروری لگ رہا تھا۔ اس نے کافی غور و فکر کے بعد امیر البشر کو اس نئی صورت حال سے آگاہ کیا۔ انھوں نے خلاف معمول نہایت نرمی اور سنجیدگی سے اس سے کہا کہ وہ اطمینان سے اپنے تمام خانگی کاموں کو انجام دے اور اپنی سہولت سے واپس

آ ئے۔ انھوں نے تاکیداً کہا کہ وہ اس وقت تنظیم سے متعلق کاموں کے لیے فکرمند نہ ہو، اس کا انتظام کر دیا جائے گا۔ امیر البشر کے اس جواب سے اسے کچھ اطمینان نصیب ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں تنظیم کا کوئی کام رک نہیں سکتا۔ اسے معلوم تھا کہ اس درمیان نئے لوگوں کا تقرر ہو چکا ہوگا جو اس کی ذمے داریوں کو پورا کریں گے۔ اس لیے وہ گھر والوں کے ساتھ مل کر اطمینان سے مجلس کے انعقاد کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

محلے پڑوس کے لوگ اس اجنبی کو، جسے انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن انھیں اس کا شبہ تک نہیں ہوا کہ یہ ضرغام حیدر ہو سکتا ہے۔ جب انھوں نے گھر والوں سے اس کے بارے میں کھوج بین کرنی چاہی تو اس کی بہنوں نے بس یہ بتایا کہ یہ ہمارے خالہ زاد بھائی ہیں جو ابو کے انتقال کی خبر سن کر ایران سے یہاں تشریف لائے ہیں۔ اس سے زیادہ پوچھ تاچھ کا یہ محل بھی نہیں تھا اور محلے والوں کو بھی اس سے زیادہ کی فکر نہیں تھی۔ ایسے موقعوں پر انھیں شہادت حسین کو یاد کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی، اس لیے وہ مطمئن نہ ہوتے تو بھی خاموش رہتے۔

البتہ ایک شخص تھا جو ضرغام حیدر کو پہچان گیا تھا۔ وہ خلاف توقع اسے یہاں دیکھ کر حیران بھی تھا۔ یہ اس کا دوست عبدالرحمٰن انصاری تھا، جو اس کی غیر موجودگی میں اس کے والد کے انتقال سے متعلق تمام کاموں کو اس طرح انجام دے رہا تھا جیسے وہ اس کے اپنے والد رہے ہوں۔ گھر کے لوگ بھی اسے اپنوں سے علاحدہ نہیں سمجھ رہے تھے۔ ضرغام حیدر یہ سب دیکھ رہا تھا، لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اس سے مل کر اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔ ضرغام کو پہچاننے میں عبدالرحمٰن کو ذرا بھی وقت نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ چونکہ اس کی پراسرار سرگرمیوں سے واقف تھا، اس لیے خاموش تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ خود ضرغام نے بھی اسے پہچان لیا ہے اور مصلحتاً وہ بھی اپنی شناخت کو پوشیدہ رکھے ہوئے ہے۔ ایک رضاکار کی حیثیت سے اب عبدالرحمٰن حرکت البشر کے اصول وضوابط کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا، اس لیے کوئی ایسی حماقت نہیں کر سکتا تھا، جس سے کوئی مشکل کھڑی ہو جائے۔ البتہ وہ اس بات سے بہت خوش تھا کہ ضرغام حیدر اپنے والد کے انتقال کی خبر سن کر گھر آیا ہے۔ اپنے طور پر وہ اس کی امید چھوڑ چکا تھا۔ وہ خود ضرغام کے والد کی تدفین میں شرکت کے لیے

بنارس سے آیا تھا اور اب ضرغام کے گھر والوں کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر مجلس کے انعقاد تک یہیں رکنے والا تھا۔ اس کا قیام امین آباد کے دیپ اودھ ہوٹل میں تھا، جو یہاں سے پیدل کی دوری پر تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان ضروری کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ خفیہ طور پر ضرغام سے ملنے کی ایک کوشش ضرور کرے گا۔ وہ اسے ایسی بہت سی باتیں بتانا چاہتا تھا جن کا تعلق اس کے مرحوم والد کی تبدیلی مزاج سے تھا۔

اُنچاس

لکھنؤ اسٹیشن پر دو بم دھماکے

لکھنو: چار باغ ریلوے اسٹیشن پر شکروار کو ہوے بم دھماکوں سے یاتریوں میں دہشت پھیل گئی. لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے. احتیاطی قدم اٹھاتے ہوے ریل ادھیکاریوں نے تتکال یاتری وشرامالیہ اور مکھیہ یاتری بھون پوری طرح خالی کرا لیا. بم ڈسپوزل دستے اور ڈاگ اسکواڈ نے پورے اسٹیشن پریسر کی سگھن تلاشی لی. وسپھوٹ کرنے والے یووک کو ایک ہوٹل سے حراست میں لے لیا گیا ہے. اس سے پوچھ تاچھ جاری ہے.

حال ہی میں اسٹیشن اور شہر کے کئی مہتو پورن استھلوں کو بم وسپھوٹ سے اڑا دینے کی آتنکی دھمکی ملی تھی. اس کے مد نظر راجدھانی میں چوکسی بھی بڑھا دی گئی تھی. لیکن، آج شام دو استھانوں پر ہوے دھماکوں سے پرشاسن کی ساری سترکتا دھری کی دھری رہ گئی.

پہلا وسپھوٹ اسٹیشن اور بس اسٹینڈ کے درمیان جی ٹی روڈ پر ایک ہوٹل کے پاس ہوا اور دوسرا دھماکا اسٹیشن پریسر میں ہی ہوا. وسپھوٹ کے بعد پریسر میں گھرا دھواں پھیل گیا. دھماکے کی آواز سنتے ہی پولیس بھی موقعے پر پہنچ گئی. راجکیہ ریلوے پولیس کے تھانہ پربھاری نے تتکال بم ڈسپوزل دستے اور

ڈاگ اسکواڈ کو بلا لیا۔ سوچنا اکائی کے نریکشک نے ضلع پولیس کو ساری جانکاری دے دی۔ ریلوے سرکشا بل کے پربھاری نے پریسر سے بارہ سندگدھ لوگوں کو بھی گرفتار کیا ھے۔ دیر رات تک ان سے پوچھ تاچھ کی جا رہی تھی۔

اس معاملے میں ہوٹل سے پکڑے گئے یوک نے اپنا اپرادھ قبول کر لیا ھے۔ اسٹیشن پریسر کے اتی رکت نئی دہلی اور بنارس جانے والی دو گاڑیوں کی بھی تلاشی لی گئی۔ جی آر پی تھانہ پربھاری نے بتایا کہ معاملے کی گہن چھان بین کی جا رہی ھے۔

پچاس

لکھنو کے اس سفر میں بھی عبدالرحمن کے روزمرہ کے معمولات میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ وہ یہاں بھی فجر سے کچھ پہلے اٹھ رہا تھا، تیار ہو کر قریب کی مسجد میں جماعت کے ساتھ فجر کی نماز ادا کرتا تھا اور نماز کے بعد مسجد سے نکل کر خالی سڑک پر تقریباً دو کلومیٹر تک سیر کے لیے نکل جاتا تھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ہوٹل میں چائے ناشتے کا آرڈر دیتا تھا۔ اس بار اس کی لکھنو آمد اس کے لیے کئی زاویوں سے پریشان کن ثابت ہوئی تھی۔ ایک تو اس کا ساڑی کا کاروبار ان دنوں مندی کے دور سے گذر رہا تھا اور ایسے میں اس کا ایک ہفتے تک بنارس کے باہر رہنا مناسب نہیں تھا۔ دوسرے اس نے گھر والوں سے کہا تھا کہ وہ اپنے دوست کے والد کی تدفین میں شرکت کر کے کل تک واپس آ جائے گا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد صورت حال کافی بدل گئی تھی۔ ضرغام حیدر کی والدہ نے خود اس سے درخواست کی تھی کہ تین دن اور ٹھہر جائے اور سیوم کی مجلس میں شرکت کے بعد واپس ہو۔ چنانچہ اپنے پروگرام کے مطابق اس کی واپسی ممکن نہ رہی تھی۔ حالانکہ اس نے فون پر گھر والوں کو مطلع کر دیا تھا، لیکن اس طرح رکنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ موقع ایسا تھا کہ وہ مروت میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر خلاف توقع اس نے وہاں ضرغام حیدر کو دیکھ لیا تھا اور اس کے اندر یہ خواہش سر ابھار رہی تھی کہ بنارس لوٹنے سے پہلے اسے ایک بار اپنے پرانے دوست سے ملاقات کرنی چاہیے۔ حالانکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا دوست اب اس صورت حال میں اس سے ملنا پسند بھی کرے گا یا نہیں۔ کیونکہ اب وہ حرکت البشر کا ایک بڑا عہدے دار تھا اور وہ معمولی

رضا کار۔ آج صبح سے ہی اس کی آنکھ پھڑک رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس بھی اسے متنبہ کر رہی تھی کہ جیسے آج کچھ ایسا ہونے والا ہے جو اس کے حق میں اچھا ثابت نہیں ہوگا۔ لیکن اس نے ان تمام باتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اب وہ اطمینان سے بیٹھ کر ناشتہ کر رہا تھا جو ابھی ابھی ہوٹل کا بیرا اس کے سامنے کی میز پر سجا کر گیا تھا۔

ناشتہ ختم کرنے کے بعد ابھی اس نے چائے بنانی شروع ہی کی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے سمجھا کہ شاید بیرا کسی کام سے آیا ہوگا، اس لیے اس نے کہا۔ "دروازہ کھلا ہے، اندر آ جاؤ"۔

دروازہ کھلا۔ لیکن وہاں بیرا نہیں پولیس کے کچھ جوان کھڑے تھے۔ عبدالرحمن ان کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے لگا کہ شاید مصیبت کی وہ گھڑی آ چکی ہے جس کے علائم صبح سے ظاہر ہو رہے تھے۔ وہ اندر آئے۔ ایک انسپکٹر آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "یو آر انڈر اریسٹ مسٹر عبد الرحمن"۔ پھر اس نے اطمینان سے پاس پڑی کرسی پر اپنا بیت ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ خود ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن تک چلے چلیں گے تو ہم آپ کے ساتھ کوئی برا برتاؤ نہیں کریں گے، ایتھا ہم آپ کو گرفتار کر کے لے چلیں گے"۔

عبدالرحمن اس غیر متوقع صورت حال سے واقعی گھبرا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے اور ان حالات میں اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ پولیس اسے آخر کیوں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اس نے تو کوئی جرم کیا نہیں۔ ویسے بھی وہ سیدھا سادا بزنس مین تھا اور عام طور پر پولیس والوں سے خوفزدہ رہا کرتا تھا۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، لیکن اس وقت اس کے پاس کہنے، کرنے کے لیے اور کچھ تھا بھی نہیں سوائے اس کے کہ وہ انسپکٹر کے حکم کی تعمیل کرے۔ چنانچہ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں تیار ہوں"۔

"ویری گڈ"۔ انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ چائے پی لیجیے، ہمیں اتنی جلدی بھی نہیں ہے"۔

لیکن وہ چائے کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ چاہتا بھی تو گھبراہٹ کے اس عالم میں چائے اس کے حلق کے نیچے نہیں اتر سکتی تھی۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ پولیس کے ساتھ تھانے چلا جائے اور وہاں جو کچھ ہونے والا ہے اس کا مقابلہ کرے۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت اس کی گرفتاری کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ کیا انھیں یہ خبر لگ چکی ہوگی کہ ضرغام حیدر بھی اپنے والد کی تدفین میں یہاں آیا ہے؟ کیا ضرغام

حیدر کو بھی گرفتار کرلیا گیا ہوگا؟ کیا انھیں یہ بھی خبر مل چکی ہوگی کہ میرا تعلق حرکت البشر سے ہے؟ یقینی طور پر وہ کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔ البتہ وہ گھبرا ضرور رہا تھا کہ پولیس والے جو چاہیں گے، الزامات لگا کر اسے پھنسا دیں گے۔ لیکن اس وقت اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اٹھا اور جوانوں کے جلو میں دروازے کی طرف بڑھا۔ لفٹ سے نیچے اتر کر اس نے کاؤنٹر پر کہا کہ کمرے میں موجود اس کے سامان کو حفاظت سے رکھ دیا جائے۔ کاؤنٹر پر بیٹھا شخص عبدالرحمن کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اسے پولیس کے ساتھ دیکھ کر وہ حیران تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عبدالرحمن ایسا شخص نہیں ہے جو پولیس کو مطلوب ہو۔ اس نے جواب میں کہا کہ آپ اطمینان سے جب چاہیں آئیں، یہاں آپ کا سارا سامان محفوظ رہے گا۔ اس کے بعد باہر نکل کر وہ پولیس کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی اسے لے کر پولیس اسٹیشن کی جانب چل پڑی۔

تھانے پہنچنے کے بعد اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا گیا۔ اسے لے جا کر ایس او کے کمرے میں بٹھایا گیا۔ تھانہ انچارج اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ آیا تو عبدالرحمن سے پوچھ تاچھ کا دور شروع ہوا۔

'یہ تو تمھیں پتہ ہی ہوگا کہ تمھیں کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟' اس نے پوچھا۔

'نہیں، مجھے اس کا علم نہیں ہے۔'

'کل نگر میں جو دو بم دھماکے ہوئے، ہمارے مخبروں کی سوچنا کے انوسار اس کے ماسٹر مائنڈ تم ہی ہو۔'

عبدالرحمن یہ سن کر حیران رہ گیا۔ لیکن اب اسے تھوڑا اطمینان بھی ہوا کہ جس واقعے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، دیر سویر اسے اس سے نجات مل ہی جائے گی۔ اس نے کہا: 'یہ سن کر میں حیران ہوں۔ میں سیدھا سادا بیوپاری، بھلا ایسی وارداتوں سے میرا کیا تعلق؟'

'ہم جب بھی کسی کو آتنک وادودھی ابھیان کے انترگت گرفتار کرتے ہیں تو پہلے سب یہی کہتے ہیں۔ لیکن دھیرے دھیرے وہ سب کچھ بتانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تم بھی کچھ بتانے سے پہلے پولیس کا تھوڑا سا سمے برباد کرو گے۔' ایس او کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ 'لیکن میں یہ بتا دوں کہ اس کا پھل اچھا نہیں ہوگا۔'

اس کے بعد اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ دن بھر اسے نہ تو کھانا دیا گیا اور نہ پانی۔ جیسے

اسے اندر بند کر کے لوگ اسے بھول ہی گئے ہوں۔ رات میں ایک دوسرا پولیس انسپکٹر آیا۔ اس نے حوالات کا دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ اس کے اندر آنے کے بعد دروازہ دوبارہ بند کر دیا گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیت تھا اور کمر میں پستول۔ دونوں میں کچھ دیر تکرار چلتی رہی۔ ایک گھنٹے کے بعد جب انسپکٹر باہر نکلا تو عبدالرحمن نے اپنا جرم قبول کر لیا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ اور اس کی چال سے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔

دوسرے دن اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ چونکہ ملزم نے خود ہی اقبال جرم کر لیا تھا اس لیے پولیس کو مزید تفتیش کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ عدالتی کام کاج میں دشواری اس وقت پیش آئی جب لکھنؤ کے تمام چھوٹے بڑے وکیلوں نے بہ یک آواز اس کے مقدمے کی پیروی کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے دن اخباروں میں یہ خبر سرخیوں میں رہی۔ چند ہی روز بعد اسے اطلاع ملی کہ دہلی ہائی کورٹ کی ایک خاتون وکیل اسما حنان نے لکھنؤ آ کر اس کا کیس لڑنے کی پیش کش کی ہے۔ یہ سن کر عبدالرحمن حیران تھا۔ بلکہ اس کے لیے یہ سارا سلسلہ ہی حیران کن تھا۔ لیکن اس حیرانی کے ساتھ ساتھ اس کے اندر اپنی رہائی کی امید بھی جاگی۔ یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی کہ آخر اس خاتون وکیل کو اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہوئی کہ وہ دہلی سے لکھنؤ آ کر ایک اجنبی شخص کا کیس لڑ رہی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو یہ سمجھا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ اب بھی اس دنیا میں ایسے انسان ہیں جو دوسروں کا دکھ درد سمجھتے ہیں اور آگے بڑھ کر ان کی مدد کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

کیس شروع کرنے سے پہلے اسما حنان نے عبدالرحمن سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ عدالتی معاملات سے قطعی نابلد تھا۔ اس لیے اس نے وہ ساری تفصیلات اس وکیل ہی سے پوچھیں کہ عدالت میں اسے کیا کرنا ہے۔ وکیل نے اسے سمجھایا کہ عدالت میں پہلی بات تو تمھیں یہ کہنا ہے کہ میں نے یہ جرم نہیں کیا ہے اور پولیس نے مجھے اس میں زبردستی پھنسا دیا ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ تم نے اقبال جرم کیوں کیا تو بتا دینا کہ انھوں نے مجھے اذیتیں پہنچا کر یہ اقبال جرم کرایا ہے۔ اس نے عبدالرحمن کو جب یہ بتایا کہ حرکت البشر نے ہی پولیس کو فون کر کے اس کو گرفتار کرایا ہے تو وہ حیران رہ گیا۔ لیکن اسما حنان نے جلد ہی اس کی یہ ساری حیرانی دور کر دی۔ اب اسے اپنی گرفتاری پر فخر ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس نے خود گرفتار ہو کر ضرغام حیدر کو بچا لیا ہے۔ اسے گرفتار کرانے کے پیچھے صرف یہ بات تھی کہ شہر میں اچانک بم

دھماکا ہو جانے سے لکھنو کی پولیس مستعد ہو گئی تھی۔ حرکت البشر کے ارباب حل وعقد کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ تحقیق وتفتیش کے اس عمل میں پولیس کی توجہ کہیں ضرغام حیدر کی لکھنو میں موجودگی کی طرف نہ چلی جائے، اس لیے فون کر کے اس مسئلے کو حل کر لیا گیا تھا تا کہ اب پولیس خاموش ہو جائے اور حرکت البشر اپنے اس منصوبے میں پوری طرح کامیاب ہوئی تھی۔

مقدمہ تین ماہ تک چلا۔ اسما حنان نے عدالت میں یہ بات آسانی سے ثابت کر دی تھی کہ جس وقت یہ دونوں بم حادثے ہوئے تھے، ملزم عبدالرحمٰن قبرستان میں اپنے دوست کے والد کی تدفین میں موجود تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ فیصلے میں کچھ وقت ضرور لگا لیکن فیصلہ ہوا تو عبدالرحمٰن کے حق میں ہوا۔ اسے اس الزام سے باعزت طور پر بری کر دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی، اس کی اذیتوں اور اس وقت کے زیاں کے لیے عدالت نے اس سے معافی مانگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی عدالت نے سخت الفاظ میں پولیس کو تنبیہ کی تھی کہ وہ آئندہ اس طرح بے گناہ انسانوں کو پریشان نہ کیا کرے۔

فیصلے کے دن بنارس سے اس کے اعزہ واقارب بھی کافی تعداد میں آئے تھے جو عدالت میں موجود تھے۔ ان لوگوں میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو اس بات پر یقین کر بیٹھے تھے کہ ممکن ہے عبدالرحمٰن نے واقعی یہ کام کیا ہی ہو۔ کیونکہ ان کی نظر میں عبدالرحمٰن کی کئی سرگرمیاں مشکوک اور ان کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ لیکن اب ان سب کو پورا یقین تھا کہ یہ ان کی خام خیالی تھی اور عبدالرحمٰن واقعی بے گناہ تھا۔ وہ نہایت عزت وافتخار کے ساتھ اسے بنارس لے آئے۔ اس کے ساتھ ان لوگوں کا رویہ ایسا تھا جیسے اس نے ملک وملت کے لیے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔ ان اقارب واعزہ کو بھلے ہی اس بات کا علم نہ رہا ہو لیکن عبدالرحمٰن بہرحال جانتا تھا کہ اس نے واقعی ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

اکیاون

نئی دلی: (نج پرتی ندھی دوارا) ادھر کچھ سمے سے بھارت میں ہندو مسلم ایکتا کی اور کچھ مہتو پورن پہل ہوئی ہے پچھلے ورش کنبھ کے اوسر پر ایک مسلم سنگٹھن 'خدام ملک و ملت' نے جس

پرکلر بھل تیرتھ یاتریوں کے لیے سیوا شور استھاپت کرکے ہندوئوں کی اور مترتا کا ھاتھ بڑھایا تھا، اس کا اثر ہندوئوں نے بھی اسی سدبھاونا سے دینا آرمبھ کر دیا ھے۔ اس کرم میں کل اکھل بھارتیہ ہندو وکلس سنگٹھن، ہندو مسلم ایکتا منچ اور نو جاگرتی سانسکرتک ہندو سنستھان کے ایک پرتی ندھی منڈل نے سنیُکت روپ سے بھارت سرکار سے یہ مانگ کی ھے کہ وہ بھوشیہ میں آتنک واد کو دھرم آدھارت ستیہ ماننا چھوڑ کر وستوتہ ایسے سمست سنگٹھنوں کو آتنکی سنگٹھن گھوشت کرے جو کسی بھی پرکار کی سامپردائک دُربھاونا یا اساماجک کریا کلاپوں میں لپت پائے جاتے ہوں یا جن کے کریا کلاپوں سے بھارت میں ہندو مسلم ایکتا کا واتاورن دوشت ہونے کا بھے ہو انھوں نے یہ مانگ بھی کی کہ ایسی سمست سنستھائوں کو چنھت کرکے انہیں تتکال پربھاو سے پرتی بندھت کیا جایے۔

انھوں نے راشٹر پتی سے مل کر انہیں ایک گیاپن بھی سونپا ھے جس میں ایسی انیک ہندو مسلم سنستھائوں کی سوچی ھے جو ان سنگٹھنوں کے درشٹی کونڑ سے سامپردائکتا میں لپت ھیں۔ آشچریہ جنک تتھیہ یہ ھے کہ انھوں نے اس سوچی میں مسلمانوں اور ہندوئوں کے ایسے کئی سنگٹھنوں کو بھی نامانکت کیا ھے جو پچھلے کئی ورشوں سے ہندو آستھا اور مسلم وشواس کا پرتیک سمجھے جانے لگے تھے۔ اس سوچی میں نامت ہندو سنگٹھنوں نے اپنی پرتی کریا میں اس کا کڑا ورودھ پرگٹ کیا ھے۔ ان کا کہنا ھے کہ یہ ہندوئوں کی ایکتا بھنگ کرنے کا ایک اور پریاس ھے۔ یہ مانگ کھلے طور پر کچھ کمیونسٹوں اور مسلمانوں کی ایک سوچی سمجھی چال کا پرنام ھے ، جنہیں ایسے کاموں کو کرنے کے لیے کچھ پڑوسی دیشوں کی سہایتا پراپت ھے۔ اس چال میں ھمارے کچھ ہندو بندھو بھی پھنس گئے ھیں۔ ھمیں شیگھر ھی ان بھرمت بندھوؤں کے شدھی کرن کا پریاس کرنا ہوگا۔ انھوں نے سرکار کو سچیت کیا کہ یدی وہ ان ہندو ورودھی شکتیوں کی چال میں آکر کوئی ایسا نرنے لیتی ھے جو ہندو ہتوں کے ورذھ ہو تو اسے

اس کے گمبھیر پرینام بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔سماچار ایجنسیوں کے انوسار راشٹر پتی نے اس پرتی ندھی منڈل کی چنتائوں کو دھیان سے سناھے اور انھیں پورن وشواس دلایا ھے کہ وہ تتھیوں کی جانچ کرائیں گے اور شیگھر ھی اس پر نیمانوسار کاریہ واھی کرنے کی انوشنسا کریں گے۔

کچھ ھندو سنگٹھنوں کی اس پہل پر بھارت کے کونے کونے سے ملی جلی پرتی کریائیں پراپت ہو رہی ہیں۔کچھ نے ان کے اس وچار کا سواگت کرتے ہوئے کہا ھے کہ یہ کام کافی پہلے ہو جانا چاھیے تھا۔یدی ایسا کیا جاتاھے تو اس سے بھارت میں امن کا واتاورن بنے گا ناگرکوں کو من کی شانتی ملے گی جس سے دیش کی اُنتی کا مارگ پرشست ہوگا پرنتو کچھ ھندو سنگٹھنوں نے اس مانگ کا کڑا ورودھ کیا ھے انھوں نے سرکار کو یہ دھمکی بھی دی ھے کہ یدی کسی ھندو سنگٹھن پر پرتی بندھ لگانے کا پریاس کیا گیا تو بھارت کی ھندو جنتا سویم ھی اس کا منہ توڑ جواب دینے میں سکشم ھے۔سرکار کو اپنے اس ادوردرشتا پورن نرنے کے گمبھیر پرینام بھگتنے کے لیے بھی بھلی بھانتی تیار رہنا چاھیے۔بھارت کے پشچمی سمدر تٹ سے لگے کچھ علاقوں سے کہیں کہیں سے ھنسک گھٹنائوں کے بھی کچھ سماچار ملے ہیں۔

بھارت کے پردھان منتری نے ھندوئوں کے اس قدم کا سواگت کیا ھے اور انھیں وشواس دلایا ھے کہ ھماری سرکار ھندو مسلم ایکتا کے لیے جو بھی کیا جاسکتا ھے اوشیہ کرے گی۔

باون

اسلام اور مسلمانوں پر لگائے جانے والے دہشت گردی کے الزامات پر صرف حرکت البشر ہی فکر مند نہیں تھا۔ہندوستان کے دوسرے مسلم اداروں کے لیے بھی یہ امر باعث تشویش تھا۔ادھر کافی دنوں سے یہ تمام ادارے باہم ملاقاتیں کر رہے تھے۔ان کی کوشش تھی کہ وہ اس کے تدارک کا لائحہ عمل

تیار کریں۔ آخر اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ دہلی کے رام لیلا میدان میں دہشت گردی کی مخالفت اور امن عالم کی حمایت میں ایک بڑی ریلی منعقد کی جائے، جس میں ہندوستان کے تمام مسلم اداروں کے ساتھ دوسری اقلیتوں کی بھی نمائندگی ہو۔ اور یہ سب مل کر بہ یک آواز دہشت گردی کی مذمت کریں اور اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ اس کے انعقاد کی ساری ذمے داری مشترکہ طور پر جمعیۃ العلماے ہند اور دارالعلوم، دیوبند کے سپرد ہوئی۔ تاریخ کا تعین ہو چکا تھا اور اس کے انعقاد کی تیاریاں بڑے زور و شور سے چل رہی تھیں۔ اس سے پہلے تمام علماے اسلام نے متفقہ طور پر ایک فتوے پر دستخط کیے تھے، جس میں کہا گیا تھا کہ اسلام میں دہشت گردی کی کوئی گنجائش نہیں۔ جو لوگ دہشت گردی میں ملوث ہیں وہ اللہ کی زمین پر فساد کے مرتکب ہوتے ہیں اور فساد اللہ کے نزدیک بدترین اعمال میں سے ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو دہشت گردی سے دور رہ کر خود کو اللہ کے عتاب سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ اس تجویز کا اعلان بھی اسی جلسہ عام میں کیا جاتا تھا۔ مسعود خاں کو بھی خدام ملک و ملت کے نمائندے کی حیثیت سے اس ریلی میں مدعو کیا گیا تھا۔

دہلی میں اقلیتوں کا اتنا زبردست اجتماع چشم فلک نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دہلی کی سڑکوں پر انسانوں کا ایک تیز رو دریا بہ رہا تھا جس کا رخ رام لیلا میدان کی جانب تھا۔ اس میدان میں جہاں تک نظر جاتی تھی انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس میں شرکت کرنے کے لیے لوگ ہندوستان کے کونے کونے سے آئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ مسئلہ ہر اس انسان کے لیے پریشان کن بن چکا ہے جسے انسانیت اور امن عالم کی بقا کی فکر تھی۔ جلسے کی ابتدا کے وقت تک یہ تاریخی میدان پورے طور پر بھر چکا تھا۔

ہندوستان بھر سے آئے مقررین نے اس ریلی میں کھلے الفاظ میں دہشت گردی کی مذمت کی۔ ان میں مسلمانوں کے علاوہ عیسائی، سکھ، بودھ، جینی، اور وہ تمام اقلیتی نمائندے تھے جنھیں اس ریلی میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے بہ یک آواز یہ بھی کہا کہ کسی مذہب پر دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کرنے کا الزام عاید کرنا نا سمجھی کی دلیل ہے۔ دہشت گردی انسانیت کے خلاف ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ اگر کوئی دھرم بے گناہوں کے قتل کی اجازت دیتا ہے تو بھلا اسے دھرم کیسے کہا جا سکتا ہے۔ مسلمان مقررین نے واضح کیا کہ اسلام کا مطلب ہی سلامتی ہے۔ دوسرے

تمام دھرموں کی طرح اسلام بھی انسان کی سلامتی کا پیغام دیتا ہے۔ بے گناہوں کا قتل اور دہشت گردی اسلام میں حرام ہے۔ بیشتر مسلم مقررین نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی شخص یا تنظیم اسلام کے منشا اور احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دہشت گردانہ سرگرمیوں میں ملوث ہے تو اس کے لیے اسلام یا تمام مسلمانوں کو ذمے دار ٹھہرانا غلط رویہ ہے۔ اسلام دہشت گردی کو دنیا سے ختم کرنے کے لیے آیا تھا، نہ کہ اسے ہوا دینے کے لیے۔

مسعود خاں کو بھی اس ریلی میں اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ اس نے دہشت گردی کی مذمت میں دوسرے مقررین کی آواز میں اپنی آواز بھی ملائی۔ اس نے کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو دہشت گرد اور ملک کا دشمن سمجھنے کا سلسلہ اب بند ہو جانا چاہیے۔ ہماری یہ عظیم الشان ریلی اس بات کا کھلا اعلان ہے کہ مسلمان محب وطن ہیں اور انھیں اپنی حب الوطنی کے لیے کسی دوسرے سے سند لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ملک کے طول و عرض میں ہونے والی دہشت گردانہ سرگرمیاں ایک تلخ حقیقت ہیں۔ عام مسلمانوں کو ان سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اگر بیرونی ممالک کی شہ پر گمراہ ہو کر کچھ مسلم نوجوان اس طرح کے کاموں کو انجام دے رہے ہیں تو انھیں گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دی جانی چاہیے۔ مسلمانوں کو ایسے انسانیت دشمن لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ لیکن اس بنیاد پر مسلم مخالف جماعتوں کا عام مسلمانوں کو شک کے دائرے میں لا کر ان میں دہشت پھیلانا قابل مذمت عمل ہے۔ اسے روکا جانا چاہیے۔ مذہب کی بنیاد پر باہم منافرت پھیلانے والوں کو بھی دہشت گرد تصور کیا جانا چاہیے اور انھیں ملک کا غدار قرار دیتے ہوئے سخت سے سخت سزا دی جانی چاہیے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد سے آج تک فرقہ وارانہ فسادات کا ایک شرمناک سلسلہ قائم ہے۔ ہماری حکومتوں نے اس کے تدارک کے لیے مناسب اقدامات نہیں کیے۔ چنانچہ یہ بہیمانہ حرکات آج بھی زور و شور سے جاری ہیں۔ عام طور پر ان فسادات میں مسلمانوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان تمام لوگوں کو بھی جو ان فسادات کے ذمے دار ٹھہریں، دہشت گرد قرار دیتے ہوئے سزا دینی چاہیے۔ اس نے زور دے کر کہا کہ ہمارے ملک میں کچھ ایسے ادارے بھی وجود میں آ گئے ہیں جو مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے کبھی کبھی خود بھی ایسی دہشت گردانہ حرکات کر رہے ہیں اور اس کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ ہمارا انتظامیہ، خصوصاً محکمہ پولیس آزادی کے بعد سے رفتہ رفتہ مسلم دشمن ہوتا گیا ہے۔ اس میں زبردست اصلاح کی

ضرورت ہے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ان میں مسلمانوں کی خاطر خواہ نمائندگی ہو، تا کہ ان باتوں کی تہ تک جا کر ایمان داری سے ان ملک دشمن عناصر کی شناخت ممکن ہو سکے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت پھیلانے کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد خاطر خواہ نہیں ہے۔ انھیں ان کی آبادی کے تناسب سے ترجیحی بنیاد پر یہ ملازمتیں دی جانی چاہئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے مسلمانوں کو بھی مشورہ دیا کہ وہ اپنے ہندو پڑوسیوں سے بہتر تعلقات استوار کریں، کیونکہ ان کے دکھ درد میں بروقت وہی کام آنے والے ہیں۔ انھیں اپنے مسائل کے حل کے لیے دوسرے مسلم ممالک کی جانب پر امید نگاہوں سے دیکھتے رہنے کی عادت کو بھی بدلنا چاہیے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ آپ کے لیے کچھ کر پانے کی حالت میں نہیں ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان ہمارا ملک ہے۔ ہمیں یہیں جینا ہے اور یہیں مرنا ہے۔ اس لیے یہاں موجود ہر خرابی کے ہم بھی اتنے ہی ذمے دار ہیں جتنے دوسرے لوگ اور اس کی اصلاح کی ذمے داری دوسروں کے ساتھ ہم پر بھی عائد ہوتی ہے۔

اس ریلی کو بڑے پیمانے پر میڈیا کا تعاون حاصل رہا۔ تمام دن ان کی یہاں موجودگی ثابت کر رہی تھی کہ وہ اس اقدام کو ملک کے لیے کتنا خوش آیند سمجھ رہے ہیں۔ کئی ٹی وی چینلوں نے اس پورے جلسے کو لائیو ٹیلی کاسٹ کیا اور ہندوستان کے ہر گوشے میں عوام کی بڑی تعداد نے اسے بڑی دلچسپی اور تجسس کے ساتھ دیکھا اور سنا۔ میڈیا نے اس جلسے میں ہونے والی ایک ایک بات کو سارے ملک میں پھیلانے کا صالح کام انجام دیا۔ اس پر ردعمل کے اظہار میں حالانکہ سیاسی لیڈر بڑا محتاط رویہ اختیار کیے رہے، لیکن عوام تک وہ پیغام پہنچ گیا تھا، جو اس ریلی کے منتظمین ان تک پہنچانا چاہتے تھے۔

ترمیم

پارلیمنٹ کے مانسون اجلاس کو چلتے ہوئے آج پانچواں دن تھا۔ پارلیمنٹ ہاؤس کے احاطے میں چاروں طرف بڑی گہما گہمی کا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں موجود ہر شخص جیسے بے حد مصروف نظر آ رہا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ آج وزیر داخلہ پارلیمنٹ میں ایک ایسا تاریخ ساز ترمیمی بل پیش کرنے والے تھے، جس کی رو سے فرقہ پرستی کی جملہ شکلوں کو قابل دست اندازی پولیس جرم قرار دیا جانا

تھا اور اس بل میں ایسے مجرموں کو سخت سے سخت سزا دیے جانے کی سفارش کی گئی تھی، جو کم سے کم دس ہزار روپے جرمانہ اور دو سال کے قید بامشقت اور زیادہ سے زیادہ سزائے موت ہو سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بل میں ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد کو مستحکم بنانے کے لیے ہر سال پدم اعزازات کی طرز پر سدبھاو شری، سدبھاو بھوشن اور سدبھاو وبھوشن کے نام سے تین اعزازات جاری کرنے کی بھی تجویز تھی۔ وزیر داخلہ اور وزیر اعظم نے اپنے اپنے طور پر حزب اختلاف اور مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے ملاقات کر کے ان کو اس بل کی حمایت کے لیے آمادہ کرنے کی کوششیں کی تھیں، لیکن ان ملاقاتوں کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا تھا۔ حزب اختلاف اب بھی اس بل کی مخالفت میں ووٹ دینے کے فیصلے پر مصر تھا۔ حکمراں اتحاد سے متعلق جماعتوں کے اراکین پارلیمنٹ کو وھپ جاری کر کے پابند کیا جا چکا تھا کہ وہ آج لازمی طور پر ایوان زیریں میں موجود رہیں اور سرکار کے پیش کردہ بل کی حمایت میں اپنا ووٹ دیں۔ حزب مخالف نے بھی ایسا ہی ایک وھپ جاری کر کے اپنے اراکین کو پارلیمنٹ میں موجود رہنے اور اس بل کی مخالفت میں ووٹ دینے کو کہا تھا۔ پارلیمنٹ میں سرکار کے پاس اراکین کی وافر تعداد تھی۔ عام حالت میں اسے کوئی بھی بل پاس کرانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن ادھر ادھر سے ایسی خبریں مل رہی تھیں کہ اس مسئلے پر کئی اراکین نے حکمراں محاذ سے بغاوت کی ٹھان لی ہے اور وہ اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح اس بل کو پاس ہونے سے روکیں۔ اس لیے آج کا یہ اجلاس کچھ زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

شور شرابے کے درمیان وقت مقررہ پر وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ میں بل پیش کیا۔ جب وہ بل کے متن کی تلخیص پڑھ رہے تھے تو متواتر ہونے والے ہنگاموں کی وجہ سے انھیں بار بار رکنا پڑتا تھا۔ ہال سے بار بار سرکار مخالف نعروں کی آواز اٹھتی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ سرکار انتظامیہ کے ہاتھ میں ہندوستانی عوام کو پریشان کرنے کا ایک ایسا ہتھیار دے رہی ہے، جس کا غلط استعمال ہو سکتا ہے اور جسے بعد میں روکنا ناممکن ہو جائے گا۔ ایک طرف جہاں حزب اختلاف کی بنچوں سے مخالفت کی آوازیں آ رہی تھیں وہیں حکمراں اتحاد کی حلیف پارٹیوں کے کچھ اراکین بھی شور مچانے میں پیچھے نہیں تھے۔ جو صورت حال دکھائی دے رہی تھی اس سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس اجلاس کے بعد یا تو سرکار گر جائے گی یا اگر بہ فرض محال یہ بل پاس بھی ہو گیا تو پھر بڑے پیمانے پر پارٹیوں سے اراکین کے

اخراج کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ خدا خدا کر کے بل کا متن مکمل ہوا۔ وزیر نے اپنی سیٹ سنبھالی اور اسپیکر نے اس پروونگ کا سلسلہ شروع کیا۔ حکمراں اتحاد کی حلیف جماعتوں کے اراکین کی کل تعداد تین سو سے متجاوز تھی، جو دو تہائی اکثریت کے برابر تھی۔ لیکن پھر بھی ایسا لگ رہا تھا کہ اس بل کا پاس ہونا اتنا آسان نہیں ہوگا، جیسا سرکار سمجھ رہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں اسپیکر نے اعلان کیا کہ متعلقہ بل ایک سو نواسی ووٹوں کے مقابلے دو سو تین ووٹوں سے پاس قرار دیا جاتا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی حزب مخالف نے ایوان سے واک آوٹ کا اعلان کرتے ہوئے باہر کا راستہ پکڑ لیا اور باقی اراکین اس تاریخ ساز بل کے کامیابی سے پاس ہو جانے پر وزیر داخلہ کو مبارک باد پیش کرنے لگے۔

بالآخر اس بل نے قانونی شکل اختیار کر لی۔ سارے ہندوستان میں اس کا ملا جلا ردعمل دیکھنے میں آرہا تھا۔ عوام کا ایک طبقہ اس بل کے تعلق سے سرکار کی نیک نیتی پر شبہ کر رہا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ سرکار نے ووٹ کی خاطر ایک بار پھر مسلمانوں کی منھ بھرائی کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ لوگ کھلے عام دھمکیاں دے رہے تھے کہ وہ سارے ملک میں اس بل کے خلاف رائے عامہ ہموار کریں گے اور اگلے الیکشن میں سرکار کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ ان کی نظر میں یہ قانون ہندوؤں کو پریشان کرنے کی نیت سے بنایا گیا تھا۔ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو بل کے قانونی شکل اختیار کیے جانے پر جشن منا رہا تھا۔ ایسے لوگوں میں صرف مسلمان رہے ہوں ایسی بات نہیں تھی۔ اس کی حمایت کرنے والوں میں ہندو مسلمان تو تھے ہی، دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اس کا خیر مقدم کر رہے تھے۔

اس نئے قانون کا نفاذ ہوتے ہی سارے ہندوستان میں اس کے مثبت اثرات نظر آنے لگے۔ مخالفت کا طوفان اٹھا تو ایسا لگا کہ جیسے اس ملک میں اب کسی اور کی آواز سنی ہی نہیں جائے گی۔ لیکن بالآخر یہ مخالفت مختلف علاقوں میں کچھ انسانی جانوں کی قربانی لے کر کچھ دن بعد سرد پڑ گئی۔ اب ہندوستان میں ایک ایسا قانون نافذ ہو چکا تھا جس کی رو سے فرقہ پرستی جرم تھی۔ ایسا جرم جس پر پولیس کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ فوراً گرفتاری کر سکتی تھی۔ اس نئے قانون میں اہم بات یہ تھی کہ فرقہ پرستی کو دہشت گردی کے مساوی جرم قرار دیا گیا تھا اور یہ طے کیا گیا تھا کہ مستقبل میں دہشت گردی کے تعلق سے جتنی سخت سزائیں تجویز کی جائیں گی، وہ سب فرقہ پرستی کے مجرموں پر بھی لاگو ہوں گی۔ ظاہر ہے اب ان تمام لوگوں کو محتاط ہو جانا تھا جو وقتاً فوقتاً آزادانہ طور نہایت غیر ذمے داری سے اس طرح کی باتیں کرنے

کے عادی تھے۔ اس جرم کی سخت سزاوں کا تصور اب لوگوں کو اپنی زبان اور عمل پر قابو رکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اب اسٹیج پر کھڑے ہو کر کوئی یہ جرات نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی دوسرے فرقے کے خلاف کوئی ایسی بات کہہ سکے جس میں فرقہ پرستی کی بو آتی ہو۔ البتہ اپنی اپنی تنہائیوں میں کچھ لوگ اب بھی اشاروں کنایوں میں ایسے تبصروں کا عمل جاری رکھے ہوئے تھے۔

قانون کے نافذ ہو جانے کے کچھ عرصے بعد ہندوستان گیر پیمانے پر فرقہ پرست تنظیموں کی شناخت اور ان پر پابندیوں کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ اس کی لپیٹ میں ایسی کئی ہندو مسلم اور عیسائی تنظیمیں بھی آ گئیں، جن کے خلاف فرقہ پرستی میں ملوث ہونے کے معقول شواہد نہ تھے۔ انھیں محض اس شبہے کی بنیاد پر کہ یہ فرقہ پرست ہو سکتی ہیں، پابندی کا عذاب جھیلنا پڑا۔ پابندی کے تحت آنے والی ایسی ہی تنظیموں میں حرکت البشر کا نام بھی شامل تھا۔ اس تنظیم کے خلاف حالانکہ حکومت کے پاس ایسے شواہد نہیں تھے جس کی بنیاد پر اسے فرقہ پرست تنظیم قرار دیا جا سکتا، لیکن اس کی سرگرمیوں کی پراسراریت نے حکومت کو مجبور کیا کہ وہ اس پر پابندی لگا دے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ مسلم تنظیمیں تھیں جن پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ ایسا کرنا غلط بھی نہیں تھا۔ لیکن کچھ کے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی۔ اطمینان بخش بات یہ تھی کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں ان تنظیموں پر پابندی کے بعد کسی طرح کا کوئی احتجاجی ردعمل سامنے نہیں آیا تھا، جس سے یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ یہ لوگ اس نئے قانون کے وسیع اثرات سے پوری طرح باخبر اور مطمئن ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے نفاذ میں چھوٹی موٹی خامیوں کا در آنا فطری ہے۔ اس کے برعکس ہندوؤں میں اس قانون سے واقعی کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہ حلقہ جس نے صرف مسلمانوں پر نکتہ چینی کو ہی اپنی زندگی کا شعار بنا رکھا تھا، اس مشکل میں تھا کہ اب وہ کیا کریں۔ ان کی جن تنظیموں پر پابندی عائد کی گئی تھی، ان کے اراکین اور حامیوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں اس نئے قانون کے خلاف آوازیں بلند کیں، جلوس نکالے، توڑ پھوڑ کی گئی، ہڑتالیں ہوئیں، جس سے عوامی اثاثوں کا زبردست نقصان ہوا، لیکن حکومت اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہی۔ رفتہ رفتہ اس قانون کے بہترین نتائج بھی سامنے آنے لگے تھے۔

قانون کے نفاذ کا اگلا مرحلہ آنے والے سال سے فرقہ پرستی کے خلاف کام کرنے والے کسی ایک اہم

شخص یا ادارے کو نیا قایم کردہ سدبھاؤ شری اعزاز دیا جاتا تھا۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ اس کے نفاذ کے پہلے قدم کے طور پر اس سال صرف سدبھاؤ شری اعزاز ہی دیا جائے گا۔ سدبھاؤ بھوشن اور سدبھاؤ وبھوشن اعزازات کے لیے چونکہ بالترتیب سدبھاؤ شری اور سدبھاؤ بھوشن اعزاز کا حامل ہونا ضروری تھا اس لیے اس کے بتدریج نفاذ کو آئندہ کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ قانون کی رو سے سدبھاؤ شری اعزاز صدر جمہوریہ کے ہاتھوں دیا جانا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے لوازم کے علاوہ ایک لاکھ روپے کی نقد رقم اور ایک سند دی جانے والی تھی۔ صدر جمہوریہ کی نامزد کردہ جیوری نے جب اس اعزاز کے لیے منتخب کیے گئے شخص کا اعلان کیا تو یہ نام سن کر کسی کو حیرت نہیں ہوئی۔ شاید ہر شخص کے دل و دماغ میں یہ بات پہلے سے موجود تھی کہ اس کے لیے سب سے مناسب نام کون سا ہو سکتا ہے۔ یہ نام کسی اور کا نہیں، خدام ملک و ملت کے سربراہ مسعود خاں کا تھا، جس نے ہندو مسلم اتحاد کے قیام میں قابل قدر کارنامے انجام دیے تھے۔

گاندھی جینتی کے دن سہ پہر ٹھیک چار بجے ایوان صدر کے اشوک ہال میں، جہاں وزیر اعظم سمیت حکومت کی سربراہی کرنے والی جماعتوں کی اہم ترین شخصیات موجود تھیں، صدر کے ہاتھوں جب یہ اعزاز مسعود خاں نے قبول کیا تو اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہ رہے تھے۔ ہال میں موجود لوگ مجبور ہے تھے کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں، جو ایسے مواقع پر بے ساختہ آنکھوں میں آ جایا کرتے ہیں۔ لیکن ان آنسوؤں کے پیچھے جن یادوں کے طوفان میں اس وقت مسعود خاں گھرا ہوا تھا، اس تک کسی کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ اس وقت اسے اپنی خالہ کی یاد آ رہی تھی، جن کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ اسے آصف شبیر کی یاد آ رہی تھی، جس نے وہ راستہ دکھایا تھا جو اسے آج کی اس کامیابی تک لے آیا تھا۔ اسے امیر البشر احمد عبداللہ الہندی کی وہ شفقتیں بھی یاد آ رہی تھیں، جن کے زیر سایہ رہ کر اس نے ہر مشکل کا سامنا کرنے کا حوصلہ پایا تھا۔ اسے اس وقت بری طرح اپنا وہ چھوٹا سا قصبہ کوٹ یاد آ رہا تھا، جہاں معصوم اور جری کھکھر پٹھان دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ہی دھن میں مست زندگی گذار رہے تھے اور جہاں اس نے اپنے بچپن کے بہترین سال گذارے تھے۔ اسے آج کئی برسوں کے بعد دریائے جمنا کو وہ کنارہ بھی یاد آ رہا تھا جہاں وہ گھنٹوں تیرنے اور نہانے کے مزے لیا کرتا تھا۔ اسے حافظ عبدالصمد خاں کی بھی یاد آ رہی تھی، جن کے چند جملوں نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا تھا۔ اب یہ بات اچھی طرح اس کی سمجھ

میں آگئی تھی کہ نا گوار لگنے والی اکثر باتیں کس طرح زندگی میں کارآمد ثابت ہوا کرتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ اب بھی قصبے کے دوسرے نوجوانوں کی طرح اپنے کھیت میں محنت و مشقت کر کے معمولی طور پر اپنی زندگی کے دن گذار رہا ہوتا۔ آنکھوں میں آجانے والے ان آنسوؤں کی قیمت مسعود خاں کے علاوہ بھلا بھلا بھی کون سمجھ سکتا تھا۔ یہ آنسو اس کا ذاتی سرمایہ تھے، جسے اب وہ اپنے رومال میں محفوظ کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی طرح اڑ کر اسی وقت اپنے گاؤں پہنچ جائے اور ان سب کو بتائے کہ بالآخر اس نے اپنی منزل پالی ہے۔ اس نے اپنا کیا ہوا عہد پورا کر دیا ہے۔ اور اب اس کے لیے گاؤں کے دروازے کھول دیے جانے چاہئیں۔ ہال میں کافی مجمع تھا لیکن مسعود خاں کو اس بھیڑ میں بھی زبردست تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔

اسے اس بات کا احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اس ہال میں اتنا تنہا نہیں ہے جتنا سمجھ رہا ہے۔ کیونکہ اسی ہال کے ایک گوشے میں کسی اخبار کی رپورٹر کی حیثیت سے اپنی آنکھوں میں کچھ ویسے ہی آنسو لیے ہوئے، جیسے مسعود خاں کی آنکھوں میں تھے، آصفہ شبیر بھی موجود تھی، جسے حرکت البشر نے یہاں ہونے والی سرگرمیوں کی تصویر کشی اور حالات پر نظر رکھنے کے لیے متعین کیا تھا، اور جس کے لیے مسعود خاں کو خبر دینا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔

وہ اشوک ہال سے باہر نکلا تو پریس اور میڈیا کے لوگوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ اس سے رسمی قسم کے سوالات پوچھ رہے تھے۔ کوئی پوچھ رہا تھا کہ اس اعزاز کو حاصل کرنے کے بعد آپ کو کیسا محسوس ہو رہا ہے؟ کسی کا سوال تھا کہ آپ کا تعلق ہندوستان کے کس خطے سے ہے؟ کوئی کہہ رہا تھا کہ اس اعزاز سے اب آپ کی سماجی خدمات کی سرگرمیوں پر کیا اثر پڑے گا؟ لیکن مسعود خاں ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ وہ اس وقت اس لائق تھا ہی نہیں کہ کسی سے کوئی بات کر سکے۔ اس کے جذبات کا طوفان بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ بس یہ چاہ رہا تھا کہ اسے کسی طرح اس بھیڑ سے نجات ملے اور وہ کسی جگہ تنہائی میں جا کر خوب جی بھر کر روئے۔ بس آنسو تھے کہ اس کی آنکھوں سے مسلسل بہے جا رہے تھے۔ یہی اس کی زبان تھی، یہی اس کا اظہار تشکر تھا، یہی اس کے جذبات تھے، یہی اس کے مزاج کے عکاس تھے، یہی اس کی زندگی بھر کی کمائی تھی، جو آنکھوں سے بہتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ جو سمجھ سکتے تھے، انھوں نے اپنے طور پر ان آنسوؤں کا مطلب سمجھا اور جو نہیں سمجھ سکتے تھے انھوں نے مسعود خاں کی اس کیفیت کو اپنے اپنے طور پر مختلف نام دیے۔ لیکن مسعود خاں خوش تھا کہ اس

کے خواب اب تعبیر سے ہم کنار ہو رہے ہیں۔ اس نے اپنی ہمت کو مجتمع کیا اور وہاں موجود لوگوں سے بس اپنے اس عہد کا اعادہ کیا کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کرتا رہے گا۔ لوگوں کو اس کی اس بات پر پورا یقین بھی تھا۔ بالآخر اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر اس کی حفاظت پر مامور کچھ کمانڈوز اس کی مدد کو آگے آئے اور اسے لوگوں کی بھیڑ سے نکال کر محفوظ جگہ پہنچا دیا گیا۔

چھوٹ

ہندوستان کے طول و عرض میں میڈیا کے جتنے ذرائع موجود تھے، ان سب کے ذریعے مسعود خاں کو ملنے والے اس اعزاز کی خبریں اور تصویریں ملک کے کونے کونے تک پہنچیں۔ شہروں کے شور شرابے سے دور اس چھوٹے سے قصبے تک بھی یہ خبر پہنچ گئی، جہاں واپس ہونا مسعود خاں کا ایک ایسا خواب بن چکا تھا جو ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا تھا۔ اب کی بار جب حافظ عبدالصمد خاں نے سیاست جدید میں یہ خبر پڑھی تو انھیں مسعود خاں کی شناخت کرنے میں کوئی مغالطہ نہیں ہوا۔ یہ وہی مسعود خاں تھا۔ اپنا مسعود خاں۔ کیونکہ اس بار خبر کے ساتھ اس نوجوان کی وہ تصویر بھی چھپی تھی جو صدر جمہوریہ کے ہاتھ سے 'سدبھاؤ شری' کا اعزاز حاصل کرتے وقت کھینچی گئی تھی۔ جیسے ہی انھوں نے یہ خبر پڑھی تو وہ اسے جلدی سے جلدی ہمدان خاں تک پہنچانے کی اپنی شدید خواہش کو روک نہیں پائے۔ حالانکہ ابھی صبح کے چھ ہی بجے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ابھی ہمدان علی خاں کے جاگنے میں کافی دیر ہے۔ پھر بھی وہ نہایت تیز رفتار سے ان کے گھر پہنچے اور انھیں نیند سے جگا کر وہ اخبار دکھایا اور یہ خوش خبری سنائی کہ ہمارے مسعود خاں کو صدر جمہوریہ نے فرقہ وارانہ اتحاد قائم کرنے کے لیے ملک کے سب سے بڑے اعزاز 'سدبھاؤ شری' سے نوازا ہے۔ اس خبر کو سن کر ہمدان علی خاں جیسے بوکھلا گئے۔ وہ ابھی نیند کی گرفت سے باہر نہیں آئے تھے۔ انھیں پہلے تو اس خبر پر یقین ہی نہیں آیا۔ لیکن جب انھوں نے عبدالصمد خاں کے ہاتھوں سے چھین کر اخبار دیکھا تو وہ ایک عجیب سے سکتے کی کیفیت میں آگئے۔ انھوں نے بلند آواز میں اپنے ملازم کو پکارا اور اس سے کہا کہ وہ دوڑ کر جائے اور مجید بھائی کے یہاں سے سیر بھر پیڑے لے آئے۔ دوسرے ملازم کو دوڑایا کہ وہ جا کر اکرم خاں کو بلا لائے۔ وہ فوراً حافظ عبدالصمد خاں اور اکرم خاں کا منہ میٹھا کرنا چاہتے تھے۔ اب ان کی آنکھوں سے

نیند یکسر غائب ہو چکی تھی۔ انھوں نے عبدالصمد خاں کی طرف دیکھ کر کہا کہ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ ہمارے گاؤں کا کوئی معمولی جوان اس طرح کا کوئی کارنامہ انجام دے سکتا ہے کہ ملک کا راشٹر پتی اسے انعام دے۔

وہ ملازم پہلے واپس آیا جو اکرم خاں کو بلانے گیا تھا۔ اکرم خاں اس کے ساتھ تھا۔ ہمدان خاں نے آتے ہی اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ وہ اتنے جوش میں تھے کہ ان کی زبان لکنت کی گرفت میں آ گئی تھی۔ انھوں نے جلدی جلدی اسے بتایا کہ اس کے بھائی نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ سن کر اکرم خاں بری طرح رونے لگا۔ ہمدان خاں اور حافظ عبدالصمد خاں نے اسے سمجھایا اور اس سے وعدہ کیا کہ اب وہ جیسے بھی ہوگا اسے پکڑ کر کوٹ لے آئیں گے، کیونکہ اب اس کی تلاش مشکل نہیں ہوگی۔ اسی دوران ملازم پیڑے لے کر آ گیا۔ ہمدان علی خاں نے اپنے ہاتھ سے پہلے اکرم خاں کا منھ میٹھا کیا اور پھر عبدالصمد خاں کے منھ میں اس کے باوجود ایک پیڑا ٹھونس دیا کہ وہ ذیابیطس کے مریض تھے۔ وہ چلاتے ہی رہ گئے کہ ان کا پرہیز چل رہا ہے۔ اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے اپنے تمام ملازموں کو طلب کر کے انھیں حکم دیا کہ وہ فوراً نکلیں اور گاؤں کے ہر گھر میں جا کر یہ خوش خبری سنائیں کہ ہمارے مسعود خاں نے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ ہندوستان کے راشٹر پتی نے اسے اعزاز سے نوازا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتانے کو کہا کہ آج سارے ہندوستان کا بچہ بچہ اسے اور اس کی وجہ سے ہمارے گاؤں کو جان گیا ہے۔

گاؤں اور آس پاس کے دوسرے گاؤں میں اس خبر کی تشہیر کے بعد سارا دن ہمدان علی خاں کے گھر پر لوگوں کے آنے جانے کا تانتا بندھا رہا۔ یہ سب لوگ اخبار میں مسعود خاں کی تصویر دیکھنا چاہتے تھے۔ اور ہمدان علی خاں اور حافظ عبدالصمد خاں بڑے فخر کے ساتھ لوگوں کو یہ تصویر دکھا رہے تھے۔ وہ لوگوں کو بتا رہے تھا کہ مسعود خاں نے ساری دنیا میں کس طرح کوٹ کا نام روشن کیا ہے۔ یہ خبر سناتے ہوئے حافظ عبدالصمد خاں کی آنکھیں نم تھیں۔ جیسے یہ ان کا اظہار تاسف تھا کہ اس نے کس ہونہار نوجوان کو کسی بری گھڑی میں ایسا کچھ کہہ دیا تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ لیکن ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ شاید ان کی اسی تلخ کلامی نے آج اس چھوٹے سے قصبے کے باشندوں کو خوشی کا یہ موقع فراہم کیا ہے۔ وہ نہایت شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ ان کے دل میں مسعود

سے مل کر اس سے معذرت کا شدید جذبہ موجزن تھا۔ لیکن یہ سب ابھی ممکن نہیں تھا۔ ابھی مسعود خاں ان کی پہنچ سے بہت دور تھا۔ لیکن اب انھیں امید ہو چلی تھی کہ شاید اپنے مرنے سے پہلے ایک بار وہ کسی نہ کسی طرح مسعود خاں کی تلاش کر کے اس سے ملاقات کر لیں گے اور اگر ایسا ہو پایا تو وہ اسے مجبور کر کے اس گاؤں میں ضرور لے آئیں گے۔

پچپن

سرزمین دکن کا یہ دل فریب شہر، شیراز ہند، حیدرآباد فرخندہ بنیاد، بالآخر ایک بار پھر مسعود خاں کی نظروں کے سامنے تھا۔ یہ شہر ہندوستان میں اس کے پسندیدہ شہروں میں سے ایک تھا۔ مہمان نوازی اس شہر کے خمیر میں شامل تھی۔ ایسے ہرے بھرے باغات، تفریحی مقامات، بلند اور حسین عمارات، کشادہ سڑکیں اور صاف ستھری گلیاں اس نے ہندوستان کے بہت کم شہروں میں دیکھی تھیں۔ پچھلی بار جب وہ یہاں آیا تھا تو اس شہر پر کرفیو کا عذاب طاری تھا۔ اس وقت اسے سارا شہر بیمار، مغموم، مایوس اور خوابیدہ سا محسوس ہوا تھا۔ آج اسے یہ شہر کافی بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے سویا ہوا شہر حیدرآباد اچانک بیدار ہو گیا ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق شہر میں گھومنے پھرنے کے لیے نہ وہ پچھلی بار آزاد تھا اور نہ اس بار۔ بس اب کی بار اس کی ذمے داریاں پچھلی بار سے کچھ مختلف تھیں۔ اس بار وہ پچھلی بار کی طرح تنہا نہیں تھا۔ اس کے گرد میزبانوں کا حصار تھا، جو اسے آزادانہ طور پر کہیں آنے جانے میں مانع تھا۔ اسے کچھ گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ ایک آزاد شہری کی طرح اس دلکش شہر کی سڑکوں اور بازاروں میں گھومے۔ دکانوں میں داخل ہو کر خریداری کرے۔ چائے خانوں میں یہاں کی مخصوص چائے کا لطف لے اور کسی ایرانی ریستوراں میں جا کر یہاں کی نرگسی بریانی کا ذائقہ چکھے۔

وہ سالار جنگ میوزیم بھی دیکھنا چاہتا تھا، جس کے بارے میں اس نے سن رکھا تھا کہ اس کا سارا ذخیرہ صرف ایک شخص کی تگ و دو کا نتیجہ ہے۔ اس نے منتظمین سے کم از کم اپنی اس خواہش کے اظہار میں تکلف سے کام نہیں لیا تھا اور میزبانوں نے فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے کل صبح اسے وہاں لے جانے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ منتظمین اس بات سے واقف تھے کہ اس کو دو دن اس شہر میں رہنا ہے۔ لیکن اس کا ارادہ یہاں ایک دن اور رکنے کا تھا۔

حیدرآباد اس کے لیے کئی حیثیتوں سے اہمیت کا حامل تھا۔ یہ اس کے راہ بر، اس کی زندگی کا رخ بدل دینے والے، اس کے بزرگ اور سرپرست، حرکت البشر کے امیر کا شہر تھا۔ یہی وہ سرزمین تھی جہاں انسانیت کا ایک بلند حوصلہ مبلغ، احمد عبداللہ الہندی، اپنی بڑھتی ہوئی عمر سے بے نیاز اپنے آرام و آسائش اور سکون کی زندگی کو خیرباد کہتے ہوئے ایک ایسے میدان کارزار میں کود پڑا تھا، جہاں کچھ بھی اس کے موافق نہیں تھا۔ اس کے باوجود انسانیت کا پرستار وہ نحیف، بوڑھا، سفید ریش شخص ہندوستان کی تاریخ کا رخ موڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ اس کی رہنمائی ہی کی کرشمہ سازی تھی کہ مسعود خاں جیسا اس کا معمولی کارکن ہندوستان کا سب سے بڑا اعزاز پانے کا مستحق قرار پایا تھا۔ حیدرآباد اس کا پسندیدہ شہر یوں ہی نہیں تھا۔ اس شہر سے اس کا جذباتی رشتہ تو تھا ہی، اس کی پسندیدگی کے کچھ اور اسباب بھی تھے۔ یہ شہر ہند ایرانی اور ہند عرب ثقافتوں کا خوب صورت سنگم تھا۔ یہ شہر آریوں اور دراوڑوں کے اتحاد کا بہترین نمائندہ تھا۔ یہ شہر قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے خوابوں کی تعبیر تھا، جن کی زندگی اس کے لیے مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ اس قطب شاہی عہد کو ہندو مسلم اتحاد کی معراج کا عہد تصور کرتا تھا۔ یہ چار مینار کا شہر تھا، جو نہ صرف اس شہر کی بنیاد رکھے جانے کا چشم دید گواہ تھا بلکہ ہندو مسلم اتحاد کا ایک جیتا جاگتا تاریخی نمونہ بھی تھا۔ اس کے اوپری صحن میں مسجد اور مندر کی آمنے سامنے تعمیر اس کے عظیم معمار کے مزاج کی عکاس تھی۔ یہ مکہ مسجد کا شہر بھی تھا جہاں ایک سیاہ پتھر مکہ معظمہ کی مقدس سرزمین سے لاکر نصب کیا گیا تھا، جس نے اس مسجد کے تقدس کو دوبالا کر دیا تھا۔ اور اس وقت تو اس شہر کی ایک اہمیت اور بھی تھی۔ آصفہ شبیر ان دنوں اسی شہر میں قیام پذیر تھی۔

وہ آج ہی بذریعہ ہوائی جہاز دہلی سے یہاں پہنچا تھا۔ میزبانوں نے بیگم پیٹ طیران گاہ سے اسے نہایت آرام کے ساتھ سیدھے بنجارہ ہلز جیسے پرفضا مقام پر واقع 'تاج ریزیڈنسی' ہوٹل پہنچا دیا تھا، جہاں اس کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ فی الوقت اس شہر میں اس کی حیثیت ایک مدعو مہمان کی تھی، جسے ایک جلسہ عام میں 'کثیر العقیدہ معاشرہ اور مسلمان' کے موضوع پر تقریر کرنا تھی۔ جب سے اسے صدر جمہوریہ نے پدم بھوشن اعزاز سے سرفراز کیا تھا، اسے ایسے جلسوں میں مدعو کر کے اس کے خیالات کو عوام تک پہنچانے کا جیسے مقابلہ سا شروع ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض سے اُسے اتنی بڑی تعداد میں دعوت نامے موصول ہونے لگے تھے کہ وہ اگر چاہتا بھی تو سب کی خواہش پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس

نے اپنی سہولت اور بساط کے مطابق اپنے طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ ایک ماہ میں ایسے چار سے زاید جلسوں میں شرکت نہیں کرے گا۔ چنانچہ اسے اپنے بیشتر مداحوں سے معذرت کرنی پڑتی تھی۔

عام طور پر اس کے جلسوں میں سامعین کی تعداد بھی اچھی خاصی ہو جاتی تھی۔ ہندوستان بھر میں اس کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات کو حرز جان بنانے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ نوجوانوں میں اس کی مقبولیت سب سے زیادہ تھی۔ وہ ان میں سے اکثر کے لیے ایک قابل تقلید مثالی کردار بن چکا تھا۔ پھر یہ تو حیدرآباد تھا۔ یہ شہر تو مختلف تہذیبوں کا گلدستہ تھا۔ یہاں تو اس کا بے مثال خیر مقدم ہونا ہی تھا، سو ہوا بھی۔ وقت مقررہ پر اسے جلسہ گاہ پہنچا دیا گیا تھا۔ سامنے انسانوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں اتنی کثیر تعداد میں لوگ جمع ہو جائیں گے۔ یہ تعداد بلا مبالغہ پچاس ہزار سے کم نہ تھی۔ اس کے تمام جلسوں کی طرح اس جلسے میں بھی 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا' کا کیسٹ دھیمے سروں میں بج رہا تھا، جس کی دھن مشہور ستار نواز پنڈت روی شنکر کی بنائی ہوئی تھی۔ وہ پیشہ ور مقرر نہیں تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ تجربے نے اسے اپنی معمولی زبان میں اپنے دل کی باتیں کہنے کا سلیقہ سکھا دیا تھا۔ ہر بار جب وہ مجمع عام کے سامنے آتا تو اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا، لیکن جیسے ہی مائک پر آکر وہ چند رسمی کلمات ادا کرتا، اس کا سارا خوف دور ہو جاتا۔ اسے محسوس ہوتا، جیسے کوئی ماورائی قوت ایسے اوقات میں اس کی مدد کو آجاتی ہے۔ اپنی تقریر میں کبھی کبھی وہ ایسی باتیں بھی کہہ جاتا تھا جن کے بارے میں اس نے خود کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا تھا۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ یہ خیالات اس کے پاس کہاں سے آجاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس بات پر اس کا یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اس لیے اس کا مطلب وہ یہ بھی نکال لیتا تھا کہ وہ جو کام کر رہا ہے اسے تائید ربانی حاصل ہے۔

دھیرے دھیرے اب اس کے اندر خود اعتمادی بھی پیدا ہونے لگی تھی۔ اسے وہ پہلا جلسہ اچھی طرح یاد تھا، جب الہ آباد میں لوگوں نے اس کے لیے عوامی استقبالیے کا اہتمام کیا تھا۔ اس وقت وہ ان کی محبتوں سے سرشار تھا۔ ان کے خلوص کو وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کی زندگی میں اس سے پہلے مجمع عام میں تقریر کرنے کا کبھی کوئی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہیں تھا کہ ڈائس پر آکر مائک کے سامنے بولنا کوئی مشکل کام ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایسے وقت کسی انسان پر کیا کیفیات گذرتی ہیں۔ چنانچہ اس طرف سے وہ بالکل بے پروا تھا۔ جب اس سے درخواست کی گئی کہ

وہ مائک پر آکر لوگوں کو مخاطب کرے، تو وہ بڑی خود اعتمادی سے اٹھ کر آگے بڑھا تھا۔ لیکن اچانک مائک پر آنے کے بعد اس کی سانسیں پھولنے لگی تھیں، یک بہ یک اس کے سارے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں کو لوگوں کی نظروں سے بچانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کی اچھی خاصی زبان گنگ ہو گئی تھی اور وہ ایسی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا کہ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس دن وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا تھا، کہ جانے لوگ اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ وہ بڑی مشکل سے بس اتنا کہہ پایا تھا کہ میں آپ کی محبتوں کی قدر کرتا ہوں۔ آپ کے خلوص کے پیدا کردہ اس ماحول نے مجھے جذبات سے مغلوب کر دیا ہے۔ میری آواز گرفتہ ہے۔ چنانچہ اس وقت میں آپ سے کچھ کہنے کی حالت میں نہیں ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ انشاء اللہ پھر کبھی آپ سے باتیں کروں گا۔ شکریہ۔ اور ان چند الفاظ کی ادائیگی ہی میں وہ بری طرح پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔

آج کی تقریر کا موضوع اس کا پسندیدہ بھی تھا اور آزمودہ بھی۔ اس کی عمر ہی اس دشت کی سیاحی میں گذری تھی۔ اس لیے یہاں کیا کہنا ہے، اس کے بارے میں اسے کچھ زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر یہ موضوع اس سے ایسا منسوب ہو گیا تھا کہ ہر دوسری جگہ اسی سے ملتے جلتے موضوعات پر اس سے بولنے کی فرمائش کی جاتی تھی۔ اسے کیا کہنا ہے یہ سب جیسے اسے ازبر ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس جلسے میں اس نے کھل کر اپنے دل کی باتیں کیں۔ سامعین کے نعرے متواتر اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ وہ یہ نہ سوچیں کہ لوگوں سے اتحاد و یگانگت کا رشتہ قائم کرنا کوئی دشوار عمل ہے یا اس کے لیے کسی خاص وقت یا کسی خاص صورت حال کا ہونا ضروری ہے۔ آپ یہ کام آج ہی شروع کر سکتے ہیں۔ میری بات کا یقین کیجیے، آپ کا پڑوسی آپ کی محبت کا بھوکا ہے۔ وہ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کے صبر کا مزید امتحان نہ لیجیے۔ اسے اور زیادہ انتظار نہ کرائیے۔ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیجیے۔ خدا پر بھروسا رکھیے۔ انشاء اللہ آپ کا پڑوسی بھی آپ سے اچھا سلوک کرے گا۔ یقین کیجیے کہ آپ کے یہی پڑوسی ہر اچھے برے وقت میں آپ کے کام آنے والے ہیں۔ یہ مہمل خیال جتنی جلدی ہو سکے، اپنے دل سے نکال دیجیے کہ کوئی سعودی عرب، کوئی پاکستان، کوئی بنگلہ دیش، کوئی ایران، کوئی عراق کبھی آپ کی مدد کے لیے یہاں آسکتا ہے۔ ان کے اپنے مسائل ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ وہ ہم سے بھی بڑے اور الجھے ہوئے مسائل سے دوچار ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ان مسائل کو کیسے

حل کریں۔ بھلا ایسے میں وہ آپ کے بارے میں کیسے سوچ سکتے ہیں۔ یہ توقع ایک حسین مغالطہ ہے، جسے ہمارے مخالفین کے ذریعے پھیلائی گئی افواہوں نے اور ہوا دی ہے۔ وہ ہم پر الزام لگانے کے لیے ایسا کہتے رہے ہیں اور ان کے متواتر ایسا کہنے کی وجہ سے یہ جھوٹ ہمیں سچ کی طرح لگنے لگا ہے۔ شاید ہم سمجھنے لگے ہیں کہ یہی ہمارے لیے ٹھیک ہے۔ اپنے آپ کو ان سازشوں میں پھنسنے سے بچایئے۔ کان اور آنکھیں کھول کر زندگی کا سامنا کیجیے۔ یہاں معاشرے کے دشمنوں نے قدم قدم پر جال بچھا رکھے ہیں۔ یہ ہمیشہ یاد رکھیے کہ ہم ہندوستانی ہیں، ہندوستان کا ہر مسئلہ ہمارا مسئلہ ہے اور ہندوستان کی ہر اچھی اور ہر بری چیز کے لیے ہم بھی اتنے ہی ذمے دار ہیں جتنے دوسرے۔ اس کی زبان سے الفاظ کا دریا بہہ رہا تھا۔ اس کے ایک ایک جملے پر تالیوں کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔ لوگ مبہوت ہو کر اس کی ایک ایک بات کو غور سے سن رہے تھے۔ لوگوں کے سامنے ایک مفکر کی جانب سے ایک ایسا نقطۂ نظر سامنے آ رہا تھا جس پر اس سے پہلے انھوں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر بار بار نعرۂ تکبیر بلند کر رہے تھے۔ ان پر ایک سرشاری کی کیفیت طاری تھی اور اسی کیفیت میں مسعود خاں کی تقریر اپنے اختتام کو پہنچی۔ وہ مائک سے آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اسٹیج پر بیٹھے شہر کے معززین نے اسے مبارک باد دی اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ مقامی سطح پر اس کے خیالات کو فروغ دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ اس کے بعد فوراً ہی اسے بہ حفاظت تمام اس کے ہوٹل پہنچا دیا گیا۔

دوسرے دن جب وہ سالار جنگ میوزیم سے واپس لوٹ کر اپنے ہوٹل پہنچا تو پریس کے لوگوں کو اپنے انتظار میں بیٹھے دیکھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے وہیں ہوٹل کے ہال میں ایک چھوٹی سی پریس کانفرنس کی اور اخباری نمائندوں کے تمام سوالات کا مناسب جواب دیا۔ دونوں دن اس کے ہوٹل کے سوٹ میں آ کر اس سے ملنے والوں کا ایک سلسلہ بنا رہا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جنھوں نے پہلے ہی سے ملاقات کا وقت لے رکھا تھا۔ ان میں اساتذہ تھے، وکیل تھے، سماجی خدمت گار تھے، سیاسی لیڈر تھے، شاعر و ادیب تھے، طالب علم تھے، غرض زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق لوگوں نے اس سے ملاقات کی۔ اخبارات اور ٹی وی کے نمائندوں نے اس سے انٹرویو لیے اور اسے لمحے بھر کو بھی فرصت میسر نہ آئی۔ آج جب دوسری رات وہ اپنے بستر پر دراز ہوا تو اسے خیال آیا کہ کل کے دن کی اپنی ذاتی مصروفیات پر اسے ایک بار اور غور کر لینا چاہیے۔ اس نے ابھی تک آصف شبیر کو فون نہیں کیا تھا۔

آصفہ شبیر ایسے کسی فون کی منتظر بھی نہ تھی۔ آخر مسعود کی طرح وہ بھی ایک ذمے دار تنظیم کی ڈسپلنڈ کارکن تھی۔ البتہ اسے اس بات کی اطلاع پہلے سے تھی کہ مسعود خاں یہاں آنے والا ہے۔ یہ اطلاع اسے حیدرآباد شہر کے چپے چپے میں لگے پوسٹروں سے ملی تھی۔ مسعود خاں نے جب اسے فون پر اپنے حیدرآباد آنے کی خبر دی تھی تو اس کے لیے یہ خبر نئی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے شکایتاً اس سے کہا بھی تھا کہ اسے اس بات سے دکھ ہوا ہے کہ مسعود خاں کے حیدرآباد آنے کی اطلاع اسے دوسرے ذرائع سے مل رہی ہے۔ مسعود نے اپنی عادت کے مطابق اس کی اس بات پر ایک بلند قہقہہ لگایا تھا اور اس سے اس تاخیر کی معذرت کر لی تھی۔

تمام ضروری کاموں سے فارغ ہونے کے بعد تقریباً رات کے دس بجے اس نے آصفہ شبیر کو فون کیا اور اس سے درخواست کی کہ اگر کل صبح وہ یہیں ہوٹل میں آ جائے تو ہم دونوں مل کر ناشتہ کر لیں گے، جسے آصفہ نے بخوشی قبول کر لیا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ صبح آٹھ سے ساڑھے آٹھ کے درمیان ہوٹل پہنچ جائے گی۔ اس کے بعد کا سارا پروگرام مسعود خاں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ کل اسے دن بھر مسعود کے ساتھ رہنا ہے۔ اور اس نے اپنی مصروفیات میں سے اس ایک دن کو مسعود خاں کے لیے وقف کرنے کے سارے انتظامات کر لیے تھے۔

چھپن

بڑا عجیب و غریب رشتہ تھا یہ۔ ایک طرف مسعود خاں کا دل آصفہ کی محبت سے لبریز تھا تو دوسری طرف آصفہ بھی اس کے بغیر اپنی زندگی کا تصور نہیں کر پا رہی تھی۔ لیکن دونوں ہی اپنے اپنے فرائض منصبی کے بوجھ تلے ایسے دبے ہوئے تھے کہ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں سوچنے کی نہ تو کبھی انھیں فرصت ملتی تھی اور نہ اجازت۔ انھوں نے کبھی باقاعدہ طور پر ایک دوسرے سے اپنی محبت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ بس دونوں خود ہی سمجھ گئے تھے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہے۔ دونوں ہی اس بات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے تھے کہ حرکت البشر میں داخلے کے وقت انھوں نے جس معاہدے پر دستخط کیے تھے اس کے ضوابط کی رو سے وہ اپنی تمام زندگی اس عظیم مقصد کے لیے وقف کر چکے ہیں، جس کا تعین حرکت البشر نے کیا تھا اور اب خود اپنے لیے ان کی اپنی زندگی کا کوئی مطلب نہیں رہ گیا

تھا۔ دونوں کے لیے اپنی خواہش کے مطابق ایک دوسرے سے ملاقات کرنا بھی ان کے اپنے اختیار میں نہیں تھا۔

یہ بات کہنے میں بھلے ہی عجیب لگے لیکن حقیقت یہی تھی کہ ان دونوں کی حیثیت عہد عتیق کے ان غلاموں جیسی ہو گئی تھی، جنھیں اپنے اچھے برے جذبات کا حامل انسان نہیں سمجھا جاتا تھا اور جن کی خود اپنی کوئی مرضی نہیں ہوا کرتی تھی۔ ان دونوں کا حال بھی کچھ ویسا ہی تھا۔ وہ صرف وہی کر سکتے تھے، جس کے لیے حرکت البشر کے آقا انھیں حکم یا اجازت دیں۔ اور ان احکامات اور اجازت ناموں میں دل کی تمناؤں اور خواہشات کی سمائی کا کوئی سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ پھر بھی یہ رشتہ نہ صرف برقرار تھا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مزید گرمی آتی جا رہی تھی۔ جب سے مسعود خاں کو اس کے سابقہ فرائض سے سبک دوش کر کے 'خدام ملک وملت' کی رہنمائی کی ذمے داریاں تفویض کی گئی تھیں، اس دن سے اصولی طور پر وہ حرکت البشر کے حکم کا پابند نہیں رہ گیا تھا۔ اب وہ ایک خود مختار تنظیم کا سربراہ تھا جو خود اپنے رضاکاروں کو حکم دینے کا اختیار رکھتا تھا۔ لیکن حرکت البشر سے اس کا ایک جذباتی رشتہ تو بنا ہی ہوا تھا۔ کیونکہ اس تنظیم کے سربراہ احمد عبداللہ الہندی تھے، جنھیں وہ اپنا امیر ہی نہیں، بزرگ اور سرپرست بھی تصور کرتا تھا اور جو دوسروں سے کہیں زیادہ، بلکہ یہ کہیں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اپنے حقیقی بیٹے کی طرح اس کا خیال رکھتے تھے۔ ان حالات میں آصفہ کے مقابلے مسعود کے پاس اس کے امکانات زیادہ روشن تھے کہ وہ آصفہ سے ملنے کی سبیل پیدا کر سکے، اور وہ وقتاً فوقتاً ایسا کرتا بھی رہتا تھا۔ اکثر جب بھی ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ وہ دونوں ایک ہی شہر میں ہوں تو کسی نہ کسی بہانے دونوں ملاقات کی سبیل نکال ہی لیا کرتے تھے۔

اس رشتے کے بارے میں حرکت البشر کے اکابرین بے خبر رہے ہوں ایسا بھی نہیں تھا۔ ساری دنیا کی خبر رکھنے والی تنظیم اپنے ہی کارکنوں کی سرگرمیوں سے باخبر نہ ہو، اس کی امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس تنظیم سے آصفہ شبیر کا رشتہ مسعود خاں سے بھی پرانا تھا۔ یہ بھی سچ تھا کہ اپنے دل کے کہنے پر ہی اس نے تنظیم کے سامنے مسعود کے نام کی سفارش کی تھی اور یہ بھی اتنا ہی سچ تھا کہ اس نے تنظیم کو ایک عاشق نہیں بلکہ باصلاحیت اور کارآمد نوجوان مہیا کرایا تھا، جس نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی افادیت خود ہی ثابت کر دی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید ایک جگہ کام کرنے پر اس سے ملنے کے مزید

مواقع میسر آسکیں گے۔ لیکن یہ اس کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی تھی۔ کیونکہ ایسا اتفاق بہت کم ہوتا تھا کہ دونوں بہ یک وقت ایک ہی شہر میں موجود رہیں۔ اس کی صلاحیتوں اور کارکردگی کی جملہ معلومات تو اکابرین کو تھی ہی۔ وہ اس کی زندگی کے ایک ایک لمحے پر نظر بھی رکھتے تھے۔ اس کا سبب ایک تو یہ تھا کہ وہ لڑکی تھی جسے مرد کے مقابلے میں زیادہ تحفظ درکار تھا، دوسرے حرکت البشر کے اکابرین یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اس نے اپنی زندگی میں اتنی شدید اذیتوں کا سامنا کیا تھا کہ اب مزید اذیتیں اسے زندگی ہی سے بیزار کرسکتی تھیں۔ اس لیے تنظیم نے اس کی جملہ ذمے داریاں خود اپنے اوپر لے رکھی تھیں۔ یہ بات خود آصفہ شبیر کو بھلے ہی معلوم نہ رہی ہو لیکن تنظیم کے سربراہ اپنے دل میں اس کو اپنی بیٹی تصور کرنے لگے تھے۔ جب آصفہ کے ذریعے مسعود کے بارے معلومات فراہم کرنے کی اطلاع امیر البشر کو ملی تھی، اس وقت ہی انھوں نے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ کر لیا تھا۔ انھیں بخوبی احساس ہو گیا تھا کہ آصفہ کے دل میں اس نوجوان کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ آصفہ شبیر ایک فرض شناس لڑکی ہے، اس لیے انھوں نے نہ تو اس سے کبھی کوئی جواب طلب کیا تھا اور نہ اس موضوع پر اس سے کبھی کوئی بات چیت کی تھی۔ وہ اس رشتے کے خلاف بھی نہیں تھے، لیکن وہ ڈرتے تھے کہ کہیں جذبات میں آکر یہ تنظیم کے نظم وضبط کے لیے خطرہ نہ بن جائیں۔ لیکن ان کا یہ خدشہ رفتہ رفتہ دور ہو گیا تھا۔ اس رشتے کے باوجود دونوں کی فرض شناسی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ دراصل ان کی سمجھ میں یہ آیا ہی نہیں تھا کہ وہ ان کے لیے ایسا کر کر سکتے ہیں جو ان دونوں کے حق میں مفید اور بہتر ہو۔ اس لیے انھوں نے اس رشتے کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا، کہ وہ جو مناسب سمجھے گا کرے گا اور یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنے طور پر کبھی خدا کی مرضی میں مداخلت نہیں کریں گے۔

اور خدا کی مرضی یہ تھی کہ لاکھوں دشواریوں اور پابندیوں کے بعد بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ ابھی چند ثانیوں قبل ہی جب انھیں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ اپنی خرابی صحت کا بہانہ بنا کر آصفہ شبیر تنظیم کی اجازت کے بغیر کل ہوٹل تاج ریزیڈنسی جا کر مسعود سے ملاقات کرنے والی ہے، تو وہ کسی قدر تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انھیں آصفہ کے جھوٹ پر اتنی تشویش نہیں ہوئی تھی کہ اس خطا کے لیے اسے معاف کر دینا ان کے اپنے اختیار میں تھا۔ لیکن انھیں اس جوڑے کا اس طرح ایسے مخدوش مقام پر ملاقات کرنا مناسب نہیں معلوم ہو رہا تھا۔

ستاون

آصفہ شبیر آباد سے ملحق زمستان پورہ کے اپنے فلیٹ میں آج کچھ دیر تک سوتی رہی۔ صبح کے چھ بج چکے تھے اور ابھی اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ عام طور پر اس کے سو کر اٹھنے کا وقت صبح چار اور ساڑھے چار کے درمیان ہوا کرتا تھا۔ آج دیر تک سونے کا سبب یہ تھا کہ گذشتہ رات اس کی والدہ کو بار بار کھانسی کا دورہ پڑ رہا تھا، جو اس کی نیند میں مانع تھا۔ دوسرے کمرے میں ملازمہ خراٹے بھر رہی تھی۔ اپنی مدد کے لیے اسے جگانا اسے مناسب نہیں معلوم ہوا اور وہ خود ہی انھیں دوائیں دے کر ان کے سو جانے تک ان کی تیمارداری میں مصروف رہی۔ بمشکل تین بجے کے بعد اسے پلک جھپکانے کا موقع ملا تھا۔ اور اب جب اس کے اٹھنے کا وقت تھا تو وہ سو رہی تھی۔ اس نے ابھی کروٹ بدلی تھی جس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اب وہ جلد ہی اٹھ جائے گی، لیکن اسی وقت اس کے موبائل کی گھنٹی نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ آنکھ ملتے ہوئے اس نے موبائل اٹھایا تو اسے دوسری طرف سے 'اللہ جلیل' کی شناسا آواز سنائی پڑی۔ اس آواز کو سن کر وہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔ اب اس کی نیند بھی غائب ہو چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فون پر دوسری طرف امیر البشر ہیں، جو معذرت خواہانہ لہجے میں اس سے کہہ رہے تھے 'بنت البشر کی ناسازی طبع کی ہمیں اطلاع ہے لیکن کام کچھ ایسا آن پڑا ہے کہ اسے زحمت دینا ضروری ہو گیا ہے۔'

'بنت البشر حاضر اور ہدایات کی منتظر ہے۔' آصفہ شبیر نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ لیکن یہ کہتے ہوئے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اسے یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اب وہ وقت مقررہ پر مسعود کے پاس نہیں پہنچ پائے گی۔

'ہدایات غور سے سنیے۔' موبائل پر امیر کی آواز گونج پیدا کر رہی تھی۔ 'حیدرآباد سے سکندرآباد جاتے وقت ٹینک بنڈ کے بعد ایک کلو میٹر مزید چلنے پر بائیں جانب کی پہلی گلی میں بالکل سامنے ایک پرانا مکان ہے، جو عرصے سے خالی پڑا ہے۔ تم فوراً وہاں پہنچنے کی تیاری کرو۔ اس کا صدر دروازہ تمھیں کھلا ملے گا۔ تمھیں چاہیے کہ اندر بائیں طرف کے پہلے کمرے میں بیٹھ کر اگلی ہدایت کا انتظار کرو۔ دس منٹ کے اندر گاڑی تمھارے گھر کے نیچے ہوگی۔ لیکن یاد رکھنا کہ اس درمیان کسی سے کوئی رابطہ خطرناک

ہوگا۔امیرالبشر نے اسے متنبہ کرتے ہوئے بات چیت کا سلسلہ اچانک منقطع کر دیا۔

آصفہ بری طرح بوکھلا گئی تھی۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ظاہر ہے اب اس کے ذاتی معاملات کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔اس لیے اس نے اپنے فرائض کی جانب اپنی توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی۔ایک باراس نے ہدایات کو اپنے ذہن میں دہرایا کہ کہیں کوئی بات وہ بھول نہ جائے۔وہ کچھ خوفزدہ بھی ہوگئی تھی۔اسے خوف تھا کہ کہیں امیرالبشر کو یہ اطلاع تو نہیں ہوگئی کہ اس نے جھوٹ بول کر آج کی چھٹی لی ہے۔پھر بھی وہ جلدی جلدی تیاری کرنے لگی۔کیونکہ اب اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں تھا۔ایک باراس کے جی میں آیا کہ وہ چپ چاپ مسعود کو اس نئی صورت حال سے آگاہ کردے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے اس کا ارادہ ترک کر دیا۔اب وہ کوئی نیا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔اس کے اس عمل سے صورت حال کے مزید پیچیدہ ہو جانے کا امکان تھا۔مسعود کی طرف سے وہ کم از کم اس حد تک تو مطمئن تھی ہی کہ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ تنظیمی خدمات میں وقت بے وقت انھیں اپنی ذاتی مصروفیات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

اسے تیار ہونے میں کچھ وقت لگا۔ضروریات سے فارغ ہوکر اس نے موبائل اٹھا کر اپنے پرس میں رکھا اور والدہ سے اجازت لینے کے لیے ان کے کمرے میں گئی۔جلدی جلدی انھیں بتایا کہ امیرالبشر نے اسے فوراً طلب کیا ہے۔جہاں دیدہ اور سن رسیدہ اس خاتون نے تھوڑے اشارے کو اس کی تفصیلات کے ساتھ اچھی طرح سمجھ لیا لیکن خاموش رہی۔اس نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے سلامتی کی دعائیں دیں اور خدا حافظ کہا۔اس کے ساتھ ہی آصفہ جلدی جلدی زینے اتر گئی۔

گاڑی نے اسے گلی کے موڑ پر اتار دیا اور آگے نکل گئی۔اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ابھی سڑک پر لوگوں کی آمدورفت زیادہ نہیں ہوئی تھی۔پھر بھی اس نے محتاط انداز میں قدم اٹھائے اور گلی میں داخل ہوگئی۔اس نے دیکھا کہ ہدایت کے مطابق سامنے قدیم عمارت کا صدر دروازہ کھلا ہوا ہے۔اندر آکر اس نے بائیں طرف کے کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔وہ بھی کھلا ہوا تھا۔کمرے کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے دروازہ بند کر دیا اور صوفے پر بیٹھ کر اگلی ہدایات کا انتظار کرنے لگی۔اس نے دیکھا کہ اس کمرے میں کھڑکیاں نہیں ہیں۔بیرونی دیوار میں ایک کھڑکی کی جگہ ضرور بنی نظر آرہی تھی لیکن اسے اینٹوں سے چن کر پلاسٹر کر دیا گیا تھا۔اُس دروازے کے علاوہ، جس سے وہ ابھی اندر

داخل ہوئی تھی، ایک دروازہ اور تھا جو فی الحال بند تھا۔ مغربی دیوار کے بالائی حصے میں صرف ایک چھوٹا سا روشن دان تھا جس سے کمرے میں معمولی سی روشنی آ رہی تھی۔

اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اندر کا بند دروازہ کھلا اور امیر البشر احمد عبداللہ الہندی اس کے سامنے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی کہ ان کے ساتھ مسعود خاں بھی تھا۔ مسعود خاں کے چہرے پر بھی اسی طرح ہوائیاں اڑ رہی تھیں، جیسے خود اس کے چہرے پر، جو اس کی گھبراہٹ کا واضح اظہار تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ امیر البشر پر ان کی محبت کا راز افشا ہو چکا ہے اور اُس کی طرح ہی مسعود خاں کو بھی یہاں طلب کیا گیا ہے۔ وہ اس سزا کے تصور سے کانپ اٹھی جو شاید ان دونوں کو چند لمحوں بعد دی جانے والی تھی۔ ان کا جرم تو ثابت ہو ہی چکا تھا کہ ان دونوں نے تنظیم کے اصولوں کی واضح خلاف ورزی کی ہے۔ لیکن وہ اس بات پر حیران تھی کہ معمول کے مطابق نہ تو امیر کے حفاظتی رضا کار ان کے ساتھ تھے اور نہ انھوں نے اللہ جلیل کا روایتی نعرہ بلند کیا تھا۔ اس سے آصفہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ شاید ایسا اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اب ان کی نظر میں ان دونوں کا تعلق تنظیم سے منقطع ہو چکا ہے۔

'گھبراؤ نہیں بیٹی'۔ امیر البشر نے آصفہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے اس نئے تخاطب پر مزید حیران ہوئی، کیونکہ یہ اس کی توقعات کے بالکل خلاف تھا۔ 'اس مداخلت بیجا پر میں بہت شرمندہ ہوں، لیکن کیا کروں، تم دونوں کی بد احتیاطی، نادانی اور ناعاقبت اندیشی نے مجھے واقعی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے مجھے یہ مداخلت کرنی پڑی۔ میں جانتا ہوں کہ تم دونوں اپنے اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کس طرح کے جذبات رکھتے ہو۔ میں ان جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم دونوں کے والدین اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اس لیے تم دونوں مناسب سمجھو تو مجھے ہی ان کا قائم مقام اور اپنا سرپرست سمجھ سکتے ہو۔ یہ میرا اپنا آبائی مکان ہے، یہ مجھے اس لیے عزیز ہے کہ یہیں میری پیدائش ہوئی تھی۔ کافی دنوں سے یہاں کوئی نہیں رہتا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی میں نے اس کی صفائی کرائی ہے۔ سوچ رہا تھا کہ اب چونکہ حکومت کی جانب سے حرکت البشر کی تمام سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اس لیے کچھ دن یہاں آرام کروں گا۔ اب یہاں تم دونوں میرے مہمان ہو۔ بلکہ بہتر ہوگا کہ تم لوگ اسے اپنا ہی گھر تصور کرو۔ یہاں تم جتنی دیر اور جب تک چاہو اطمینان سے ساتھ رہ سکتے ہو۔ اندر کچھ ملازم موجود ہیں جو تمھارے حکم پر تمھاری ہر ضرورت پوری کریں گے۔ گھر کے باہر پہرے کا

معقول انتظام بھی کر دیا گیا ہے۔اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔البتہ یہ بات میں تم دونوں کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں تم سے ناراض ہوں۔وہ اس لیے کہ تم دونوں نے ہوٹل جیسی نامعقول اور غیر محفوظ جگہ پر ملاقات کرنے کا ناعاقبت اندیشانہ فیصلہ کیا تھا۔اس کے لیے تم دونوں کو مجھ سے معافی مانگنی چاہیے۔یہ الگ بات ہے کہ اگر تم لوگ معافی مانگو گے تو میں تمھیں معاف بھی کر دوں گا،اس لیے کہ اس وقت میں یہاں پر تم دونوں کے سرپرست کی حیثیت سے موجود ہوں'۔اچانک انھوں نے بات چیت کا یہ سلسلہ یہیں روک دیا۔اس کے بعد انھوں نے معافی مانگے جانے کا انتظار کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور یہ کہتے ہوئے کہ' میں اب زیادہ دیر تم دونوں کے درمیان مخل رہنا نہیں چاہتا،اس لیے مجھے اجازت دو،میں اب چلتا ہوں'۔وہ جس دروازے سے داخل ہوئے تھے اسی سے واپس چلے گئے۔اب اس کمرے میں مسعود خاں اور اس کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

امیر کے جانے کے بعد جیسے وہ ہوش میں آئے۔پہلے ان دونوں کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔وہ شاید اس لیے کہ جس خطرے کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے،وہ ٹل گیا تھا۔بلکہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔وہ دونوں حیران بھی تھے۔انھوں نے اب سے پہلے کبھی امیر کو اس لہجے میں بات کرتے سنا ہی نہیں تھا۔ان کا لہجہ ایک شکست خوردہ باپ کے لہجے میں تبدیل چکا تھا۔نہ تو اس میں کوئی تحکم تھا،نہ رعب و دبدبہ۔وہ بالکل اس طرح بول رہے تھے جیسے کوئی باپ اپنی اولادوں کی نالائقی کے سامنے اپنی ہار تسلیم کر کے بول سکتا ہے۔اس وقت ان دونوں کے اندر عجیب وغریب جذبات موجزن تھے۔ان کا سر امیر کے لیے عقیدت سے جھک گیا تھا۔ان کے دلوں میں باہمی محبت کے اظہار کا خیال تک نہیں تھا۔اس کی جگہ وہ اس بات سے مسرور تھے کہ احمد عبداللہ الہندی کی شکل میں ان کو ایک نیا سرپرست مل گیا ہے،جو ان کے باپ کی خالی جگہ کو پر کر سکتا ہے۔لیکن انھیں اس بات کا بھی احساس ہو رہا تھا کہ ان کے اس نئے سرپرست کو محبت کی نفسیات کا علم بالکل نہیں ہے۔کیونکہ انھوں نے ان دونوں کی ملاقات کرانے کے لیے جو نایاب طریقہ اختیار کیا تھا،وہ حرکت البشر جیسی تنظیم کے لیے تو عین مناسب تھا،لیکن محبت میں دھڑکنے والے دو دلوں کے لیے قضا کے پیغام سے کم نہیں تھا۔سچ یہ تھا کہ اب ان کے اندر کے سارے لطیف جذبات اور نرم گوشے صبح سے رونما ہونے والے مسلسل واقعات کی نذر ہو چکے تھے۔وہ اتنے گھبرائے ہوئے تھے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جانے کے باوجود اب وہ محبت کی

باتیں کرنے کے لائق نہیں تھے۔ اب آصفہ اس سے یہ بتانے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ اس سے کتنا ناراض ہے۔ نہ وہ یہ بتا سکتی تھی کہ ادھر کچھ دنوں سے وہ حرکت البشر کی غلامی سے بیزار ہونے لگی ہے اور اب اس کا جی چاہنے لگا ہے کہ کسی عام لڑکی کی طرح ہی اس کا بھی اپنا ایک گھر ہو، جہاں بچوں کی کھلکھلاہٹ ہو، شوہر کا انتظار ہو، گھر کے کام کاج ہوں، مکمل تنہائی کا احساس ہو، کسی طرح کا کوئی خوف نہ ہو، کسی کے حکم کا انتظار نہ ہو، لیکن وہ یہ سب باتیں اس مکدر ماحول میں نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس لیے ان باتوں کو اس نے کسی اور ملاقات پر ٹال دیا تھا۔ دوسری طرف آصفہ کے تعلق سے مسعود خاں کے اپنے منصوبے تھے۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اب وہ اپنے گاؤں لوٹنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اسی گاؤں جہاں وہ پچھلے بیس سالوں سے نہیں گیا۔ وہ یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ وہاں جا کر وہ آصفہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ان کے نئے خیر خواہ اور سرپرست نے یہاں جس طرح کا ماحول بنا دیا تھا، اس میں اس طرح کی باتیں کرنے کی ہمت وہ بھی نہیں کر پایا۔ دراصل وہ دونوں ہی شرمندگی کے گرداب میں پھنسے ڈوب اترا رہے تھے۔ امیر البشر کے چلے جانے کے بعد کافی دیر تک وہ اس مکان میں ساتھ رہے لیکن ان کی باہمی گفتگو میں اپنی ناعاقبت اندیشی، حماقت، بے احتیاطی اور طفلانہ پن کے علاوہ اور کوئی موضوع نہ آیا۔ وہ اس لیے بھی شرم سے پانی پانی ہوئے جا رہے تھے کہ ان کی باہمی محبت کا راز اب کوئی تیسرا بھی جانتا تھا۔ اور وہ تیسرا کوئی معمولی انسان نہیں، حرکت البشر کا امیر تھا۔

مسعود خاں کے دل میں اس جذباتیت کے ساتھ ساتھ کچھ اور جذبات بھی کروٹیں لے رہے تھے۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کبھی اُس مقام کی زیارت کر پائے گا جہاں سے اس کے امیر، اس کے مربی اور اس کے سرپرست کا تعلق تھا۔ اسے اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ اس کی خوش بختی سے آج وہ اس مکان میں کھڑا تھا، جہاں اس مثالی شخصیت کی پیدائش ہوئی تھی۔ وہ شخص، جس نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دیا تھا، یہیں پیدا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ مبہوت سا کھڑا رہا۔ اسے ہوش میں لانے کے لیے خود آصفہ کو کچھ جدوجہد بھی کرنی پڑی۔

دونوں نے کچھ دیر اور بات چیت کی۔ اپنی تنظیمی سرگرمیوں کی معلومات دیتے ہوئے باتوں باتوں میں مسعود نے آصفہ سے یہ بتا ہی دیا کہ چونکہ اب وہ کسی خفیہ تنظیم سے منسلک نہیں، بلکہ ایک رفاہی تنظیم کا سربراہ ہے، اس لیے اس کا ارادہ ہے کہ وہ اپنے گاؤں جا کر وہاں اپنے بزرگوں کی دعائیں

لے۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ اگر اس سفر میں آصف شبیر بھی اس کے ہمراہ ہو تو اسے بے پناہ خوشی ہوگی۔ آصف کو تو جیسے بنا کہے ہی اپنے دل کی مراد مل گئی تھی۔ وہ آج خود بھی تو مسعود خاں سے یہی سب کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ بھلا وہ مسعود کی اس درخواست کو کیوں قبول نہ کرتی۔ لیکن وہ خوف زدہ تھی کہ اب بدلے ہوئے ان حالات میں جب کہ ان کی محبت کا راز امیر البشر پر فاش ہو چکا ہے، اس کی اجازت نہیں مل پائے گی۔ اس پر مسعود خاں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ فوراً حرکت البشر کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں ایک رسمی درخواست پیش کرے کہ اسے ایک رکن کی حیثیت سے 'خدام ملک وملت' میں منتقل کر دیا جائے۔ مسعود کی یہ نئی تجویز آصف کے لیے دل خوش کن اور امید افزا تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی سابقہ خدمات کو دیکھتے ہوئے اس کی یہ درخواست ضرور قبول کر لی جائے گی۔ اور اگر ایسا ممکن ہو سکا تو نہ صرف یہ کہ اسے مسعود کے قریب رہنے کا زیادہ وقت ملے گا بلکہ وہ حرکت البشر کی سختیوں اور پابندیوں سے بھی آزاد ہو جائے گی۔ ویسے ان دونوں کو اب یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ جب سے حکومت ہند نے دوسری کئی تنظیموں کے ساتھ حرکت البشر کی سرگرمیوں پر بھی پابندی عائد کر دی ہے، عملاً اس کی تمام سرگرمیاں سرد خانے میں چلی گئی ہیں۔

اٹھاون

الیکشن کمیشن نے انتخابات کی تاریخوں کا اعلان کر دیا تھا۔

حکمراں جماعتوں کا اشتراک مطمئن تھا کہ ملک کے عوام ان کی کارکردگی سے بے خبر نہیں ہیں۔ گذشتہ برس ان کے لیڈروں کا ملک کے گوشے گوشے میں جس طرح استقبال ہوا تھا، اس سے یہ بات بخوبی ظاہر تھی۔ ان جماعتوں کے اپنے اپنے سروے کے مطابق بھی اس بار انھیں کامیابی سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ یہ یقین بے سبب بھی نہیں تھا۔ حکومت میں شامل جماعتوں نے لوگوں کی توقعات سے بھی زیادہ کارنامے انجام دیے تھے۔ ہندوستان میں ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ لوگ برسر اقتدار جماعت سے پانچ سال کا وقفہ گذر جانے کے بعد بھی پوری طرح مطمئن ہوں۔ لیکن اس بار ایسا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اول تو لوگوں کی امیدوں کے برخلاف یہ حکومت پورے پانچ سال تک چلی تھی۔ دوسرے اس دوران ہندوستان کی معاشی ترقیات کا گراف خاصا بلندی پر چلا

گیا تھا۔ ڈالر کے مقابل روپے کی قیمت اتنی بڑھی تھی، کہ پچھلے ساٹھ سالوں کی سب سے بلند سطح پر تھی ،لوگوں کی آمدنی اور قوت خرید میں اضافہ ہوا تھا۔ مرکزی پے کمیشن کی تازہ رپورٹ سے سرکاری ملازم بھی خوش اور مطمئن تھے۔ زرعی پیداوار میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ شہر کی سڑکوں پر سائیکلوں کی تعداد دیکھتے دیکھتے کافی کم ہوگئی تھی اور اسی تناسب سے اسکوٹروں، موٹر سائیکلوں اور کاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا تھا۔ ایسے ہی مناظر اب گاؤں میں بھی نظر آنے لگے تھے۔ حکمراں جماعتیں ان تمام باتوں کو لوگوں کی خوش حالی میں اضافے کے طور پر دیکھ رہی تھیں۔ اس دوران دیہی بہبود کے مختلف پروگرام بھی چلائے گئے، جن کے خاطر خواہ نتائج برامد ہوے تھے۔ بیشتر گاؤوں تک اب پختہ سڑکیں پہنچ چکی تھیں۔ تقریباً ہر گاؤں میں بجلی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ ابھی بجلی کا نظام اتنا پختہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس کی مسلسل فراہمی یقینی ہو پاتی، پھر بھی رات کے وقت وہاں بجلی کا رہنا یقینی ہو گیا تھا۔ بجلی کے نظام کی جدید کاری کی سمت پیش قدمی کا سلسلہ چل پڑا تھا اور امید تھی کہ آنے والے دنوں میں جلد ہی اس صورت حال پر مکمل طور پر قابو پالیا جائے گا۔ حکومت امریکہ سے ایٹمی معاہدے کا عمل جاری تھا، جس کی تکمیل کے بعد کم از کم بجلی کا مسئلہ تو ہمیشہ کے لیے حل ہی ہو جانے والا تھا۔ ان میں سب سے حیرت انگیز اور قابل قدر بات یہ تھی کہ پچھلے پانچ سالوں میں ہندوستان میں کہیں کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا تھا اور یہ شاید ملک کی آزادی کے بعد کی تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا۔ اقتدار میں شریک جماعتوں نے حل کے اس سمت جو مثالی اقدامات کیے تھے ان کے خاطر تسلی بخش نتائج اب سب کے سامنے تھے۔

لیکن حزب مخالف کی جماعتوں کا حال دوسرا تھا۔ حکومت کی بہتر کارکردگی نے اقتدار تک پہنچنے کے ان کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ پریشان تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسی کس بات کو ترجیحی طور پر انتخابی مدعا بنائیں جس سے ان کی مرضی کے مطابق نتائج برامد ہو سکیں۔ کام مشکل تھا۔ انھوں نے پہلے عوام کے سامنے ملک میں بڑھتی ہوئی قیمتوں کی بات کی، جس میں واقعی زبردست اضافہ ہوا تھا۔ افراط زر کا مسئلہ واقعی تشویش ناک صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ لیکن چند ہی دنوں میں ان جماعتوں کو معلوم ہو گیا کہ اس سے وہ عوام کی توجہ اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب نہیں ہو رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کا ذکر کرنا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد

انھوں نے حکمراں جماعتوں کے اختلافات اور ان کی باہمی کھینچ تان کو طشت از بام کرنے کا منصوبہ بنایا، وہ بھی ناکام ثابت ہوا۔ عوام اب بھی حکمرانوں کی قصیدہ خوانی میں مصروف تھے۔ چنانچہ انھوں ایک بار پھر دا اپنے بارہا آزمائے ہوئے حربے کا اعادہ کرنے کے بارے میں سوچا۔ حالانکہ وہ اب اس بات کو خود تسلیم کرنے لگے تھے کہ رام مندر کی تعمیر کا وعدہ، ہندو مفادات کے تحفظ کی یقین دہانی، ہندو راشٹر کے قیام کا خواب دکھانے جیسی باتوں سے اب عوام اوب چکے ہیں اور اب اس طرح کی کوئی بات کم از کم وہ کسی سیاسی لیڈر کی زبان سے سننا نہیں چاہتے تھے۔ ان معاملات کو الیکشن کا موضوع بنانے میں ایک بڑی دشواری یہ بھی تھی کہ الیکشن کمیشن نے نئے قانون کی رو سے فرقہ وارانہ سیاست پر پابندی عائد کر دی تھی اور بڑی سختی سے اس کی نگرانی بھی کی جا رہی تھی۔ لیکن ان پارٹیوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس موضوع کو اگر اٹھالیں گے تو چند ہی روز میں اس میں ایسی شعلگی پیدا ہو جائے گی کہ حکمراں جماعت کے سارے کارنامے اس کی لپٹوں میں جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ انھیں ہندوستانی عوام کی نبض شناسی کا دعویٰ تھا۔ یہ دعویٰ اتنا غلط بھی نہیں تھا۔ دھرم اور مذہب ہندوستانی نبض کی وہ کمزور رگیں تھیں، جن کی مدد سے اقتدار پر قابض ہونے کی کوششیں کم از کم گذشتہ پانچ سو سالوں کی تاریخ میں بیشتر کامیاب ہی رہی تھیں۔ یہ وہ واحد مسئلہ تھا جس کے فریب میں ہندوستانیوں کو جب چاہے الجھایا جا سکتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ لوگ برسر اقتدار جماعتوں کی تمام اچھی بری کارکردگی کو جلدی سے بھول جانے کے عادی ہیں۔ بس انھیں تھوڑی محنت کرنی ہوگی، کوئی ایسا راستہ نکالنا ہوگا کہ الیکشن کمیشن کی ٹیڑھی نظر سے محفوظ رہ کر وہ یہ کام انجام دے سکیں۔ انھیں یقین تھا کہ اگر وہ اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہوئے تو جلد ہی حکومت کے تمام کارنامے عوام کے دلوں سے کھرچ کر پھینک سکتے ہیں۔ انھیں اس بات کی بھی پوری امید تھی کہ اس کے بعد انھیں اقتدار سے کوئی دور نہیں رکھ سکتا۔

جیسے جیسے الیکشن کی تاریخیں قریب آتی جا رہی تھیں، سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کے شہروں اور دور دراز کے گاؤوں کے دورے، چھوٹے بڑے پیمانے پر عوامی خطابات کا انعقاد اور گھر گھر جا کر ووٹروں سے رابطے کی مہم زور پکڑتی جا رہی تھی۔ تقریباً ہر جماعت کے بڑے لیڈر منصوبہ بند طریقے سے اپنی باتیں عوام کے سامنے رکھ رہے تھے۔ دولت، طاقت، شراب، شباب کے سارے آزمودہ ہتھکنڈے اس بار بھی بے دریغ استعمال کرنے میں نہ حکمراں جماعت پیچھے تھی نہ حزب مخالف کی

جماعتیں۔ سب کچھ داؤ پر لگایا جا رہا تھا۔ ہندوستان میں جمہوریت کی بقا اور تحفظ کے لیے جمہور کو استعمال کرنے کا جو بھی جائز یا ناجائز طریقہ کار جس کی سمجھ میں آ رہا تھا وہ اسے استعمال کرنے سے دریغ نہیں کر رہا تھا۔ حکمراں خوش اور مطمئن تھے کہ ان کے فلاحی اور ترقیاتی کاموں کو ہندوستانی عوام ابھی تک بھولے نہیں ہیں۔ ان کے لیڈروں کی تقاریر کے دوران لاکھوں کی تعداد میں عوام کی شرکت اس بات کی گواہی بھی دے رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں حزب اختلاف کی جماعتوں کے پنڈال اکثر خالی رہ جاتے تھے، جو رفتہ رفتہ ان کی تشویش میں اضافہ کر رہے تھے۔ جیسے جیسے الیکشن کی تاریخیں قریب آتی جا رہی تھیں ان کی پریشانیوں اور اقتدار کی ان کی بھوک میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

الیکشن کمیشن کو اس طرح کی کچھ اطلاعات موصول ہو رہی تھیں کہ کچھ سیاسی جماعتیں ایک بار پھر مسجد مندر کا نام لے کر، گودھرا اور گجرات کا حوالہ دے کر موجودہ حکمرانوں کی مسلم نواز سیاست کی تفصیلات بتا کر خفیہ طور پر عوام کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہیں کہ ہندوستان میں خود ہندوؤں کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ وہ لوگوں کو باور کرا رہے تھے کہ یہاں رفتہ رفتہ مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کی نیتیں اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔ وہ چار چار شادیاں اسی لیے کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کیے جاسکیں اور اگر سیاست کا یہ انداز جاری رہا اور برسر اقتدار پارٹی کی جانب سے اسی طرح ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی تو ایک بار پھر ہندوستان مسلمانوں کے زیر اقتدار آ جائے گا اور اس بار یہ مسلمان سارے ہندوؤں کو مسلمان بنا کر ہی چھوڑیں گے۔ کیونکہ اس بار ان کا ارادہ محض حکومت کرنے کا نہیں ہوگا، اس دیش کو مسلم راشٹر بنانے کا ہوگا۔ اطلاعات مل رہی تھیں کہ وہ گھر گھر جا کر لوگوں سے رابطہ پیدا کر رہی ہیں اور ان کو مذہبی بنیادوں پر مشتعل کر کے الیکشن میں اپنے حق میں ووٹ دینے کی التجا کر رہی ہیں۔ لیکن یہ اطلاعات کچھ مہمل سی تھیں۔ ان کا کوئی ٹھوس ثبوت الیکشن کمیشن کے پاس نہیں تھا، جس کی بنیاد پر وہ کوئی کارروائی کر سکے۔ اپنی تمام خفیہ سرگرمیوں کو تیز کرنے کے باوجود وہ ان کے خلاف کوئی واضح ثبوت حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے لگا کہ اتنے بڑے ملک میں اتنے چھوٹے پیمانے پر کیے جانے والے کاموں پر نظر رکھنا ناممکن بھی ہے اور ان کا انتخابات پر اثر انداز ہونا بھی مشکوک ہے۔ چنانچہ اس نے ان خبروں کو بہت زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے نظر انداز کیا۔ اور شکایات کرنے والوں کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ انھوں نے اپنے طور پر اس سلسلے میں معلومات کی، جس میں یہ باتیں سچ ثابت نہیں ہوئیں۔

الست

ہندوستان کے کسی دور دراز علاقے کے کسی خفیہ مقام پر حرکت البشر کی مجلس عاملہ کی خصوصی نشست جاری تھی۔ جغرافیائی شواہد کی بنیاد پر یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ علاقہ وسطی ہندوستان میں کہیں ہوگا۔ جس خیمے میں یہ نشست چل رہی تھی اس کے چاروں طرف ہرا بھرا جنگل تھا۔ خیمے کے باہر کچھ سیاہ فام آدیواسی پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے ننگے بدن اور تانبے جیسے چمکتے ہوئے جسم بتا رہے تھے کہ اسے جنوبی مدھیہ پردیش میں کہیں ہونا چاہیے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے شہری ہنگامہ آرائیوں سے دور یہ جگہ پہلے بھی حرکت البشر کی سرگرمیوں کا مرکز رہ چکی ہے۔ تنظیم پر پابندی لگنے کے بعد یہ ان کی پہلی نشست تھی۔ اس نشست میں اراکین مجلس عاملہ کے علاوہ تنظیم سے متعلق تمام عہدے داروں کو بھی لازمی طور پر شریک ہونے کا حکم دیا گیا تھا، تا کہ ان مسائل پر گفتگو کی جاسکے جو تبدیل شدہ نئی سیاسی صورت حال میں تنظیم کے سامنے تھے۔ خلاف توقع اس نشست کی صدارت امیر البشر کی جگہ ان کے نامزد قائم مقام صدر ضرغام حیدر کے سپرد تھی۔ خود امیر البشر احمد عبداللہ الہندی اپنی خرابی صحت کی وجہ سے حیدرآباد کے ایک نجی اسپتال میں زیر علاج تھے اور اس اہم نشست میں شرکت کرنے کی حالت میں نہیں تھے۔ نشست کے موضوعات طے شدہ تھے، جن پر تمام اراکین کو غور کرنا تھا۔ زیر غور موضوعات میں سر فہرست امیر البشر کا وہ خط تھا جس میں انھوں نے اراکین سے گزارش کی تھی کہ ان کی خرابی صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اپنے لیے نئے امیر کا انتخاب کر لیں۔ ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ تنظیم کی ایک خاتون کارکن نے درخواست کی تھی کہ اس کا تبادلہ حرکت البشر سے خدام ملک ملت میں کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی صورت حال پر بھی گفتگو ہوئی تھی، جو ان کے نقطہ نظر سے ایک بار پھر تشویشناک صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔

حالیہ انتخابات کے نتائج نے تمام عوامی اندازوں کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ اخبارات اور ٹی وی چینلوں کے امکانات اور ایگزٹ پول کے نتائج سب بے معنی ثابت ہوئے تھے اور اپنے تمام کارہائے نمایاں کے باوجود برسر اقتدار پارٹی کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا تھا اور اب ہندوستان میں ایک نئی مخلوط حکومت برسر اقتدار آ گئی تھی، جس میں چھوٹی بڑی اٹھارہ پارٹیاں شامل تھیں۔ سب سے زیادہ اراکین کی حامل پارٹی سے وزیر اعظم کا انتخاب ہوا تھا، جس نے آتے ہی اپنی پارٹی کے الیکشن مینی فیسٹو میں کیے گئے وعدے کے عین مطابق سابقہ حکومت کے کئی فیصلوں کو رد کرنا شروع کر دیا تھا، جس میں فرقہ پرست اداروں اور تنظیموں پر پابندی عائد کرنے کا فیصلہ بھی شامل

تھا۔اس کی جگہ ایک آرڈیننس نے لے لی تھی،جس کی رو سے کچھ خطرناک مسلم تنظیموں کو چھوڑ کر تمام تنظیموں پر سے پابندی ہٹالی گئی تھی۔ان خطرناک تنظیموں میں حرکت البشر کا نام بھی شامل تھا،جس پر پابندی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

میٹنگ میں سب سے پہلے امیر کی صحت کو موضوع گفتگو بنایا گیا۔ان کی مسلسل گرتی ہوئی صحت اب حرکت البشر کے اراکین کے لیے تشویش کا سبب بنتی جارہی تھی۔چنانچہ ان کے لیے نئے امیر کا انتخاب ناگزیر ہو گیا تھا۔ایک طرح سے امیر البشر نے اپنا قائم مقام بنا کر یہ اشارہ تو دے ہی دیا تھا کہ ان کی نظر میں ضرغام حیدر ہی امارت کے لیے سب سے مناسب امیدوار ہے۔اس تجربہ کار انسان اور کامیاب امیر کے فیصلے سے اختلاف کرنے کی جرات بھلا کون کر سکتا تھا۔چنانچہ تمام اراکین نے بہ یک آواز ضرغام حیدر کو اپنا امیر تسلیم کرنے پر اتفاق کیا۔لیکن اس کا حتمی فیصلہ مجلس عام میں ہونا تھا،جس میں مجلس عاملہ کو اپنا مجوزہ نام پیش کر کے رائے شماری کرانی تھی۔اس لیے فی الحال ضرغام حیدر کو امیر کے قائم مقام کی حیثیت سے کام کرتے رہنے پر سب نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔

دوسرا مسئلہ ہندوستان کی نئی سیاسی صورت حال کا تجزیہ اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر غور و خوض کا تھا۔مجلس عاملہ کے بیشتر اراکین کا خیال تھا کہ موجودہ حکومت زیادہ دنوں تک اپنا اقتدار قائم نہیں رکھ پائے گی،کیونکہ اس اتحاد میں ایسی موقع شناس سیاسی پارٹیاں بھی شامل ہیں جو صرف اپنے مفادات کے علاوہ کسی اور مسئلے پر توجہ دینے کی عادی نہیں ہیں۔ان میں سے اکثر جماعتیں تو ایسی بھی ہیں جو واقعتاً اپنے چھوٹے سے علاقے کے علاوہ،جہاں سے ان کا تعلق ہے،ہندوستان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں۔اس اشتراک کے قیام کی بنیاد ہی یہی ہے کہ ان سے ان کے مفادات کی تکمیل کا وعدہ کیا گیا ہے۔چنانچہ اراکین کا اندازہ تھا کہ جلد یا بہ دیر ان کے باہم متضاد مفادات میں ایک نہ ایک دن تصادم ہونا ہی ہے۔اور ان کا یہی ٹکراؤ ان کے انتشار کا سبب بن جائے گا۔اراکین کی اکثریت کو اس بات کا یقین تھا کہ بہت جلد یہ نئی حکومت گر جائے گی اور حسب ضابطہ نئے انتخابات کا اعلان کر دیا جائے گا۔اس لیے ان اراکین کی تجویز تھی کہ ہمیں اپنی تمام سرگرمیوں کو معطل رکھتے ہوئے خاموشی سے مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔انشاء اللہ اس مشترکہ حکومت کا سورج غروب ہوگا،تو ہم پھر آزادانہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں گے۔

تیسرا مسئلہ دیکھنے میں بھلے ہی معمولی نظر آ رہا تھا لیکن اراکین جانتے تھے کہ یہ کم اہم نہیں ہے۔ آصفہ شبیر حرکت البشر کی قدیم، آزمودہ کار، وفادار اور باصلاحیت کارکن تھی۔ اس نے حرکت البشر کی رکنیت اختیار کرنے کے بعد کئی قابل ذکر کارنامے انجام دیے تھے۔ اس کی کاوشوں سے مسلمانوں کے درمیان تنظیم کی نیک نامی میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ خصوصاً اس نے عورتوں کے درمیان رہ کر مزاج سازی کا جو کام کیا تھا وہ حیرت انگیز تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھی، باصلاحیت تھی، حوصلہ مند تھی اور جو بھی ذمے داریاں اس کے سپرد کی جاتی تھیں انھیں بغیر کوئی سوال کیے پوری وفاداری کے ساتھ انجام دینا اس کے مزاج کا حصہ تھا۔ اسی آصفہ شبیر نے اراکین سے یہ درخواست کی تھی کہ اس کا تبادلہ حرکت البشر سے خدام ملک وملت میں کر دیا جائے۔ اپنی اس درخواست کے پس پشت اس نے اپنی کچھ ذاتی پریشانیوں کا ذکر کیا تھا اور اس کی سابقہ خدمات کے پیش نظر اراکین کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے لیکن ان کا مسئلہ یہ تھا کہ اس کی درخواست کو منظور کر لینا کئی دوسرے مسائل کا سبب بن سکتا تھا۔ دراصل حرکت البشر پر پابندی کا اعلان ہونے کے بعد اس تنظیم میں داخلی انتشار کی کچھ شکلیں نمودار ہونے لگی تھیں۔ یہ بات اراکین کی نظر میں تھی کہ اس کے بیشتر کارکن اب حرکت البشر سے اپنا رشتہ توڑ کر جانا چاہتے ہیں۔ ان کی دلیل تھی کہ چونکہ اب یہاں رہ کر وہ کچھ کر پانے کی حالت میں نہیں رہ گئے ہیں، اس لیے ان کا کسی دوسری تنظیم کے لیے اپنی خدمات پیش کرنا مناسب بھی ہوگا اور ملک وملت کے لیے افادی بھی۔ ان کی یہ باتیں غلط بھی نہیں تھیں۔ لیکن انھیں تسلیم کر لینے سے خود حرکت البشر کے انتشار کا علاج ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اراکین مجلس عاملہ کی اکثریت ایسی کسی درخواست کو اپنی منظوری دینے کے خلاف تھی۔ وہ اس سے قبل بھی حرکت البشر کے ضوابط کا حوالہ دیتے ہوئے ایسی درخواستوں کو رد کرتے آئے تھے، چنانچہ اسی بنیاد پر انھوں نے آصفہ شبیر کی درخواست بھی رد کر دی۔

مسائل

مجلس عاملہ کی نشست کو ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اراکین کو ایک بار پھر باہم مل بیٹھ کر کچھ اہم مسائل پر غور وفکر پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

ضرغام حیدر اس وقت امیر البشر احمد عبداللہ الہندی کے نمائندے کی حیثیت سے مدراس میں تھا، جہاں دو دن بعد اسے کانچی پورم جا کر شنکر آچاریہ سے ملاقات کرنی تھی۔ یہ ملاقات شنکر آچاریہ کی

خواہش اور حرکت البشر کی ایما سے خفیہ طور پر طے ہوئی تھی۔ خطۂ دکن کے شنکر آچاریہ حرکت البشر کی فلاحی سرگرمیوں سے بخوبی واقف تھے۔ اس تنظیم کے سربراہ کے ساتھ مل کر وہ ہندوستانی سیاسیات میں در آئی فرقہ واریت پر کچھ تبادلہ خیال کرنا چاہتے تھے۔ اس ملاقات کے مقصد سے ابھی دو گھنٹہ پہلے ہی ضرغام حیدرآباد سے مدراس پہنچا تھا۔ حیدرآباد میں اُس نے بیمار امیر سے ملاقات کی تھی۔ وہ کافی نحیف ہو گئے تھے لیکن اس طویل علالت کے باوجود ان کا دماغ پوری طرح کام کر رہا تھا۔ انھوں نے شنکر آچاریہ سے ہونے والی ملاقات کے تعلق سے اسے کچھ مفید مشورے بھی دیے تھے۔ امیر کی مزاج پرسی کے بعد وہ سیدھا ایر پورٹ چلا گیا تھا اور اب وہ مدراس میں تھا۔ اس کا قیام تنظیم کے ایک رضاکار کے گھر پر تھا۔ ابھی وہ اپنے میزبان کی مہمان نوازی اور لذت کام ودہن سے آسودہ ہو کر کچھ دیر آرام کرنے کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ اسے حیدرآباد سے ایک کارکن نے یہ دل خراش اور صبر آزما خبر سنائی کہ امیر البشر حضرت احمد عبداللہ الہندی حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب اپنے مالک حقیقی سے جا ملے ہیں۔ اس نے بغیر اس کے دریافت کیے یہ بھی بتایا کہ آپ کے یہاں سے روانہ ہونے کے تقریباً دو گھنٹے بعد وہ کوما میں چلے گئے تھے اور انتقال سے پہلے تک پھر دوبارہ انھیں ہوش نہیں آیا۔ چنانچہ آخری وقت وہ کسی سے کوئی بات نہیں کر سکے۔ یہ سن کر وہ سکتے میں آ گیا تھا۔ حالانکہ یہ خبر اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھی لیکن اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ اپنے ہمدرد بزرگ اور سرپرست سے محروم ہو گیا ہے۔ اپنے والد کے انتقال کے وقت اسے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ وہ یتیم ہو گیا ہے لیکن آج اس لمحے اسے شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اچانک اس کے کاندھوں پر اتنا بڑا بوجھ آ پڑا ہے، جسے سنبھالنے کی صلاحیت اس میں نہیں ہے۔ اس نے خود کو مفلوج تصور کیا۔ اسے لگا کہ وہ ایسے لوگوں کے درمیان ہے جو اسے عظیم تصور کرتے ہیں لیکن وہ خود اپنے اندر ایسی کوئی خوبی نہیں پاتا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک شاعر اور نرم دل انسان ہے۔ ایسی وسیع الفکر تنظیم کی سربراہی کے لیے، جس کا دائرہ کار تمام ہندوستان ہو، جس طرح کے اولوالعزم، عالی ہمت، دور اندیش اور ثابت قدم سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ خود ویسا نہیں ہے۔

لیکن جلد ہی وہ اپنے ہوش وحواس میں واپس آ گیا۔ اب اس کے دماغ میں جیسے روشنی کی ایک کرن دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنی فکر انگیز تنہائی کے اس لمحے میں خود ہی اثبات میں گردن ہلائی، جس کا مطلب شاید یہ تھا کہ اسے وہ طریقہ مل گیا ہے جس سے اس کا یہ کام آسان ہو سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی

اسے یک گونہ سکون کا احساس ہوا، اس نے اپنے اندر کچھ فرحت وتازگی محسوس کی اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اوپر آ پڑنے والی نئی ذمے داریوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

سب سے پہلے اسے شنکر آچاریہ سے ہونے والی ملاقات کے التوا کا انتظام کرنا تھا۔ یہ ہندوستان کے دو اہم اداروں کے درمیان ہونے والی نہایت اہم ملاقات تھی لیکن اب مجبوراً اسے غیر معینہ مدت تک کے لیے ملتوی کرنے کی ضرورت آ پڑی تھی۔ ضرغام حیدر انھیں معقول طریقے سے اس کی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے میزبان کو طلب کیا اور سب سے پہلے اسے ہی امیر البشر کے انتقال کی خبر دی۔ میزبان نے اس خبر کو سننے کے بعد پہلے تو زیر لب انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا، پھر اسے جانے کیا ہوا۔ اس نے یکا یک ضرغام حیدر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر' اللہ جلیل' کا ایک زبردست نعرہ بلند کیا۔ ضرغام حیدر نے اس کی اس دیوانگی کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی لیکن فوری طور پر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے فی الحال اپنے میزبان کے جذبات میں مزاحم ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ حالانکہ اس کے اس عمل کا مطلب واضح تھا کہ کم از کم اس نے اپنے طور پر اسے امیر البشر تسلیم کر لیا ہے۔ یعنی سردست اب وہ اس کی نظر میں ضرغام حیدر سے 'امیر البشر ضرغام حیدر' بن چکا تھا۔

چونکہ وہ اس صورت حال سے جلد باہر نکلنا چاہتا تھا اس لیے جواب میں اللہ جلیل نہیں کہا، جو اس نعرے کا لازمی جواب تھا۔ ضرغام کے لیے ہر وہ چیز لائق احترام تھی جس کا تعلق امیر البشر احمد عبداللہ الہندی سے تھا۔ اور یہ نعرہ بھی دوسری کئی چیزوں کی طرح ہی ان سے منسوب تھا، اس لیے احتراماً اس نے اسے دہرانے سے گریز کیا تھا۔ اس نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے اپنے میزبان سے کہا۔ تم اس بات کو سمجھ سکتے ہو کہ اب مجھے فوری طور پر حیدرآباد جانا ہوگا۔ یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے میں تمھیں ایک نہایت اہم ذمے داری سونپنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میری بات دھیان سے سنو۔ تم کل صبح میرا پیغام لے کر کانچی پورم چلے جاؤ اور وہاں پہلے تو شنکر آچاریہ سے ملاقات کی کوشش کرو اور اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکے تو ان سے متعلق کسی معتبر شخص کو حرکت البشر کی موجودہ صورت حال اور امیر البشر کے انتقال سے آگاہ کر دو۔ اور ان سے معذرت کرتے ہوئے کہو کہ ہم آئندہ پھر کبھی اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔

ضروری انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد وہ اگلی فلائٹ سے حیدرآباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں اس نے امیر کی تدفین میں شرکت کی۔ امیر کے مداحوں، حرکت البشر کے رضا کاروں اور

کارکنوں کی ایک کثیر تعداد کے علاوہ شہر کے ہزاروں لوگ بھی ان کے جنازے کے ساتھ تھے، جو ان کی عوامی مقبولیت کی دلیل تھی۔ ان میں سے بیشتر لوگ یہ بہر حال نہیں جانتے تھے کہ جن بنیادوں پر وہ احمد عبداللہ کو عظیم تصور کرتے ہیں وہ ان سے بھی زیادہ عظیم تھے۔

تدفین میں شرکت کے بعد مقامی طور پر ضروری انتظامات کر کے اس نے فوری طور پر مجلس عاملہ اور مجلس عام کی مشترکہ ہنگامی نشست کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ اس نے تمام متعلقہ لوگوں کو فون پر ضروری ہدایات جاری کیں۔ اس کی حیثیت کارگزار امیر کی تو پہلے ہی سے تھی، اس لیے تنظیم کے اندر کسی طرح کے انتشار کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ ان انتظامات کے بعد وہ خود بھی فوری طور پر اس جگہ کے لیے روانہ ہو گیا جہاں اس مخصوص ہنگامی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔

نشست کی کارروائی حسب معمول اسی کی صدارت میں شروع ہوئی۔ اس میٹنگ میں شرکت کے لیے اس نے اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اپنی ذیلی تنظیم 'خدام ملک وملت' کے سربراہ مسعود خاں کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ ضرغام کی خواہش تھی کہ اس نشست میں جو بھی فیصلہ لیا جانے والا ہے، مسعود خاں بھی اس کا گواہ بنے۔ میٹنگ شروع ہونے سے پہلے مسعود خاں نے ضرغام حیدر کے قریب آ کر اپنی تعزیت پیش کی۔ اس کے بعد کچھ دیر تک تعزیت پیش کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ تمام لوگ ضرغام کی خدمت میں تعزیت پیش کرنے کی یہ رسم ادا کر رہے تھے۔ ضرغام ہی کی طرح مسعود خاں بھی امیر کے انتقال سے بے حد مغموم تھا۔ نشست کے باقاعدہ آغاز سے پہلے اراکین کے درمیان مرحوم امیر کو یاد کرتے ہوئے ان کے اوصاف حمیدہ پر کچھ گفتگو ہوئی۔ مختلف اراکین نے ان سے متعلق اپنے اپنے تجربات و مشاہدات بیان کیے۔ اس کے بعد اجتماعی طور پر ان کی مغفرت کے لیے دعا کی گئی۔

میٹنگ کا آغاز ہوا۔ اولین زیر غور مسئلہ امیر البشر کے انتقال کے بعد حرکت البشر کی سربراہی کا تھا۔ تنظیم کی موجودہ صورت حال اور ملکی و بین الاقوامی حالات میں اس تحریک کی اہمیت اور جواز پر بھی غور و خوض ہوتا تھا۔ اراکین کی اکثریت چاہتی تھی کہ سب پہلے اس بات کی توثیق ضروری ہے کہ اب ضرغام حیدر ہی ہمارے باقاعدہ امیر ہیں، اس لیے ہمیں پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کی رسم ادا کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی سارے اراکین ایک ایک کر کے اس کے پاس آئے اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا کہ وہ ہمیشہ امیر البشر کے تابع رہیں گے اور ہر حال میں ان کے احکامات کی

تعمیل کریں گے۔ مسعود خاں کا تعلق چونکہ اب حرکت البشر سے نہیں رہ گیا تھا اس لیے اس کو بیعت سے مستثنیٰ سمجھا گیا۔

اس رسمی کارروائی کے بعد نئے امیر نے اپنی جگہ کھڑے ہوکر تمام موجود اراکین کو مخاطب کیا۔ حالانکہ امیر کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ کھڑے ہوکر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ لیکن اس وقت ضرغام حیدر کے دل میں کچھ اور ہی اتھل پتھل چل رہی تھی۔ اس نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ذاتی طور پر مجلس عاملہ اور مجلس عام کے تمام اراکین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اپنا امیر بنانے کے لائق سمجھا اور مجھ پر اعتماد کیا۔ اب چونکہ آپ لوگوں نے مجھے اپنا امیر تصور کرلیا ہے اس لیے مجھے یہ امید ہے کہ آپ لوگ میری بات توجہ سے سنیں گے۔'' اس کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ تمام لوگ اس حقیقت سے تو واقف ہی ہیں کہ حرکت البشر نے امیر احمد عبداللہ الہندی کی سرکردگی میں ہندوستان کے سیاسی اور سماجی منظرنامے میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، جو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ تمام اہل وطن کے لیے بھی مفید ثابت ہوئی ہیں۔ اس کامیابی کے پیچھے حرکت البشر کے تمام چھوٹے بڑے عہدے داران، اس کے تمام مجاہدین، اس کے تمام کارکنان، اس کے تمام رضاکاران اور اس کے تمام معاونین کی مسلسل کاوشیں شامل رہی ہیں۔ آج اس موقعے پر میں ان تمام لوگوں کے تعاون کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور ان سب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے حرکت البشر پر اعتبار کیا اور نتیجے میں حرکت البشر کا اعتبار لوگوں میں قائم ہوا۔ حالانکہ اس تنظیم سے اپنا رشتہ جوڑے رکھنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ قدم قدم پر خطرات تھے۔ ہمارے کچھ معاونین صرف اس تنظیم سے تعلق ثابت ہونے کی بنا پر مختلف قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہوئے۔ لیکن ہم نے اور ہمارے معاونین نے کبھی اور کسی حالت میں ہمت نہیں ہاری اور اس تنظیم پر ہمارا اعتماد برقرار رہا۔ اب اس بات میں کسی طرح کا کوئی شبہ نہیں رہ گیا ہے کہ اس تنظیم نے تاریخ ساز کارنامے انجام دیے ہیں۔ اور ہم سب کو اس کامیابی اور نیک نامی کے لیے اللہ رب العزت کا شکر گزار ہونا چاہیے۔'' اس نے چند ثانیوں کے لیے سکوت اختیار کیا، جیسے وہ طے نہ کر پا رہا ہو کہ اسے کون سی بات پہلے اور کون سی بعد میں کہنی چاہیے۔ بالآخر اس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن

مجھے اب آپ حضرات سے یہ کہنا ہے کہ حرکت البشر اپنا تاریخی فریضہ انجام دے چکی ہے۔ ہمارے وطن کے لیے اب اس تنظیم کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ موجودہ سرکار نے اسے فرقہ پرست قرار دے کر سابقہ سرکار کی طرح ہی اس کی تمام سرگرمیوں پر غیر معینہ مدت کے لیے پابندی عائد کر دی ہے۔ ہندوستان کی روز بروز بدلتی ہوئی صورت حال نے اب ہمیں وہاں پہنچا دیا ہے جہاں کبھی ہم فرقہ پرست تنظیموں کو پہنچانا چاہتے تھے۔ اس میں ہمیں جو جزوی کامیابی ملی تھی، وہ بھی عارضی ثابت ہوئی۔ نئی حکومت نے نہ صرف یہ کہ ان تمام فرقہ پرست تنظیموں پر سے پابندی ہٹالی ہے بلکہ ہمیں شک کے دائرے میں کھڑا کر کے مورد عتاب بھی گردانا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم اب اپنی سرگرمیاں جاری رکھ پانے کی حالت میں نہیں رہ گئے ہیں۔ اگر ہم خفیہ طور پر اپنی سرگرمیاں جاری بھی رکھیں تو ہماری حیثیت ہمیشہ مشکوک رہے گی اور مجھے ڈر ہے کہ اس کے نتیجے میں ہم نے عوام کا جو اعتماد، محبت، خلوص اور نیک نامی حاصل کی ہے، اسے بھی گنوا بیٹھیں گے۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ ہم آج کی اس نشست میں حرکت البشر کو تحلیل کر دیں۔ اس سلسلے میں اگر آپ لوگ کچھ کہنا چاہیں تو اس کا استقبال ہے۔' یہ کہتے ہوئے تو منتخب امیر البشر ضرغام حیدر نے اپنی جگہ سنبھال لی۔

'حرکت البشر سے متعلق تمام لوگوں کے لیے ہمارا یہ فیصلہ مشکل کھڑی کر سکتا ہے۔ ہمارے اتنے تربیت یافتہ مجاہدین ہیں، رضا کاروں کی ایک بڑی جماعت ہے، ان سب کا کیا ہوگا؟ یہ کہاں جائیں گے؟ امیر البشر کی تجویز پر اگر ہم عمل کرتے ہیں تو ایک طرح سے یہ ان تمام لوگوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی جنھوں نے ہم پر اعتماد کرتے ہوئے ہم سے تعلقات استوار کیے تھے۔ ہم ہمیشہ کے لیے ان سب کا اعتبار کھو بیٹھیں گے۔' ایک رکن نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

'یہ آپ نے ایک اچھا نکتہ اٹھایا ہے۔' ضرغام حیدر نے کہا۔ 'میں نے اس مسئلے پر کافی غور کرنے کے بعد یہ تجویز یہاں رکھی ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو میں خود بھی ابھی تک کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا ہوں۔ آپ سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ہم اپنے کسی معاون کو، خواہ اس کا تعلق حرکت البشر کے کسی بھی شعبے سے رہا ہو، اس طرح نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے امید ہے کہ میرے عزیز دوست مسعود خاں میری اس درخواست کو نامنظور نہیں کریں گے کہ وہ عارضی طور پر ہمارے تمام لوگوں کو خدام ملک وملت جیسی نیک نام تنظیم سے منسلک کر لیں۔ اس طرح مناسب وقت آنے پر جب ہم اپنی سرگرمیاں دوبارہ شروع

کر پائیں گے تو ہمارے یہ تمام تربیت یافتہ کارکن ہمیں واپس مل جائیں گے۔ انھوں نے مسعود خاں کی جانب اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا۔

تمام اراکین کی طرح مسعود خاں بھی اس طرح کی بات چیت کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بھی یہ سب سن کر ایک سکتے جیسی کیفیت سے دو چار تھا۔ لیکن وہ اتنی بات اچھی طرح جانتا تھا کہ وقت کو دیکھتے ہوئے ضرغام حیدر کی تجویز نامناسب نہیں ہے۔ بلکہ اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ اس وقت ہمارے پاس اس طرح کے سخت فیصلے کرنے کے علاوہ کوئی معقول متبادل رہ ہی نہیں گیا ہے۔ اس نے تمام موجود لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جیسے اندازہ کرنا چاہتا ہو کہ جو بات وہ کہنے جا رہا ہے اس پر لوگوں کا ردعمل کیا ہوگا۔ اس نے کہا، 'سب سے پہلے میں یہ بات واضح کر دوں کہ مجھے امیر البشر کی تجویز سے اتفاق ہے۔ حرکت البشر کو تحلیل کر دینا ہی وقت کا تقاضا ہے۔ لیکن اس تنظیم کے تحلیل کر دیے جانے کے بعد اس سے متعلق تمام لوگوں کو خدام ملک وملت میں شامل کرنا کچھ دوسرے مسائل کھڑے کر سکتا ہے۔ ایک بڑا مسئلہ حرکت البشر کے مالیات کی منتقلی کا ہوگا۔ خدام ملک وملت حرکت البشر کے مقابلے ایک چھوٹی تنظیم ہے۔ اس کا دائرہ بھی نہایت محدود ہے۔ اس کے اراکین کو بھی کسی طرح کے تحفظ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن اس کے بعد یہی سب باتیں مسئلہ بن کر ابھریں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس طرح ہم خدام ملک و ملت کی نیک نامی کو بھی خطرے میں ڈال دیں گے۔ اس لیے میری خواہش یہ ہے کہ اراکین مجلس کو اپنے امیر کی تجویز پر مزید غور وفکر کے لیے وقت دیا جانا چاہیے۔'

'کیا ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ ہم خدام ملک وملت میں شامل ہونے کے بجائے اپنی تنظیم کا نام بدل دیں۔' ایک رکن نے کھڑے ہو کر مشورہ دیا۔ 'میری مراد یہ ہے کہ ہم ایک نئی تنظیم تشکیل دے کر حرکت البشر کو ایک نئی شکل دے سکتے ہیں۔ یہ کام ہمیں اس طرح کرنا ہوگا کہ حرکت البشر کو تحلیل کر کے اس کا اعلان عام کر دیا جائے اور نئی تنظیم کی تشکیل کی خبر خفیہ رہے۔ ہمارے پاس ایسے وسائل کی کمی نہیں ہے کہ ہم اپنے تمام اراکین تک یہ خبر معقول طور پر پہنچا سکیں۔' اس رکن نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا، 'میرا تو یہی مشورہ ہے، پھر جیسے اراکین مجلس عاملہ اور امیر کی مرضی۔'

'اس نشست میں شریک ہر رکن کی حیثیت مساوی ہے۔' ضرغام حیدر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا، 'یہاں تمام لوگوں کو آزادانہ طور پر اپنی بات کہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا خود صدر

کو۔ یہاں صدر بھی سب کی طرح بس ایک مشیر ہے۔ اراکین سے میری درخواست ہے کہ وہ میری رائے کو اسی تناظر میں دیکھیں۔ معزز رکن نے ابھی جو تجویز رکھی ہے وہ بھی لائق توجہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سارے لوگ اپنی تجاویز سامنے رکھیں یا رکھی گئی تجاویز پر اپنی مثبت یا منفی رائے دیں'۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر کہا۔ 'لیکن میری گزارش یہ ہے کہ یہ فیصلہ ہمیں آج ہی اور ابھی لینا ہے۔ اس اہم مسئلے کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ اسے حرکت البشر کے امیر کا حکم بھی تصور کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ امیر کے علم میں جو باتیں ہیں، ان کے پیش نظر یہ فیصلہ ہمیں اسی وقت لینا ہوگا'۔

تبادلہ خیال کا دور جاری تھا۔ تمام اراکین کھل کر اپنی اپنی باتیں کہہ رہے تھے۔ اکثر تو تو میں میں کی نوبت بھی آ جاتی تھی، جس میں صدر کو مداخلت کرنی پڑتی تھی۔ لیکن یہ ساری محنت رائگاں نہیں رہی۔ حرکت البشر کی یہ نشست امید کے خلاف کم و بیش سات گھنٹے چلی۔ جب وہ کسی ایک رائے پر متفق ہوئے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد جو نتیجہ سامنے آیا اس کی روشنی میں اسی نشست میں ایک نئی تنظیم وجود میں آ گئی تھی، جس کا نام تمام لوگوں کے مشورے سے 'تحریک انسانیت' رکھا گیا تھا۔ عبوری طور پر اس کی مجلس عاملہ بھی تشکیل دی گئی، جس میں یہاں موجود لوگوں میں سے بارہ اراکین کو شامل کیا گیا اور اتفاق رائے سے ضرغام حیدر کو اس نئی تنظیم کا عبوری امیر منتخب کیا گیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ حرکت البشر کے تمام اراکین کو فوری طور پر یہ اطلاع دی جائے گی اور انھیں مکمل اختیار دیا جائے گا کہ وہ اپنے طور پر فیصلہ کریں کہ انھیں اس نئی تنظیم میں رہنا ہے، یا وہ خدام ملک و ملت کے ساتھ رہ کر خدمت خلق کے کام کرنا چاہیں گے۔ ہر شخص جو بھی فیصلہ کرے گا، اس کو دیا جانے والا مشاہرہ اس کے نئے کام کی اہمیت کے مطابق طے ہوگا۔ اسے یہ اختیار بھی دیا جائے گا کہ اگر اس کی خواہش ہو تو وہ ان تنظیموں سے علاحدگی اختیار کر کے اپنے طور پر آزادانہ زندگی بھی شروع کر سکتا ہے۔

ان فیصلوں سے مسعود خاں کو ذاتی طور پر جس خوشی کا احساس ہو رہا تھا، وہ یہ تھی کہ اب آصفہ شبیر کا خدام ملک و ملت میں شامل ہونا کوئی مسئلہ نہیں رہ گیا تھا۔

اکسٹھ

جب سے مسعود کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے ہندوستان کا سب سے بڑا قومی

اعزاز نسدبھا و شری ملا تھا، وہ لوٹ جانے کے لیے بیتاب تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اب اس کے پاس لوٹ جانے کا مناسب جواز ہے۔ اب وہاں اسے کسی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ لیکن ایک مسئلہ ایسا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی خواہش کو پورا کرنے میں جھجک محسوس کر رہا تھا۔ وہ وہاں کس کے پاس جائے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی خالہ رفیع النسا کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کا خالہ زاد بھائی اکرم خاں وہاں ضرور تھا لیکن نہ جانے اس دوران وہ اس کے بارے میں کیا کچھ سوچتا رہا ہوگا۔ وہ اس مسئلے پر کئی بار غور کر چکا تھا۔ آج بھی وہ خدام ملک وملت کے مرکزی دفتر میں، جو اب الہ آباد سے کان پور منتقل ہو چکا تھا، بیٹھا ہوا اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا۔

اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ آصفہ شبیر کافی دیر سے اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھی ہوئی اس کے اس استغراق سے باہر آنے کا انتظار کر رہی ہے۔ آصفہ کا تعلق اب خدام ملک وملت سے تھا اور مسعود نے اسے فی الحال دفتر کا انچارج مقرر کر دیا تھا۔ اس وقت وہ کچھ ضروری امور پر تبادلہ خیال کی غرض سے اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے پہلے بھی مسعود کو فکرمند ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اب اکثر ہی کسی نہ کسی فکر میں ڈوبا رہتا تھا۔ اس نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ مسعود جیسے شخص کے لیے، جس پر بہت اہم ذمے داریاں ہیں، ایسا ہونا خلاف معمول نہیں ہے۔ لیکن آج کی اس کی کیفیت روز سے مختلف لگ رہی تھی۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اس کے سامنے دس منٹ سے بیٹھی تھی اور مسعود نے ایک بار بھی سر اٹھا کر اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ فکر کی سیاہ لکیریں اس کی پیشانی پر گہری ہوتی جا رہی ہیں تو وہ بھی کچھ فکرمند ہو گئی۔ اس نے مسعود کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے میز پر رکھا پیپر ویٹ دھیرے سے میز پر ٹھونکا، جس کی آواز سن کر مسعود چونکا اور سامنے آصفہ کو بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔ 'ارے تم یہاں کب آ گئیں؟'

آصفہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔ 'کیا بات ہے مسعود، آج تم کچھ زیادہ ہی فکرمند نظر آ رہے ہو۔'

'اچھا ہوا کہ تم نے پوچھ لیا۔ میں واقعی بہت پریشان ہوں۔' مسعود نے کہا۔ 'شاید تم میری اس پریشانی کو حل کرنے میں میری کچھ مدد کر سکو۔'

'اگر میرے لیے یہ ممکن ہو سکا تو ضرور۔' آصفہ نے کہا۔

اس کے بعد مسعود نے پہلے چپراسی کو طلب کر کے اسے ہدایت دی کہ وہ ابھی آدھا گھنٹہ کسی کو اندر نہ آنے دے۔ اس کے واپس جانے کے بعد اس نے آصف سے اپنے تمام خدشات پر کھل کر گفتگو کی، جو اس کے لیے کوٹ جانے میں مانع تھے۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ اپنے گاؤں جانے کے لیے کتنا بے چین ہے۔ اس نے ان تمام لوگوں کے بارے میں بھی اسے تفصیل سے بتایا، جن کے سامنے اس نے اس وقت تک کوٹ واپس نہ آنے کا عہد کیا تھا جب تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتا۔ اب جب کہ وہ بڑی حد تک اپنا مقصد حاصل کر چکا ہے، اسے یہ لگنے لگا ہے کہ اب وہ کوٹ کس سے ملنے جائے۔ اس کی خالہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ ایک خالہ زاد بھائی اکرم ہے۔ جانے اب وہ کیا سوچتا ہوگا میرے بارے میں۔ جب میں وہاں رہتا تھا تو وہ میرا بڑا احترام کرتا تھا۔ مجھے نہیں لگتا کہ کوٹ جیسی جگہ میں، جہاں بیرونی دنیا سے رابطہ برائے نام ہے، کوئی میری سرگرمیوں کے بارے میں جانتا ہوگا۔ اس نے آصف سے کہا کہ انھیں باتوں نے اسے پریشان کر رکھا ہے۔

'تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ حافظ عبدالصمد خاں کو ایک خط لکھو اور اس میں اپنی اس خواہش کا اظہار کرو کہ تم اپنے گاؤں واپس آنا چاہتے ہو۔' آصف نے اسے مشورہ دیا۔ 'دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔'

یہ مشورہ سن کر جیسے مسعود خاں کے چہرے پر ایک چمک سی آ گئی۔ اس نے آصف سے کہا۔ 'تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے یہی کرنا چاہیے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ مجھے کوٹ کے عزیزوں کے بارے میں وہ معلومات حاصل ہو جائیں گی، جن کے بارے میں اس وقت میں کچھ نہیں جانتا۔ ان کے جواب سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ میرے وہاں جانے پر لوگوں کا ردعمل کیا ہوگا۔'

اس نے فوراً آصف کے سامنے ہی حافظ عبدالصمد خاں کے نام ایک خط لکھا جس میں ان کی اور تمام اعزہ و اقارب کی خیر و عافیت اور تفصیلی حالات جاننے کی خواہش کے ساتھ ساتھ کوٹ آنے کی اپنی منشا بھی ظاہر کی۔ اس نے اس خط میں یہ بھی لکھا کہ برسوں پہلے اس نے جامع مسجد کے سامنے ان سے جو بدکلامی کی تھی، اس کے لیے وہ معافی کا خواستگار ہے۔ وہ یہ لکھنا بھی نہیں بھولا کہ اگر ان سے اس طرح کی بات چیت نہ ہوئی ہوتی تو وہ آج جو کچھ ہے، کبھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے یہ اشارہ بھی کیا کہ جس مقصد کے لیے اس نے گاؤں چھوڑا تھا وہ اس نے بڑی حد تک پورا کر لیا ہے۔ اس نے اسی وقت ایک خط اپنے خالہ زاد بھائی اکرم خاں کو بھی لکھا۔ اسے خط لکھنے کے دوران وہ بری طرح احساس جرم میں مبتلا رہا۔ اسے لگا کہ اس

کے یکا یک گاؤں چھوڑ دینے کے اقدام سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا شخص بھی ہے۔اس کے اس قدم سے اس معصوم پر وقت سے پہلے ہی ذمے داریوں کا بوجھ آ پڑا تھا۔اس کے لیے وہ خود اپنے آپ کو معاف نہیں کر پا رہا تھا تو بھلا وہ اکرم خاں سے معافی مانگنے کی ہمت کیسے کرتا۔

اسی ہفتے اسے حافظ عبد الصمد خاں کا جواب مل گیا۔اس لفافے کو دیکھ کر جیسے اس کا دل دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔اس نے جوش میں آ کر وہیں سے آصف کو آواز دی تھی، جو اس تک بہر حال نہیں پہنچ سکتی تھی۔جواب میں اس کا چپراسی اندر آیا تھا، جسے اس نے فوراً آصف شبیر کو اس کے پاس بھیجنے کے لیے کہا تھا۔آصف کے آنے کے بعد اس نے جلدی جلدی اسے بتایا کہ حافظ عبد الصمد خاں کا جواب آ گیا ہے لیکن اسے کھول کر پڑھنے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔نہ جانے اس میں کیا لکھا ہو۔ممکن ہے اسے پڑھنے کے بعد میرے تصورات کا تاج محل ٹوٹ کر بکھر جائے۔اس نے لفافہ آصف کی طرف بڑھاتے ہوئے اس سے کہا۔'آصف، بہتر ہوگا کہ اس لفافے کو کھول کر پہلے تم پڑھ لو، پھر مجھے بتاؤ کہ اس میں کیا لکھا ہے'۔

'آصف کا تجسس بھی اس کے چہرے سے نمایاں تھا لیکن وہ اتنی بے چین نہیں تھی جتنا مسعود خاں تھا۔اس نے نہایت اطمینان سے لفافہ کھولا، اسے پڑھا اور مسعود خاں سے کہا۔'میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کرو'۔

'کیا لکھا ہے اس میں'۔مسعود خاں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

آصف نے وہ خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔'تم خود اسے پڑھ سکتے ہو۔اس میں ایسا کچھ نہیں ہے جو تمھارے لیے پریشان کن ہو'۔

مسعود خاں نے خط آصف کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے پڑھنا شروع کیا۔جیسے جیسے وہ اس خط کو پڑھتا جا رہا تھا، اس کے چہرے پر خوشی اور حیرت کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔آصف اس کے چہرے کے بدلتے رنگ کو دیکھ دیکھ کر مسرور ہو رہی تھی۔اس خط میں نہایت تفصیل سے گاؤں کے حالات لکھے تھے۔حافظ عبد الصمد خاں نے لکھا تھا کہ اس کے گاؤں چھوڑ دینے کے بعد یہاں کس طرح کا ماتمی ماحول پیدا ہو گیا تھا، اور یہ بھی کہ وہ ساری زندگی اپنی اس بدکلامی پر شرمندہ ہوتے رہے ہیں جو انھوں نے مسعود خاں جیسے ہونہار نوجوان سے کی تھی۔انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اسے سد بھاو

شری کا اعزاز ملنے پر سارا گاؤں کس طرح خوش ہوا تھا۔ انھوں نے ہمدان علی خاں کے بارے میں بھی بہت کچھ تفصیل سے لکھا تھا کہ ان کو تمھارے خط کے بارے میں جب میں نے بتایا تو وہ خوشی سے رنجی ہو گئے۔ وہ یہ بتانا بھی نہیں بھولے تھے کہ اب ہمدان علی خاں نے اب اپنی تمام غلط کاریوں سے توبہ کر لی ہے اور شرافت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ انھوں نے آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس کی خالہ کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کا ہونہار خالہ زاد بھائی اکرم خاں ان کی تمام جائداد کو بخوبی سنبھال رہا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ اکرم خاں کو بھی اس کا خط مل گیا ہے اور وہ اس کے آنے کے ارادے کے بارے میں جان کر بے حد خوش ہے۔ انھوں نے اپنی اس خواہش کا بھی اظہار کیا تھا کہ وہ ان کے مہمان کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہے تا کہ وہ ہمدان علی خاں کو یہ بتا سکیں کہ مسعود خاں نے انھیں معاف کر دیا ہے۔ خط پڑھنے کے بعد اس نے آصفہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ 'حیرت ہے کہ وہاں میرے بارے میں سب کو سب کچھ معلوم ہے'۔

'ہاں کوٹ کے لوگ شاید اب اتنے بے خبر نہیں رہے، جتنا تم سمجھ رہے ہو'۔ آصفہ نے کہا۔ 'اب تم کچھ اور نہ سوچو، بس فوراً کوٹ چلنے کی تیاری کرو'۔

'اور تم بھی'۔ مسعود نے کہا۔ 'میں چاہتا ہوں کہ تم میری ہر خوشی میں برابر کی شریک رہو'۔

'میں ضرور چلوں گی مسعود'۔ آصفہ نے کہا۔ 'یہ میرے لیے مسرت کا سبب ہوگا، لیکن اس سے پہلے مجھے ایک ایسی ملازمہ کا انتظام کرنا ہوگا جو میری والدہ کی مناسب خبر گیری کر سکے۔ مجھے ان کی طرف سے ہمیشہ ڈر لگا رہتا ہے۔ وہ بہت کمزور ہو چکی ہیں۔ اللہ ان کا سایہ میرے سر پر سلامت رکھے'۔

'میں ہر حال میں تمھارے ساتھ ہوں آصفہ'۔ مسعود نے کہا۔ 'تمھاری ماں میری بھی ماں ہیں۔ میں جلد از جلد ایسی ملازمہ کا انتظام کر دوں گا جو یہ کام کر سکے۔ میں کچھ اور لوگوں کو بھی پابند کر دوں گا، جو ان کی جملہ ضروریات کا خیال رکھ سکیں'۔

'ہاں مسعود، ہم یہ انتظامات کرنے کے بعد کوٹ چلیں گے'۔ آصفہ نے کہا۔ 'تم نے میرے دل میں اس گاؤں کے لیے اتنا تجسس پیدا کر دیا ہے کہ میں بھی اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے ابھی تک صدفی صد مسلم آبادی والا کوئی ایسا گاؤں کبھی نہیں دیکھا'۔

اس نے اسی وقت حافظ عبد الصمد خاں کو دوسرا خط لکھا، جس میں اس نے لکھا کہ وہ ایک ماہ

کے اندر کوٹ آرہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک خاتون آصفہ شبیر بھی ہوگی، جو اس کی ساتھ کام کرتی ہے اور اس کی سب سے عزیز دوست بھی ہے۔ اس نے لکھا کہ وہ حافظ عبد الصمد خاں کو نہایت احترام و عقیدت سے دیکھتا ہے اور یہ بھی کہ اب ان کی طرف سے اس کے دل میں کوئی ملال نہیں ہے۔ اس نے لکھا کہ خدا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے ہر کام کے لیے ایک وقت متعین کر رکھا ہے۔ ہمارے درمیان بیس سال پہلے جو تلخ کلامی ہوئی تھی، اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت کارفرما رہی ہوگی۔ وہ وقت شاید ایسی ہی بات چیت کے لیے مناسب رہا ہوگا۔ اب یہ سب ماضی بعید کی باتیں ہیں اور ہم جتنی جلدی انھیں بھول جائیں اتنا ہی بہتر ہوگا۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ وہ چاہے گا کہ کوٹ میں قیام کے دوران وہ اپنے بھائی اکرم خاں کے ساتھ رہے۔ اس نے اس کی غیر موجودگی میں پہلے ہی بہت سی اذیتیں اٹھائی ہیں۔ اب اس کے ساتھ ٹھہرنے کے بجائے اگر میں کہیں اور ٹھہرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو یہ اس کے لیے مزید اذیت ناک ہو سکتا ہے۔ اسے شاید یہ اچھا نہیں لگے گا۔ اس نے لکھا کہ امید ہے وہ اس کے اس فیصلے کا برا نہیں مانیں گے۔

باسٹھ

مسعود خاں کے کوٹ آنے کی خبر حافظ عبد الصمد خاں کے لیے معمولی نہیں تھی، یہ تو جیسے ان کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر، ان کی پژمردہ خواہشات کی تکمیل، اور خدا کی طرف سے ان کی دعاؤں کی قبولیت کا ثمر بن کر آئی تھی۔ انھوں نے نہ جانے کتنی نمازوں میں صدق دل سے خدا کے حضور یہ دعا کی تھی کہ وہ کسی طرح ان کی زندہ رہتے کم از کم ایک بار مسعود خاں سے ان کی ملاقات کرا دے۔ اور ابھی جب وہ جامع مسجد سے جمعہ کی نماز پڑھا کر گھر لوٹ رہے تھے تو انھیں اپنی دعاؤں کی قبولیت کی نوید مسعود خاں کے خط کی شکل میں ملی، جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ اپنی ایک خاتون دوست کے ساتھ ایک ماہ بعد کوٹ آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے دل میں حافظ عبد الصمد خاں کی طرف سے کسی طرح کا کوئی ملال نہیں ہے۔ اس خط کو پا کر وہ اتنے خوش اور بے صبر ہوئے تھے کہ اسے گھر لے جا کر پڑھنے کا انتظار بھی نہ کر پائے اور اسے وہیں کھول کر جلدی جلدی پڑھ ڈالا تھا۔ مسعود خاں کے کوٹ آنے کی اطلاع کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ان کے لیے اہمیت

رکھتی تھی کہ وہ ان کی طرف سے شاکی نہیں ہے۔ خط پڑھ کر ان کے چہرے سے ان کی خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ مسرور تھے کہ خدا کو بالآخر ان پر رحم آ ہی گیا۔ ان کی دعا کو قبولیت کا شرف بخشتے ہوئے اس قادر مطلق نے ایسی صورت پیدا کر ہی دی کہ اب مسعود خاں واقعی لوٹ آ رہا ہے۔ جمعہ کا یہ دن ان کے لیے واقعی مبارک ثابت ہوا تھا۔ لیکن اس بات کو شاید ان کے علاوہ کوئی اور نہیں سمجھ سکتا تھا۔

ہمدان علی خاں نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ اگر انھیں مسعود کی طرف سے کوئی اطلاع ملے تو سب سے پہلے وہ انھیں خبر کریں، اس لیے وہ کسی اور کو اپنی خوشی میں شریک کرنے سے پہلے ہمدان خاں کے گھر کی جانب چل پڑے۔ لیکن اتفاق سے وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ شاید خدا ان کے صبر کا امتحان لے رہا تھا۔ ان کے ملازم نے انھیں بتایا کہ کل شام وہ کسی مقدمے کے سلسلے میں فتح پور چلے گئے ہیں اور ان کی واپسی آج شام تک ہوگی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب ان پانچ چھ گھنٹوں تک اس خبر کو اپنے سینے میں کیسے محفوظ رکھیں۔

ہمدان خاں شام چھ بجے کی بس سے اترے تو ان کا استقبال کرنے کے لیے حافظ عبدالصمد خاں بس اسٹاپ پر ہی موجود تھے۔ جب انھوں نے ہمدان خاں سے کہا کہ وہ انھی کا انتظار کر رہے تھے تو انھیں حیرت ہوئی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے سبب جاننا چاہا تو انھوں نے کہا کہ گھر چل کر آرام سے بات چیت کرتے ہیں۔ ادھر ہمدان خاں کے دل میں بے چینی ہو رہی تھی کہ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جو عبدالصمد خاں کو بس اسٹاپ پر کھڑے رہ کر ان کا انتظار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ انھیں کچھ کچھ اندازہ تھا کہ یقیناً اس خبر کا تعلق مسعود خاں سے ہوگا، لیکن انھوں نے گھر پہنچنے تک اس کا انتظار کر لینا ہی زیادہ مناسب سمجھا۔ گھر پہنچ کر اندر جانے کے بجائے انھوں نے اپنی بیٹھک کا دروازہ کھولا اور عبدالصمد خاں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس سے ان کے تجسس کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ بیٹھتے ہی وہ بولے۔ 'عَبدُ الصَمَد کھاں تے تو مورے دل ماں کھلبلی پیدا کر دیھے ھس کا بات ھی کہ تم کابس اڈا ماں آوے کا پڑا۔'

عبدالصمد خاں کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ بولے 'مٹھائی کھلایئے، مسعود خاں لوٹ آ رہا ہے۔'

'کا کھت ھس؟ ہمینکا توری اِین بات پر یکینے نہیں آوت'۔ ہمدان خاں بولے۔

'یہ دیکھیے'۔ انھوں نے مسعود خاں کا خط ان کی طرف بڑھاتے ہوئے اس طرح کہا جیسے وہ اپنی دولت کا ذخیرہ انھیں دکھا رہے ہوں۔

ہمدان علی خاں نے جلدی جلدی اردو میں لکھے گئے اس خط کو پڑھا۔ اب ان کا چہرہ بھی کھل گیا تھا۔ وہ بولے۔ 'صَمَد کھاں، مَسود اَب کونوں مَامُولی آدمی نَہیں نَاں۔ اوھی کی کھاتر ہم کا بَہُت اچھا اِنتِجَام کرے کا ہوئی۔ آکھِر واھی گائوں کا لرکا ھے، جِھیکا آب سَارے مُلک مَاں لوگ جَانَت ھیں'۔ وہ بولے۔ 'اَگر ایک لَرکِیُو تَو اوھی کے سَاتھ آوَت ھِی۔ اوھی کَا پَتَا چَلے کَا چَاھی کہ ھَمَارے گَائوں مَاں مَسود کھَاں کی کَتّی اِجّت ھَے'۔

'بالکل ہمدان خاں، آپ نے تو میرے منھ کی بات چھین لی'۔ عبدالصمد خاں نے جوش میں آتے ہوئے کہا۔

'تو سَمَجھ لیاو اَب ھَم کَا جَلدی جَلدی بَہُت کَام کَرے کَا ھَے'۔ ہمدان علی خاں نے قدرے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔ 'مَیں اپنے نوکَرَن کا بھیج کے کَلّو کھاں حکیم، مولانا ریاست، مُستَنصِر ہیڈ ماسٹر، کَتّی دادا، مُنیرُ الحَسَن اور پنڈت سَرمَا کا بُلوائے لیَات ھوں۔ ھَم سَب مِل بیٹھ کے یَ تَے کَرَب کہ اوھی کی اگوائی کَی کھَاتِر ھَم کا کا کَرے کَا چَاھی'۔ یکا یک انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ 'تُم ھِیَاں سے آبے جَاتیو نَہیں کھَانَا وَانَا ھِیْن کھَا لیھُو۔ مَیں نوکرن کا سَب سَمجھا کے آوَت ھوں۔ یا نیک کَام جِتّی جلدی اور جِتّی اَچّھی تَرَا سے ہوئی جَاے اُتنے ھَمیں کُھسی ہوئی'۔ یہ کہتے ہوئے وہ گھر کے اندر چلے گئے۔

اب عبدالصمد خاں بیٹھک میں اکیلے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ مسعود خاں کے ساتھ جو لڑکی آ رہی ہے، وہ آخر کون ہوگی۔ اس نے اپنے خط میں اس کی تفصیلات نہیں لکھی تھیں۔ جس طرح اس نے اس کا ذکر کیا ہے اس سے یہ تو طے ہے کہ وہ اس کی بیوی نہیں ہے۔ اس کا مطلب اس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ ممکن ہے یہ لڑکی اسے پسند ہو اور وہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ وہ اس بات کو لے کر فکرمند ہو رہے تھے کہ گاؤں کے یہ دقیانوس پٹھان ایک نوجوان لڑکی کو ایک غیر شادی شدہ مرد کے ساتھ دیکھ کر کوئی بے تکی بات نہ کر بیٹھیں۔ انھوں نے خدا کے حضور صدق دل سے دعا مانگی کہ مسعود خاں نے اس لڑکی کا انتخاب شادی کے لیے ہی کیا ہو۔ ایسے میں وہ اس کا اعلان کر کے گاؤں

والوں کو خاموش رکھ سکتے تھے۔ ابھی وہ اسی فکر میں غلطاں تھے کہ ہمدان خاں دوبارہ بیٹھک میں داخل ہوے۔ انھوں نے عبدالصمد خاں کے چہرے پر فکر کی لکیریں دیکھیں تو بے تکلفی سے بولے۔ 'یـا کـا مُردار کی سُورت بنا کے بیٹھے ہو'۔

'ہمدان خاں، ایک بات مجھے بہت پریشان کر رہی ہے'۔ حافظ عبدالصمد خاں نے محتاط انداز میں کہا۔ 'مسعود خاں کے ساتھ یہ جو لڑکی آ رہی ہے، اس کا مسعود خاں کے ساتھ کیا رشتہ ہوگا۔ یہ اس کی بیوی تو ہے نہیں۔ کہیں گاؤں والے......'۔

ہمدان خاں نے ان کی بات کاٹتے ہوے کہا۔ 'کِھس کی مَجال ھی کہ ھمدان کھاں کے ھوتے کُونوں مَسُود کھاں سے بدتمیجی کی ھِمّت کَرِی، مونڈ کاٹ کے نا پھینک دوھُوں اوھی کاجمنا ماں'۔

اس کے ساتھ ہی ایک ملازم آیا جس نے میز پر چائے اور اس کے لوازمات رکھے اور چلا گیا۔ ہمدان خاں بولے۔ 'چائے پیو مولانا. مَیں نوکرن سے کِھی دیھُوں ھُوں کہ ان سب لوگن کا آبے چار بجے موں ھیاں اِیہ کا کِھی دیاو. کِھی دیاو کہ ایک بہُت جَرُوری بات کَرے کی کِھاتر ھمدان کھاں بولائس ھی'۔ انھوں نے دو کپوں میں چائے انڈیلتے ہوے مزید کہا۔ 'اور تُم ایھی کِس پھِکر بِلکُل نا کرو. آبے ھم سب مِل جُل کے یا باتو کر لیبے، چائے پی کے تُم تَنی دیر آزام کر لیاو. مَنھُوں تَنی کے کُچھ جَرُورِی کام دھام نِپٹا لوں. سب لوگ آ جئھیں تو پھر اُٹھب مُسکِل ھوئی جائی'۔ یہ کہتے ہوے ہمدان خاں اندر زنان خانے میں چلے گئے اور عبدالصمد خاں وہیں پلنگ پر دراز ہو کر اپنی کرسیدگی کرنے لگے۔

تیرہ

پندرہ دن کے وقفے کے بعد حافظ عبدالصمد خاں کو مسعود خاں کا ایک اور خط موصول ہوا تھا، جس میں اس نے گاؤں والوں کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوے انھیں مطلع کیا تھا کہ وہ ۱۴ر نومبر کو شام چار بجے تک کوٹ پہنچ رہا ہے۔ یہ خط عبدالصمد خاں کے اس خط کے جواب میں تھا، جس میں انھوں نے مسعود کے آنے کے تعلق سے اپنی اور تمام گاؤں والوں کی بے پناہ خوشی کا اظہار

کیا تھا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ کوٹ اور اطراف کوٹ کے مختلف گاؤں کے لوگوں نے اپنی خوشی کے اظہار کے لیے اس کے شاندار استقبال کی تیاری کی ہے اور اب اپنی نگاہیں فرش راہ کیے اس کی آمد کے منتظر ہیں۔

مقررہ تاریخ سے تین روز پہلے ہمدان خاں نے ڈگی پٹوا کر آس پاس کے تمام گاؤوں، غازی پور، رحمت پور، نصیر پور، دولت پور، کلی، شیو پوری، اڑھیا، شاہ نگر، اورہا، چندن پور، کھکھریرو اور گھرو اسی پور میں مسعود خاں کی آمد کی اطلاع کروا دی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ خوش خبری کوٹ کے ان لوگوں کو بھی دی تھی جو اب مستقل طور پر کھاگا اور فتح پور میں رہنے لگے تھے۔ ان تمام لوگوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ بڑی تعداد میں ۱۳ر نومبر کی صبح کوٹ پہنچیں اور اپنی مٹی کے لعل، مسعود خاں کا اس کے شایان شان استقبال کریں۔ یہ بھی اطلاع کرائی گئی تھی کہ استقبالیہ جلسے کے بعد ہمدان علی خاں کی طرف سے ان سب کی دعوت کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ مقررہ تاریخ کو آس پاس کے گاؤوں کے تمام ہندو اور مسلمان مذہب و ملت کا لحاظ کیے بغیر کوٹ میں جمع ہو کر اپنے ہیرو مسعود خاں کا استقبال کرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ چوڑا کے میدان میں، جہاں مسعود خاں کا گھر تھا، ایک بڑا پنڈال لگایا گیا تھا۔ اس میں ایک طرف ایک بڑا اسٹیج بنایا گیا تھا، جہاں گاؤں کے معززین مسعود خاں کے ساتھ بیٹھنے والے تھے۔ پنڈال کے ایک حصے میں پردے کا بھی معقول انتظام بھی کیا گیا تھا، جہاں گاؤں کی پردہ نشین خواتین بھی بیٹھ کر یہاں ہونے والی تمام کارروائیوں کا مشاہدہ کر سکتی تھیں۔ آصفہ کے بیٹھنے کا انتظام خواتین کے اسی حصے میں کیا گیا تھا۔ تین بجتے بجتے پنڈال کے دونوں حصے پوری طرح بھر چکے تھے۔ لیکن اسٹیج ابھی خالی تھا۔ کیونکہ سارے معززین قصبہ حافظ عبد الصمد خاں کی سربراہی میں بس اسٹاپ پر کھڑے اس بس کا انتظار کر رہے تھے، جس سے مسعود خاں کے آنے کی اطلاع ملی تھی۔ ان لوگوں میں اکرم خاں بھی تھا، جو آج سارے گاؤں کا چہیتا بن گیا تھا۔

بس آئی، رکی، مسعود خاں آصفہ کو سہارا دیتے ہوئے بس سے نیچے اترا، اور یہاں موجود لوگوں نے 'مسعود خاں زندہ باد' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ سامنے جامعہ حسن سنجری کی شاندار عمارت تھی، جس کی مسجد کے مینار یہاں آنے والوں کو خیر و برکت کی دعائیں دے رہے تھے۔ بس سے اترتے ہی مسعود خاں کی پہلی نظر جس پر پڑی وہ اس کا بھائی اکرم خاں تھا، جو خاموش

ضرور تھا لیکن اس کی خوشی اس کی آنکھوں سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ وہ لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اپنے چھوٹے بھائی کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لیکن دونوں اپنے جذبات کو قابو میں کیے ہوئے تھے۔ اس کے بعد حافظ عبدالصمد خاں آگے بڑھے اور انھوں نے مسعود خاں سے معانقہ کیا۔ ان کے پیچھے ہمدان خاں اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے ہوئے آگے بڑھے اور اس سے گلے ملے۔ ایک ایک کر کے گاؤں کے تمام معززین نے گلے مل کر مسعود سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ آصفہ پاس ہی کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ مسعود خاں کی ہمراز تھی، وہ جانتی تھی کہ اپنے گھر سے بیس سال سے زیادہ دور رہنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ وہ خود بھی اسی طرح کے عذاب سے گذر رہی تھی۔ مسعود خاں کو تو اپنی منزل مل گئی تھی لیکن اس کی منزل تو اس کے تصور میں بھی کبھی قریب نہیں آتی تھی۔ اس کے لیے یہ گاؤں اور یہاں کے لوگ اجنبی تھے، لیکن وہ جانتی تھی کہ محبت سارے ہندوستان کی وہ مشترکہ میراث ہے، جو فاصلے مٹا دیتی ہے۔ اس کی مدد سے ملک کا ہر حصہ دوسرے کے مماثل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس منظر میں وہ مناظر بھی دیکھ رہی تھی جن کا تعلق اس کی اپنی گمشدہ بستی سے تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ لوگ مسعود کے استقبال میں اس طرح کھڑے ہوئے ہیں کہ اس کی طرف کسی کی توجہ ہی نہیں ہے۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی کہ یہاں کے معصوم لوگ مسعود خاں سے بے انتہا محبت رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمدان علی خاں کا دھیان اس اجنبی لڑکی کی طرف گیا۔ وہ اپنی اس غفلت پر کچھ شرمندہ تھے۔ اس کا تدارک کرنے کی غرض سے وہ تیزی سے آگے بڑھے اور آصفہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ 'بٹیا، ہم تھینکا جانت تو نہیں ناں پر یا تو ہم سمجھے گئے ہیں کہ مسود کا تم اور تم کا مسعود اچھا لاگت ہے۔ ہمار دعا تمھرے ساتھ ہیں۔ اب کوات کا اپن گاؤں سمجھو۔ تم ہیاں رہے کا تیار ہوئی جاو تو مسود کہاں بھی گتوں جاوے کی بات ناکری۔ انھوں نے دیکھا کہ اب حافظ عبدالصمد خاں اور دوسرے لوگ بھی آصفہ کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ ان سب نے مل کر اس کا استقبال کیا اور اسے درازی عمر اور خوش گوار مستقبل کی دعائیں دیں۔

مسعود نے جب اس گاؤں کو چھوڑا تھا تو یہاں جامعہ حسن سنجری کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ مدرسے کی اتنی شاندار عمارت دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ گاؤں میں داخل

ہونے سے پہلے مسجد جا کر شکرانے کی دو رکعت نماز پڑھنا چاہتا ہے۔اس کی زبان سے یہ الفاظ سن کر حافظ عبد الصمد خاں کی تو جیسے باچھیں کھل گئیں۔ دراصل ایک نوجوان اور غیر شادی شدہ لڑکی، آصفہ کو اپنے ساتھ لانے کی وجہ سے ان کے دل میں مسعود خاں کی طرف سے تھوڑا سا شک پیدا ہو گیا تھا۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ بڑا آدمی ہو گیا ہے، اس لیے نماز روزے سے اب شاید ہی اس کا کوئی تعلق بچا ہو۔ اس کی اس خواہش نے جیسے عبد الصمد خاں کے دل میں اس کی عظمت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ نہایت سرعت سے آگے بڑھے اور جامعہ حسن سنجری کی مسجد کی جانب اس کی رہنمائی کرنے لگے۔ باقی بزرگوں نے آصفہ کو مدرسے کے برامدے میں آرام سے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ مسعود خاں کا بھائی اکرم خاں آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس طرح اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ واقعی اس کی بھابی ہو۔

یہ اکرم خاں کا قصور نہیں تھا۔ دراصل اس چھوٹے سے گاؤں کے ہر شخص کے دل میں اکرم خاں کی طرح یہی ایک خیال پل رہا تھا۔ یہ لوگ اجنبی عورت اور مرد کو ساتھ دیکھ کر صرف میاں بیوی کے رشتے کا ہی تصور کر سکتے تھے۔ اس طرح کا کوئی اور رشتہ ان کے خیال میں آ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ انھوں نے اپنی محدود زندگی میں ایسا کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔

نماز سے فارغ ہو کر جیسے ہی مسعود خاں باہر آیا، یہ مختصر سا کارواں گاؤں کی جانب چل پڑا۔ جیسے ہی وہ چورا کے پاس پہنچے، پنڈال میں سے ایک بار پھر مسلمانوں نے 'نعرہ تکبیر، اللہ اکبر' کی صدا بلند کی۔ انھیں دیکھتے ہوئے مختلف گاؤوں سے یہاں آنے والے ہندوؤں نے بھی 'ھر ھر مھادیو' کا نعرہ لگایا۔ مسعود اس اتحاد کو دیکھ کر خوش بھی ہوا اور مطمئن بھی۔ اسے اسٹیج پر لے جا کر درمیانی مسند پر بٹھا دیا گیا اور باقی لوگ اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ آصفہ کو خواتین کے حصے میں بھجوا دیا گیا تھا۔

خواتین کے حصے میں آصفہ کو دیکھ کر ایک عجیب سی خوشی دکھائی دے رہی تھی۔ انھیں اس کا حسن تو متاثر کر ہی رہا تھا، اس کا اخلاق اور سادگی بھی انھیں متاثر کیے بغیر نہیں رہی۔ ایک معمر عورت نے اپنے قریب کی دوسری عورت سے کہا۔ 'آئے بکتی نیک للگت ھی مسود کی عورت'۔

اس پر دوسری خاتون نے جواباً کہا۔ 'فت، کا کھت ھس۔ یا مسود کی غورت نھیں دوس فوی'۔

'ارے نھیں نا تو جلدی ھوئی جائی'۔ وہ خاتون جیسے اپنے قول سے پیچھے ہٹنے کے لیے

تیاری نہیں تھی۔

'ہوئی جلے تو کتنا اچھا ہووے۔'

آصفہ کے لیے یہ ماحول بالکل نرالا تھا۔لیکن وہ ان خواتین کی گفتگو سے پریشان بالکل نہیں تھی۔اسے خوشی ہو رہی تھی کہ یہ عورتیں اسے مسعود خاں کی بیوی کی حیثیت سے دیکھ رہی ہیں۔یہی خواہش تو اس کے دل میں بھی تھی، جسے وہ واضح طور پر مسعود سے کہنے کی ہمت ابھی تک نہیں کر پائی تھی۔ادھر یہ گفتگو چل ہی رہی تھی کہ مردانہ حصے میں جلسے کی کارروائی کا آغاز ہو گیا اور ساری عورتیں ادھر متوجہ ہو گئیں۔

مائک پر سب سے پہلے حافظ عبدالصمد خاں آئے۔انھوں نے پہلے اپنی لکھی ہوئی استقبالیہ تقریر پڑھی، جس میں انھوں نے نہایت شفقت کا اظہار کرتے ہوئے مسعود خاں اور آصفہ کا استقبال کیا۔انھوں نے اپنی معلومات اور اندازے کے مطابق ان دونوں کی صفات عالیہ کا بھی ذکر کیا۔یہ سب سن کر مسعود خاں کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔وہ جانتا تھا کہ ان سے منسوب کر کے جن صفات کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے ان میں سے بیشتر ان دونوں میں نہیں پائی جاتیں۔لیکن وہ اسے ان کی محبت کے اظہار کے طور پر دیکھ رہا تھا۔یہاں موجود تمام لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنی زندگی میں مسعود خاں سے عظیم کسی اور شخصیت سے کبھی نہیں ملے۔ان کی یہ بات کسی حد تک درست بھی تھی۔کیونکہ یہ چھوٹا سا قصبہ، جو مختلف میدانوں میں کئی اہم شخصیات کی جائے پیدائش رہا ہے، خود بڑے اور عظیم لوگوں کی توجہ سے ہمیشہ محروم رہا۔عام طور پر یہاں سیاسی لیڈروں کو بڑے لوگ کہا اور سمجھا جاتا تھا۔گل پوشی کا یہ سلسلہ کوٹ کے نمائندے سے شروع ہوا، جو ظاہر ہے ہمدان علی خاں کے علاوہ بھلا اور کون ہو سکتا تھا۔وہ اتنا جوش میں تھے کہ بس بار بار مسعود خاں کو گلے سے لگائے جا رہے تھے۔اسٹیج پر بھی انھوں نے اسے ہار پہنانے کے بعد ایسا تین بار کیا تو عبدالصمد خاں کو انھیں ٹوکنا پڑا کہ ابھی لوگوں کی کثیر تعداد موجود ہے جو مسعود خاں کی گل پوشی کرنا چاہتی ہے، اس لیے وہ تھوڑا صبر سے کام لیں۔

خود مسعود خاں کو اس جلسے کا سب سے دلکش حصہ وہ لگا، جس میں جامعہ حسن سنجری کے بچوں اور بچیوں نے اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق پروگرام پیش کیے۔کسی نے مناجات پڑھی تو کسی نے تقریر کی، کسی نے استقبالیہ نظم پڑھی۔بچوں کی زبان سے یہ سب سن کر مسعود خاں بے حد متاثر

ہوا۔ اس کو اس بات کی نہایت خوشی تھی کہ اب اس کے گاؤں میں بچوں کو وطن دوستی، باہمی اشتراک اور مذہبی رواداری کی تعلیم دی جاری تھی۔ یہ پروگرام دو گھنٹے چلا۔ اس کے بعد رات کے کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں نہایت نظم وضبط کے ساتھ لوگوں نے کھانا کھایا۔ گاؤں کے تمام لوگ حیرت اور خوشی سے دیکھ رہے تھے کہ اپنی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینے والے ہمدان خاں آج بہ نفس نفیس تمام مہمانوں کی خاطر میں مصروف تھے۔ ان کے ہاتھ میں کبھی سالن کا برتن ہوتا کبھی بریانی کا، کبھی وہ لوگوں کو پانی پلانے لگتے اور کبھی فارغ ہو جانے والوں کے ہاتھ دھلانے لگتے تھے۔

یہ سارا سلسلہ رکا تو ہمدان خاں نے مسعود خاں کو اپنے ساتھ اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ انھیں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اب مسعود خاں کو اپنے سے ایک پل بھی دور رکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ لیکن مسعود خاں نے نہایت احترام سے ان سے کہا۔ 'اکرم خاں بڑی دیر سے میرا انتظار کر رہا ہے کہ میں اس کے ساتھ گھر چلوں۔'

'ھاں ھاں، ھم کا ماف کر دیھو۔ کچھ جادا ھی جوس ماں آگین ھم'۔ ہمدان خاں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ اب یا دیاکھو ھم ایھی بھول گئے کہ اکرم کھاں بھی رھت ھے ای گاوں ماں۔ کا ھوئی گا ھے سسر ای دماگ کا'۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکے، پھر بولے۔ 'نھیں نھیں تم جاو، جرور جاو۔ اب جب تک تم ھیاں ھو ملاکات تو ھوئوتے رھی'۔ یہ کہتے ہوئے وہ عبدالصمد خاں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔

اس کے بعد مسعود خاں اور آصفہ کو ساتھ لے کر اکرم خاں اپنے گھر پہنچا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ مسعود خاں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ جیسے اس نے ابھی تک بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا تھا۔ شاید وہ اس لیے نہیں رو پایا تھا کہ لوگوں کے سامنے اس کے بھائی کی سبکی نہ ہو اور اب گھر کی تنہائی میں، جب یہاں کوئی دوسرا نہیں تھا، وہ اپنے جذبات پر مزید قابو نہ رکھ پایا۔ مسعود خاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اکرم خاں کو کیسے سنبھالے۔ ایک تو وہ خود بری طرح احساس جرم میں جلتا تھا دوسرے اس طرح کی صورت حال عام طور پر اپنے افراد خاندان کے ساتھ رہنے پر پیش آتی ہے، اور اس کا اسے ایک طویل عرصے سے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ یہ بات بھولا نہیں تھا کہ اکرم خاں ایک جذباتی نوجوان ہے۔ اس وقت اسے روتا دیکھ کر اسے بچپن کے نہ جانے ایسے کتنے

مواقع یاد آ گئے تھے جب دونوں میں جھگڑا ہونے پر اکرم خاں رو پڑتا تھا اور مسعود خاں اس ڈر سے کہ اب اسے خالہ کی ڈانٹ سننی پڑے گی، جلدی سے اپنی ہار مان کر اکرم خاں کو منانے پھسلانے اور چپ کرنے کی کوشش کرنے لگتا تھا۔ لیکن وہی سب کچھ اب اس سے نہیں بن پا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے اندر شاید اب پہلے والا مسعود خاں زندہ ہی نہیں رہا۔ اور جو مسعود خاں اس کے اندر اب سانسیں لے رہا ہے وہ پہلے سے یکسر مختلف ہے۔ 'مسعود خاں' کے اندر آنے والی اس تبدیلی سے وہ خوش نہیں تھا۔ نئے مسعود خاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بھائی اکرم کو کس طرح سمجھائے۔ اس مشکل وقت میں آصفہ نے اس کی مدد کی۔ اس نے اکرم خاں کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ 'تم اب اکیلے نہیں ہو اکرم، اب ہم سب ساتھ ہیں۔ برا وقت گذر چکا ہے۔ خدا نے ہم سب کو ایک بار پھر ملا دیا ہے۔ پرانی باتوں کو تم اب جتنی جلدی بھلا دو گے اتنا ہی تمھارے حق میں اچھا ہوگا اور مسعود خاں کے بھی حق میں۔'

'بھائی۔' کہتے ہوئے اکرم خاں بھی اس سے لپٹ گیا تھا۔ اور دھیرے دھیرے اس کی سانسیں قابو میں آ گئی تھیں۔

مسعود خاں نے کوٹ میں پندرہ دن گذارے۔ اس دوران اس سے گاؤں کے تمام لوگوں نے ملاقات کی۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت مسعود خاں کے پاس گذارنا چاہتے تھے، لیکن اس کی بیٹھک میں جگہ کی قلت انھیں وہاں آنے والے دوسرے لوگوں کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ انھوں نے ان ملاقاتوں میں دوران گفتگو اس سے طرح طرح کی باتیں کیں۔ کسی نے اس سے گاؤں کے لیے پختہ سڑک بنوانے کا انتظام کرنے کی بات کی، کسی نے اس سے اپنے بیٹے کے لیے سرکاری ملازمت کی سفارش کرنے کے لیے کہا، کوئی چک بندی میں ناقص زمین ملنے کی شکایت کر کے درخواست کر رہا تھا کہ وہ اسے اچھی زمین دلانے میں مدد کرے، کوئی اپنی کبھی نہ ختم ہونے والی غریبی کا رونا رو رہا تھا۔ کچھ لوگ جو سمجھ دار تھے کہہ رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان اب بھی پریشانی میں ہیں۔ اب بھی ان کے لیے بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ اس نے ترقی کی اتنی منزلیں اتنی جلدی کیسے سر کر لیں۔ اب مسعود بھلا ان کی ان تمام باتوں کا کیا جواب دیتا۔ ان بیچاروں کی نظر میں بڑا آدمی بننے کا مطلب ہی یہ ہوتا تھا کہ وہ جو کام چاہے کروا سکتا ہے۔ اور یہ تو مسعود خاں

کے علاوہ کوئی جانتا ہی نہیں تھا کہ جس منزل پر وہ اس وقت کھڑا ہوا ہے وہاں تک پہنچنے میں اسے کتنے صبر آزما مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔

حافظ عبدالصمد خاں اور ہمدان خاں تو جیسے چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتے تھے۔ اکثر تنہائی میں ہمدان خاں نے آصفہ کا ذکر بھی چھیڑا اور اس سے اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں پوچھیں۔ کہاں کی رہنے والی ہے، ماں باپ کہاں رہتے ہیں، تمھاری ملاقات اس سے کب ہوئی۔ تم دونوں کے بیچ میں کیا رشتہ ہے، تم دونوں کے اگلے منصوبے کیا ہیں۔ اس نے ان کے سامنے اس بات کا اظہار کر دیا کہ وہ آصفہ سے شادی کرنا چاہتا ہے، لیکن یہ بات اس سے کہنے کی ابھی تک ہمت نہیں کر پایا ہے۔ ان دونوں تجربہ کار بزرگوں کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اب وہ مسعود خاں کا عندیہ جان گئے تھے اور خوش تھے۔ ان دونوں ہی کو نہیں گاؤں کے سارے لوگوں کو یہ جوڑا پسند آیا تھا۔ انھوں نے اسے تسلی تشفی دی اور جلد ہی آصفہ سے ملاقات کر کے اس کی مرضی معلوم کی۔ انھیں معلوم ہوا کہ معاملہ تو 'دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی' کا ہے۔ ان کے کرنے کا کام تو کچھ بچا ہی نہیں۔ وہ اب بس یہ کر سکتے تھے کہ مسعود خاں سے شادی کی تاریخ طے کرنے کو کہیں اور اس سے اصرار کریں کہ وہ اپنی شادی کوٹ ہی سے کرے۔

یہاں وہ سب کا چہیتا بن چکا تھا۔ سب اس سے مل کر، اس سے باتیں کر کے، اس کے لیے کوئی کام کر کے، لوگوں سے اس کی باتیں کر کے خوشی اور فخر محسوس کر رہے تھے۔ لیکن خود مسعود خاں کے دل میں ایک کسک تھی۔ جیسے اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کوٹ میں بہتری کی جانب جو پیش رفت ہوئی تھی اس میں کھاگا سے کوٹ تک نیم پختہ سڑک بن چکی تھی، بجلی آ چکی تھی۔ کچھ گھروں میں ٹیلیویژن بھی نظر آنے لگے تھے۔ لیکن اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اب اس کے بچپن کا کوٹ باقی ہی نہیں رہا ہے۔ وہ جمنا کا گھٹیا گھاٹ جہاں سے وہ نہانے کے لیے دوڑتا ہوا نیچے اترا کرتا تھا، اب رہا ہی نہیں تھا۔ سارے گاؤں میں کچے گھروں کا کال ہو گیا تھا۔ مشرق و مغرب کے 'بنگلے' جو کبھی اپنی دلکشی کے لیے جانے جاتے تھے، برے حالوں میں تھے۔ سارے لوگ حتی الامکان اسے گاؤں سے شہر بنانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ نوجوان اب یہاں رہنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ وہ پڑھ لکھ کر شہروں میں اپنی دنیا بسا رہے تھے۔ اس دوران کتنے ہی گھر ویران ہو چکے تھے۔ یہاں کی دلفریبی کی صفت رخصت ہو

چکی تھیں۔ نہ جانے کیوں اسے کوٹ ایک ایسے مقبرے کی طرح نظر آرہا تھا جہاں اب زندگی کا وجود ہی نہیں تھا۔ گاؤں کے اندر مسجدوں کی تعداد اب بھی وہی تھی، لیکن یہاں نمازی پہلے سے بھی کم ہو گئے تھے۔ ننندھوا، پھلواری، اُمھلین اب بھی اپنی جگہ موجود تھے لیکن وہاں بھی اسے اب پہلے جیسی رونق محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

اس کے کئی دوست اب بھی یہاں موجود تھے، لیکن اب انھیں اس سے بات کرنے میں جھجک محسوس ہونے لگی تھی۔ گاؤں کے بزرگوں کا معاملہ بھی اسے اطمینان بخش نہیں لگ رہا تھا۔ اسے یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی کہ اب یہ سارے لوگ اسے اپنے سے بھی بڑا تصور کرنے لگے ہیں۔ اس کے دل کی گہرائی میں نہ جانے کیوں اب بھی کہیں یہ خواہش سر چھپائے بیٹھی تھی کہ یہ بزرگ اسے ڈانٹیں، دھتکاریں، تنبیہ کریں، لیکن شاید اب اس کی یہ خواہش کبھی پوری ہونے والی نہیں تھی۔ وہ اب بھی پہلے جیسا کھلنڈرا مسعود بننا چاہتا تھا لیکن وہ مسعود تو اب مر چکا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں اب سے بیس سال پہلے دفن کر چکا تھا۔ اس کی جگہ اب ایک نیا مسعود پیدا ہوا تھا، جسے یہاں کے لوگوں کا احترام تو مل سکتا تھا، بزرگوں کی شفقت اور دوستوں کی بے تکلفی نہیں مل سکتی تھی۔

یہاں آنے سے پہلے یہ بات اکثر اس کے دل میں آیا کرتی تھی کہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر وہ اپنی زندگی کے باقی دن آرام سے اپنے گاؤں میں گذارے گا، لیکن اب یہاں آ کر اس فیصلے میں اتنا استحکام باقی نہیں رہا تھا۔ اب اس کے دل میں یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ وہ کان پور میں رہے گا اور وقتاً فوقتاً کوٹ آتا جاتا رہے گا۔ البتہ اس کا یہ ارادہ اب بھی پختہ تھا کہ وہ آصف شبیر کو آصف مسعود بنانے کے تمام مراحل یہیں طے کرے گا۔ اور اس موقعے پر اپنے تمام دوستوں کو اپنے گاؤں آنے کی دعوت دے گا۔

چولستہ

اس کے بعد کی کہانی میں قارئین کی دلچسپی کے لیے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ہوا بس یہ کہ آنے والے ایک سال کے اندر مسعود خاں اور آصف شبیر سلسلہ ازدواج میں بندھ گئے تھے۔ مسعود اور آصف دونوں کی مرضی کے عین مطابق ان کا نکاح کوٹ ہی میں ہوا۔ اس شادی میں بنارس سے اس کے

دوست عبدالرحمٰن انصاری اور لکھنو سے ضرغام حیدر نے خاص طور پر شرکت کی۔ یہ دونوں اب آزادانہ زندگی گذار رہے تھے اور اب کہیں آنے جانے میں ان کے لیے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ بھی اس نے ان تمام لوگوں کو مدعو کیا تھا جن سے الگ الگ شہروں میں کبھی اس نے تعاون لیا تھا اور ان میں سے بیشتر لوگوں نے اس کی دعوت قبول کر کے شادی میں شرکت بھی کی تھی۔ شادی کے دوران اگر کچھ دلچسپ تھا تو یہ کہ ہمدان خاں اور عبدالرحمٰن میں ایک عرصے کے بعد یہ اتفاقی ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر پہلے تو بری طرح چونک گئے تھے، پھر کچھ دیر تک دونوں میں کچھ ہلکی سی نوک جھونک بھی ہوئی تھی لیکن جلد ہی جب صورت حال دونوں کی سمجھ میں آ گئی تو دونوں میں صلح بھی ہو گئی تھی اور اب دونوں مل جل کر شادی کے انتظامات میں تن من دھن سے لگ گئے تھے۔

شادی کے بعد تین ماہ وہ کوٹ ہی میں رہا۔ دفتر کی طرف سے اسے اطمینان تھا کہ وہ اسے مناسب ہاتھوں میں سونپ کر آیا تھا۔ آصفہ کی والدہ بھی اس شادی میں شرکت کے لیے کوٹ آئی ہوئی تھیں۔ ان کی طبیعت بھی اب کچھ ٹھیک رہنے لگی تھی۔ شاید بیٹی کی شادی کی ان کی دیرینہ خواہش کی تکمیل سے ملنے والی بے فکری نے ان کی صحت پر خوش گوار اثر ڈالا تھا۔ اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ اس کے اندازے کے برخلاف آصفہ کا دل کوٹ میں لگ رہا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اب وہ کوٹ کی بولی بھی فراٹے سے بول رہی ہے۔ جب وہ گاؤں کی عورتوں میں بیٹھی ہوتی تو یہ شناخت مشکل سے ہو سکتی تھی کہ وہ کھکھرَ ابنی نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے اپنے بچھڑے ہوئے عزیز اور اقارب دوبارہ مل گئے ہوں۔ اس نے مسعود کو اپنی اس خواہش سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ اب سب کام کاج چھوڑ کر اپنی والدہ کے ساتھ مستقل طور پر یہیں رہنا چاہتی ہے، جسے مسعود نے بہ خوشی منظور کر لیا تھا۔ اب وہ کوٹ کی خواتین سے بے تکلف ہو گئی تھی اور ان کے درمیان خاصا وقت گذارنے لگی تھی۔ اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے والی عورتوں میں ہر عمر کی عورتیں شامل تھیں، لیکن ان کی اکثریت ان پڑھ تھی۔ وہ ان سب کو اکسا رہی تھی کہ لکھنے پڑھنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ وہ چاہیں تو اب بھی اپنے فرصت کے اوقات میں یہ کام کر سکتی ہیں۔ اس نے اپنے طور پر فوراً یہ کام شروع بھی کر دیا۔ اس نے مسعود سے یہ درخواست کی کہ وہ کچھ ایسا انتظام کرے جس سے یہاں

خواتین کے لیے تعلیم بالغان کا ایک مرکز قائم ہو جائے۔ مسعود کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس نے اپنے چند دوستوں سے بات چیت کر کے اس کا انتظام کر دیا تھا اور اس کے یہاں رہنے کے دوران ہی یہ مرکز کام بھی کرنے لگا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اس مرکز میں آنے والی خواتین کی تعداد اچھی خاصی تھی اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اس دوران اس نے اپنے قدیم گھر کی نئے سرے سے تعمیر کرائی۔ اپنے والدین کے انتقال کے بعد جب وہ یہاں سے اپنی خالہ کے گھر میں منتقل ہوا تھا، تب سے یہ خالی پڑا ہوا تھا اور اب پوری طرح سے کھنڈر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ خدا کے فضل و کرم سے اب اس کے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ حرکت البشر سے اسے معاوضے کے طور پر اتنی بڑی رقم ملی تھی کہ وہ نہ صرف اس طرح کی اپنی تمام خواہشات بہ آسانی پوری کر سکتا تھا بلکہ کوٹ میں اپنے طور پر بہت سے رفاہی کام بھی کروا سکتا تھا۔ نو تعمیر گھر کافی کشادہ تھا۔ سامنے کے حصے میں مردان خانہ اور مہمان خانہ تھا، جس سے غسل خانہ بھی ملحق تھا تا کہ یہاں ٹھہرنے والے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس کے بعد درمیان میں بڑا سا آنگن تھا، جس کا تصور اب کم از کم شہروں میں نہیں رہ گیا تھا۔ تین کمرے تھے، جن میں سے ایک آصف کی والدہ کے لیے مخصوص تھا۔ اس نے آصف کی مدد سے اور اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس گھر کو تمام جدید ساز و سامان سے آراستہ کیا تھا۔

مشرق سے طلوع ہونے والا آفتاب آج نہایت روشن اور تابناک دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے اسے یہ نوید مل چکی ہو کہ آنے والا دن کل سے بہتر ہو گا۔

تمام شد